[illegible]

[illegible] اور تمدن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible]

سلاطینِ ہند

فنونِ حرب اور تمدن

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

مرتبہ

ڈاکٹر مہ جبین زیدی

maablib.org

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب کا نام	سلاطینِ ہند، فنونِ حرب اور تمدن
مصنف	سید صباح الدین عبد الرحمن
مرتب	ڈاکٹر مہ جبین زیدی
سالِ اشاعت	2004ء
تعدادِ اشاعت	1000
گرافکس اور ڈیزائننگ	پرنٹ اینڈ کمیونیکیشن
طباعت	ذکی پرنٹرز کراچی
ناشر	منزل اکیڈمی A-10، الکرم اسکوئر، بلاک 3، لیاقت آباد کراچی۔ موبائل 0320-4002766
قیمت	Rs.225/=

انتساب

اپنے بھائی ظفر حسنین زیدی

کی نذر

جن کے پیہم اصرار اور مسلسل مہمیز کے باعث اس کی تکمیل ہوئی۔

maablib.org

فہرست

ابواب	عنوانات	صفحہ نمبر
باب اوّل	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی ورزش	۱
باب دوئم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں آلاتِ حرب	۱۶
باب سوئم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجوں کا معائنہ	۳۸
باب چہارم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں سواروں کا نظام	۴۱
باب پنجم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی قیام گاہوں کے ساز وسامان	۱۰۴
باب ششم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجوں کی تنخواہ	۱۱۳
باب ہفتم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی عہدے خطابات و امتیازات	۱۳۳
باب ہشتم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں فنونِ جنگ	۱۵۱
باب نہم	میدانِ جنگ کے طریقے	۱۶۶
باب دہم	صلیبی جنگ اور اس کے اہم پہلو	۲۲۶
باب یازدہم	پارچہ بافی کی صنعت	۲۶۹
باب دوازدہم	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تہوار	۲۸۵

دیباچہ

صباح الدین عبدالرحمٰن کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک گاؤں دیسنہ سے تھا، وہ دارالمصنفین سے وابستہ رہے، تاریخ پر ان کی نظر گہری تھی اگر تاریخ پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ گو کہ یہودیت یا عیسائیت کی تاریخ کی طرح بہت طویل تو نہیں ہے، لیکن بہت اہم ہے، پندرھویں صدی کی دنیا صرف تین براعظموں پر محیط سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے اسلام کے پیروکاروں نے ایشیاء، افریقہ اور یورپ پر صدیوں حکمرانی کے ذریعہ انسانیت اور تمدن کی خدمت کی ہے، ہندوستان میں آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی سندھ پر فتح کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومت دسویں صدی تک آتے آتے بالکل کمزور ہوگئی اور ہندوستان کے طول وعرض پر اس کا اثر قائم نہ ہوسکا، ایک عظیم ترکی سردار سبکتگین اور اس کے جری بیٹے محمد غزنوی (۱۰۰۱) کے بعد سے مسلم حکومتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودی کی پانی پت میں ترکی حکمران ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد سلطنت نامی دور کا خاتمہ ہوگیا، لودیوں کے سوا غزنوی سے لے کر تغلق خاندان تک ترکوں کی حکمرانی رہی اور بابر بھی برلاس ترک تھا، جس کی آخری اولاد بہادر شاہ ظفر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد انگریزوں نے رنگون جلاوطن کردیا، جہاں وہ محوِ خواب ہیں۔

ہندوستان کے علاوہ دنیا کے وسیع علاقوں پر مسلمانوں اور بالخصوص مختلف ترکی خاندانوں کی صدہا سال حکومت قائم رہی ہے، مثلاً قراخانی، غزنوی، سلجوقی، خوارزم شاہی ورعثمانی سلطنت جو جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی، صلیبی جنگیں یورپ نے صرف سلجوقی ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے یروشلم کے نام پر جاری رکھی، مسلمانانِ

عالم کی تواریخ مختلف علاقوں میں لکھی گئی، لیکن ہندوستان میں مبسوط طریقے پر عالم اسلامی تاریخ ہند کے مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد اعظم گڑھ (یوپی) نامی شہر کے دارالمصنفین نامی علمی ادارے نے شروع کی، جس کے دو عظیم درخشاں ستاروں یعنی علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے مسلمانوں میں دینی و تاریخی شعور کو اجاگر کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے، اس ادارے سے منسلک ایک شخص نے اپنی انتھک محنت اور تحقیق و تدقیق کے نتیجے میں اپنی تصانیف کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل کی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن نامی شخص "معارف" کا ایڈیٹر اور دارالمصنفین کا ناظم بھی رہا، ان سے میری ملاقات جامعہ کراچی میں ہوئی اور تیموریوں کے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی بعد میں انھوں نے بزمِ تیموریہ میں میرے تذکرے کے ساتھ میرے خیالات کو شامل کیا، یہ انتہائی فراخ دل اور دور بین شخص تھے، انھوں نے کئی کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین اور مقالے تحریر کیے ہیں، جن کی اہمیت کتابوں سے زیادہ ہے، گو کہ سید صباح الدین صاحب ترکی نہیں جانتے تھے، لیکن ان کا کام زیادہ تر اس سے متعلق ہے، کتابوں کے علاوہ مضامین میں بھی معلومات کا خزانہ کھول کر رکھ دیا ہے۔

ہر شخص کے لیے مختلف رسالوں میں موجود ان مضامین کو تلاش کر کے استفادہ کرنا ایک مشکل امر ہے، ان سب کو جمع کر کے اہلِ علم کے سامنے پیش کرنا ایک اہم کام تھا، جسے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی لائق استاد ڈاکٹر مہ جبین زیدی نے انجام دے کر آسان اور ممکن بنا دیا، ڈاکٹر مہ جبین زیدی نے مشہور ادیب علی گڑھ کے استاد اور ماہر لسانیات مرحوم ابواللیث صدیقی کی زیرنگرانی ۱۹۸۵ء میں مایۂ ناز اسلامی مورخ سید سلیمان ندوی کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد شعبۂ اردو سے منسلک ہیں، اردو زبان کی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخ اسلامی کے موضوعات کو یکجا کر کے تاریخ کی خدمت کی ہے، یہ خودستائی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ برصغیر میں پہلی بار ۱۹۶۱ء میں استنبول یونیورسٹی سے ترک زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مجھے ملی، میری ڈاکٹریٹ کا

موضوع ترکی قوم کا سب سے عظیم شاعر و ادیب میر علی شیر نوائی تھا جو ہرات میں محو خواب ہے، ڈاکٹر مہ جبین کا کام صرف یکجا کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ انھوں نے اس کی ترتیب میں وقت صرف کیا اور بعض پروف کی غلطیوں کے ساتھ بعض نافہم الفاظ کو درست کیا اور جہاں حواشی کا اندراج رہ گیا تھا اسے مکمل کیا، تاکہ اہلِ علم کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکیں، ان کی اس کاوش کی جتنی تعریف کی جائے یا اس لحاظ سے قدر کی جائے کم ہے امید ہے کہ ڈاکٹر مہ جبین اس طرح کے اور مزید علمی کام انجام دیں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر

ایم۔اے (تاریخ اسلام)

پی، ایچ، ڈی (ترکی زبان وادب) استنبول

سابق صدر شعبہ تاریخ اسلامی

نگراں ڈین : کلیہ علوم وفنون وکلیہ کامرس

کراچی یونیورسٹی

maablib.org

مقدمہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۹۱۱ء صوبۂ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں پیدا ہوئے، ان کی پیدائش سے قبل ہی ان کے والد محترم سید محی الدین صاحب کا انتقال ہو گیا تھا، ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کی والدہ بی بی سلمٰی بھی داغِ مفارقت دے گئیں، اس لیے ان کی پرورش ننھیال میں ہوئی، ددھیال اور ننھیال دونوں گھرانوں میں خوش حالی کے ساتھ ساتھ علم کی طرف رغبت بھی تھی، اس لیے ان کا رجحان بھی خود بخود علم کی طرف راغب ہوا، ان کے بزرگ سید عبدالحکیم رحمانی، سید محمد احسن، سید ابو حبیب عبدالنعیم، بشیر الحق بیدل دسنوی، اور ڈاکٹر احمد کریم صاحب نے ایک انجمن قائم کی، جس کا نام "انجمن الاصلاح" رکھا، اسی کے زیر اہتمام ایک کتب خانہ اور ایک مدرسہ الاصلاح قائم کیا، اسی مدرسہ میں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ر ۱۹۲۵ء میں پٹنہ سے میٹرک ر ۱۹۲۷ء مظفر پور سے انٹرمیڈیٹ، ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کیا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو ابتدائی زمانے سے لکھنے کا شوق تھا اور اس شوق کی وجہ دیسنہ لائبریری تھی، جس میں کتابوں کے علاوہ ماہوار و ہفت وار رسالے بھی آتے تھے، اس زمانے میں جو رسائل بچوں میں مقبول تھے، ان میں پھول اور غنچہ تھے جو لاہور اور بجنور سے شائع ہوتے تھے اور یہ دونوں رسالے باقاعدگی کے ساتھ دیسنہ لائبریری میں بھی آتے تھے، شروع میں انھوں نے اس میں ہی لکھنا شروع کیا۔

سید سلیمان ندوی کا تعلق بھی دیسنہ سے تھا، اس لیے سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے شوق کو دیکھتے ہوئے نہ صرف ان کی ہمت افزائی کی بلکہ ذاکر حسین صاحب کے پاس جامعہ ملیہ دہلی بھجوا دیا۔ ذاکر حسین صاحب نے ان کی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لئے پروفیسر مجیب کے سپرد کیا، جہاں تقریباً وہ ایک سال تک اُن کی صحبت میں رہے، اس کے بعد سید سلیمان ندوی صاحب نے انھیں دارالمصنفین بلوالیا، یہاں اپنی محنت، لگن، ہمت اور جانفشانی کے ساتھ کام

کرنے لگے، اپنی محنت ہی کی بدولت وہ "معارف" کے ایڈیٹر اور دار المصنفین کے ناظم مقرر ہوئے۔

سید صباح الدین عبد الرحمن ایک محقق اور اعلیٰ مقالہ نویس تھے، ان کی بے شمار تحریریں علمی، ادبی، سوانحی اور تاریخی موضوعات پر ہیں، جو رسالہ معارف (اعظم گڑھ) کے مختلف شماروں میں محفوظ ہیں، ان کا ایک مقالہ "ہندوستان کے مسلمان حکم رانوں کے زمانہ میں فنونِ جنگ، اور دوسرا "صلیبی جنگ" کے عنوان سے ہے ان دونوں مقالوں کو یکجا کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان کی مطلوبہ تحریر مل جائے اور انھیں ڈھونڈنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے، چونکہ صاحب موصوف کو تاریخ سے گہری وابستگی تھی، اس لیے انھوں نے اس سلسلہ کو جس عرق ریزی اور تلاش وجستجو کے ساتھ لکھنا شروع کیا شاید ہی کوئی اور شخص اس طرح لکھ پاتا، لیکن جہاں انھوں نے میدان جنگ کے طریقے میں فتوح السلاطین کا حوالہ دیا ہے، وہاں حواشی میں صفحات کے شماروں کا اندراج رہ گیا تھا، جسے میں نے مکمل کیا، اسی کے ساتھ ایک اور سلسلہ ''ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کے تہوار'' کا بھی ہے، اس کو میں نے اس لیے اس میں شامل کیا کہ رزم کے ساتھ بزم کی چاشنی بھی ہو، تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی بھی برقرار رہے اور قارئین اچھا مقالہ پڑھنے سے محروم نہ رہیں۔

سید صباح الدین عبد الرحمن فنونِ جنگ کی ابتدا غزنوی دور سے کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں کس طرح سے فوج کی صف بندی کی جاتی تھی، اس کی انھوں نے تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد غوری دور میں فوج کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی نظر آتی ہے، جس میں اصطلاح خلف کا اضافہ کیا گیا ہے، لیکن خلجی اور تغلق دور میں صرف تین اصطلاحات استعمال ہوتی تھیں جنھیں طلایہ، مقدمہ پیش اور یزک کہتے تھے۔

تیموری دور میں فوجوں کی صف آرائی کا ذکر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ (۱) قراول (۲) براول (۳) جرنغار (۴) برنغار (۵) قول اور پھر جرنغار اور برنغار کے بھی تین تین حصے بیان کیے ہیں، لیکن اگر فوج کی تعداد زیادہ ہوتی تو اس کی صف آرائی کے نقشہ میں عقب کا اضافہ کر دیا جاتا، اسی دور میں مختلف لڑائیوں کے موقع پر صفوں کی اصطلاحات میں تھوڑی ردو بدل بھی نظر آتی ہے، اس دور میں بھی ہر دور کی طرح صف بندی کے بھی کچھ اصول وضوابط تھے، ان کی ترتیب مختلف لوگوں کے سپرد ہوتی تھی مثلاً کبھی بخشی الممالک کے ماتحت نائب بخشی کبھی امیر تورک اور کبھی بادشاہ بھی ترتیب دیتا تھا، ہر صف کی نگرانی ایک سردار یا سالار کے ذمہ ہوتی تھی

لیکن بابر کی فوج میں ان عہدوں کی نگرانی کسی سلطان یا بیگ یا امیر کے ذمہ ہوتی تھی۔ اکبر نے اپنے دور میں منصب داری نظام قائم کرتے ہوئے اس بات کا اہتمام کیا کہ دشمن کسی بھی طرح سے یلغار کر کے اندر نہ آنے پائیں، اسی لیے صفوں کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ہر صف کے درمیان میں اتنا فاصلہ ہو کہ ضرورت کے وقت مختلف گذرگاہوں سے سواروں کے گھوڑے بآسانی گذر سکیں، عام طور پر میدانِ جنگ کا انتخاب کرتے ہوئے جن باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا، ان میں خاص طور پر وسیع اور کشادہ میدان کو اہمیت حاصل تھی، اسی کے ساتھ ساتھ فطری سہولت اور مدافعت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ شیر شاہ اور امیر تیمور نے اپنے لشکرگاہ کے چاروں طرف خندق کھدوائی، جس کا پہلے سے رواج نہیں تھا۔

تیموریوں کے زمانہ میں جنگ کے موقع پر جنگی مشاورت کو ضروری سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں لڑائی کے موقع پر "مجالس کنکاش" اور انجمنوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، ان انجمنوں کی صدارت بادشاہ کیا کرتا تھا، اگر بادشاہ نہ ہوتا تو یہ فرائض سپہ سالار انجام دیتا اور اس میں جو شرکت کرتے، ان میں خوب مباحثے ہوتے اور ہر فرد آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا، یہ مجلس لڑائی کے دوران بھی منعقد ہوتی تھی، مباحثے میں خاص طور پر صف شکنی کے قواعد وضوابط پر گفتگو ہوتی۔

ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کے زمانہ میں شاہی فوج میدانِ جنگ میں داخل ہوتی تو تمام ساز وسامان سے لیس ہوتی، جس کا ذکر تیموری دور میں بہت وضاحت سے ملتا ہے، علاوہ ازیں خیموں کے نصب کرنے کے طریقے، ان کی سجاوٹ اور کون سا خیمہ کس کے لیے مختص ہوتا تھا، تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

جنگ عموماً صبح شروع ہو کر شام تک ختم ہو جاتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ فریقین اس کوشش میں ہوتے کہ لڑائی دیر سے شروع ہو، تاکہ اگر پسپائی کا سامنا کرنا پڑے تو رات کی تاریکی میں فرار ہو سکیں اور شرمندگی سے بچ جائیں، جنگ کے وقت مسلمان "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ غیاث الدین تغلق خسرو خان سے معرکہ آرا ہوا تو اس کی فوج کی علامت کا لفظ قُلا (دشمنی) تھا اور لڑائی میں پیش قدمی کرتے وقت فوج کی ترتیب کا بھی خیال رکھا جاتا تھا، سب سے پہلے مقدمہ کی فوج، پھر میمنہ پھر قلب اور آخر میں میسرہ کی فوج جاتی تھی۔

مسلمان حکمرانوں کے ابتدائی دور میں آتشیں اسلحہ کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اور تیروں کا

استعمال بہت زیادہ ہوتا تھا، لیکن بابر کے لشکر میں فوجی بندوق سے مسلح تعینات ہوتے تھے اور لشکر کے آگے بھاری بھاری توپیں ہوتی تھیں جس سے وہ صفوں کو درہم برہم کیا کرتے تھے، پانی پت کی دوسری جنگ میں اکبری فوج کے تیر اندازوں نے ہیمو کے لشکر میں غیر معمولی ہولناکی اس وقت پیدا کی جب ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں آکر لگا اس کے زخمی ہوتے ہی تاریخ نے اپنا رخ موڑ لیا۔

جہانگیر کے زمانہ میں اصلی شجاعت تلوار سے لڑنے میں سمجھی جاتی تھی۔ شاہجہانی فوج تلوار سے لڑنے کے بجائے توپوں اور بندوقوں کا استعمال کرتے تھے، اس لیے کہا جاتا تھا کہ اصل بہادری تو تلوار سے لڑنے پر ہے اور لڑائی کا فیصلہ تلوار ہی سے ہونا چاہیے، سپاہی بہادر اور آزمودہ کار اسی وقت سمجھا جاتا جب وہ تلوار کی ضرب تیزی، پھرتی اور تختی سے لگاتا، کہا جاتا ہے کہ اکبر اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب سے شیر کو ہلاک کر دیا کرتا تھا، جب میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے لشکری نظر آتے اور وہ کچھ دور چلے جاتے تو یہ سمجھا جاتا کہ لشکری میدان چھوڑ چکے ہیں، تو وہ پھر پلٹ کر حملہ کرتے اور کبھی کبھی فتح یاب بھی ہو جاتے، اس طرح کی مثالیں ہندوستان کے تقریباً ہر مسلمان حکمرانوں کے دور میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت شب خون کا بھی رواج تھا، لیکن شہنشاہ اکبر شب خون مارنے کو بڑی ہی حقارت سے دیکھتا تھا۔ اس دور میں فوج کا ہر فرد چاق و چوبند اور تندرست رہنے کے لیے مختلف قسم کے سپاہیانہ کھیل کھیلتا تھا، مثلاً صید افگنی، شہ سواری، چوگان بازی، شمشیر زنی، تیر اندازی، نیزہ بازی، کشتی وغیرہ یہی وجہ ہے کہ سلطان بلبن بھی اپنی فوجوں کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے برابر شکار میں مشغول رکھتا تھا، تاکہ امن و امان کے زمانہ میں بھی سپاہیانہ قوتیں برقرار رہیں۔ بلبن کے بارے میں ہلاکو نے سنا کہ وہ شکار کا شوق رکھتا ہے تو اس نے کہا کہ بلبن تجربہ کار اور عقل مند بادشاہ ہے اور اس طرح وہ ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار رہتا ہے، شہ سواری میں مہارت حاصل کرنی بھی لازمی تھی، اس لیے ہر سوار خاص خاص فن کی مشق کرتا تھا۔ تیموری شہزادوں کے لیے بھی شہ سواری ضروری سمجھی جاتی تھی، اسی وجہ سے اورنگ زیب شہزادہ سلطان محمد کو برابر تاکید کرتا تھا کہ سفر کی حالت میں بھی تھوڑی دیر کے لیے سواری کی مشق کرے، فوجی ورزش کے لیے چوگان بازی بھی کی جاتی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوا۔ علاؤ الدین خلجی کی چوگان بازی پر امیر خسرو نے مثنوی "سپہر" میں چوگان اور گیند کا ایک منظوم مکالمہ بھی لکھا ہے۔ ملک کافور اور سکندر لودھی چوگان کے بڑے مشاق کھلاڑی تھے۔

علاؤالدین کی فوج ظفر خان کی نگرانی میں کیلی کے میدان میں مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آئی، اس وقت ظفر خان کی بہادری اور شجاعت جو ضرب المثل تھی، اس نے کیلی کے میدان میں اپنی تلوار سے پانچ ہزار مغلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غیاث الدین نے بھی تخت نشینی سے قبل مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، اسی لیے اسے "غازی ملک" کا خطاب ملا۔

شیر شاہ نے بھی اپنی تلوار سے ایک شیر کو ہلاک کیا، جس کی وجہ سے اسے "شیر خان" کا خطاب ملا۔ اکبر جب مالوہ کی مہم سے آگرہ آ رہا تھا تو نار وا کے قریب ایک شیر ببر اور اس کے پانچ بچے فوج میں آ گئے، اکبر نے اپنی تلوار کی ایک ضرب سے شیر کو ہلاک کیا اور باقی پانچ بچوں کو فوج کے جوانوں نے ہلاک کر دیا، جہانگیر جب شکار کے لیے گیا تو شکارگاہ میں ایک شیر نے جہانگیر کے ایک ساتھی انوپ رائے کو دبوچ لیا، اس کی حالت دیکھ کر شہزادہ خرم آگے بڑھا اور اپنی تلوار کے زور سے اسے زخمی کر دیا، جہانگیر نے خرم کی اس شجاعت پر اس کو انعام و اکرام سے نوازا۔

فوج اگر دارالسلطنت سے قریب کسی مہم پر ہوتی تو کھانے پینے کا سامان دارالسلطنت سے بھیجا جاتا تھا، لیکن اگر دور دراز مقام پر ہوتی تو لشکر کے قریب سوداگر اپنی دکانیں لگاتے اور اس طرح ہر چیز فوجیوں کو میسر ہوتی، اس بات کا بھی اہتمام کیا جاتا کہ اگر فوجی زخمی ہوں تو اس صورت میں ان کی مرہم پٹی کے لیے ضروری سامان کے ساتھ ان کے علاج معالجہ کا بھی خاطر خواہ انتظام ہوتا۔

غزنوی دور میں فوجی معائنہ کے لیے تمام لشکریوں کے حالات اور تفصیلات کے لیے رجسٹر رکھا جاتا تھا، جس میں ان کی حاضری، غیر حاضری، رخصت، بیماری اور موت وغیرہ کو باضابطہ تحریر کیا جاتا تھا، فوج کی کارکردگی کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے معائنہ برابر کیا جاتا تھا، یہ معائنہ سال میں کم سے کم ایک مرتبہ ضرور کیا جاتا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں فوجی معائنہ میں بڑی سختی کی جاتی تھی اور اس نے ہر سوار کے گھوڑے پر داغ لگانا شروع کیا، تا کہ وہ دوسرا گھوڑا نہ دکھا سکے اور ایک ہی گھوڑے کو مختلف سوار بار بار نہ پیش کر سکیں، جس رجسٹر میں یہ اندراج ہوتا تھا، اصطلاحاً اس کا نام "حلیہ" پڑ گیا، اس میں گھوڑے کی تفصیل نہایت وضاحت سے لکھی جاتی تھی، بالکل اسی طرح ہاتھی کے متعلق بھی تفصیلات درج ہوتی تھیں۔

غیاث الدین تغلق اور علاؤالدین نے اس روایت کو برقرار رکھا، سکندر لودھی نے اپنے

دور میں حلیہ رکھنے کا قاعدہ پھر سے جاری کیا اور اس کی اصطلاح "چہرہ" ہوگئی۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں حکومت کی کمزوری سے امراء نے بے جا فائدہ اٹھانے شروع کر دیے، معائنہ کے وقت ادھر اُدھر سے کچھ آدمی اور گھوڑے جمع کر کے پیش کر دیتے، اس طرح یہ لشکری نہ تو اچھی تربیت پاتے اور نہ ہی ان میں کوئی تنظیم ہوتی، اسی لیے جب ابراہیم لودھی بابر کے خلاف پانی پت کے میدان میں صف آرا ہوا تو بابر کی فوج کے مقابلہ میں اس کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن وہ دیر تک جم کر نہ لڑ سکی۔ شیر شاہ لودھی بھی اپنی فوج کی تنظیم و تربیت میں بڑا محتاط رہا، اس نے داغ اور چہرہ کے رواج کو پھر سے جاری کیا اور اپنے سامنے گھوڑوں پر داغ لگواتا اور بغیر نشان کے تنخواہ نہ دیتا۔

بابر و ہمایوں کی زندگی کا زیادہ تر حصہ کیمپ میں گزرا، اس لیے وہ اپنی فوجوں کا معائنہ قدیم روایت کے مطابق کرتا تھا، داغ کی نگرانی اور اس کی تصدیق و تصحیح کرانے والے کو "تصحیہ" کہا جاتا تھا۔

اسلامی عہد سے قبل فوجیوں کو تنخواہ دینے کا رواج نہ تھا، جبکہ رومن امپائر میں فوج کا انتظام جاگیرداری نظام پر تھا، لیکن اسلام میں عہد آغاز ہی سے فوجوں کو وظیفے اور تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں فوجیوں کو بیت المال سے وظیفے اور تنخواہیں مقرر ہوئیں، لیکن بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں تقسیم اراضی کا سلسلہ وظیفہ اور تنخواہوں کے ساتھ دیا جانے لگا۔ شمس الدین التمش نے سواروں کو دوآبہ کی زمین تنخواہ کے بدلے میں دی، جسے سواروں نے اپنی ملکیت بنا لیا، لیکن غیاث الدین بلبن نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور اسے اس طرح تقسیم کیا (۱) جو بڑھاپے کی وجہ سے کام نہ کر سکتے ہوں ان کی تنخواہ چالیس یا پچاس تنکہ مقرر کی اور ان کی جاگیروں کو خالصہ میں داخل کر لیا (۲) جو جوان یا ادھیڑ عمر کے تھے، ان کی تنخواہ بحسب استعداد مقرر کی اور جاگیر بھی ان سے واپس نہیں لی، لیکن تنخواہ دینے کے بعد آمدنی جو پس انداز ہوتی، تو وہ شاہی اہل کاروں کے سپرد ہوتی تھی (۳) جو اپنے غلاموں کو گھوڑوں اور جنگی ہتھیاروں کے ساتھ جنگی خدمت کے لیے بھیجا کرتے تھے ان سے جاگیر واپس لے لی گئی اور یتیموں اور بیواؤں کی تنخواہ مقرر کی گئی۔ اس حکم کا جاری ہونا تھا کہ اس حکم کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور آخر کار ملک الامراء فخر الدین کوتوال کی وساطت سے بادشاہ کو یہ حکم منسوخ کرنا پڑا۔

علاؤ الدین کے زمانے میں فوج کو از سر نو تنظیم کیا گیا، پائے تخت اور مقامات کے لیے بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کیے اور سواروں کی ایک بہت بڑی فوج ترتیب دی گئی اور خاص

طور پر یہ خیال رکھا گیا کہ وہ اپنی تنخواہ میں آسانی سے گزر بسر کر سکیں، جس کے لیے سرکاری نرخ مقرر کیے گئے، اسی لیے فوجی اپنی قلیل آمدنی کے باوجود آسانی سے زندگی بسر کرتے تھے، فیروز شاہ کے دور میں تنخواہ اور جاگیر دونوں کا رواج تھا۔

لودھیوں کے عہد میں بھی فوجی امراء کو جاگیریں ملا کرتی تھیں، ان فوجی امراء کو حکم تھا کہ اپنے منصب کے مطابق سپاہی رکھیں، لیکن اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا، لشکر کی تعداد بہت دکھائی جاتی تھی اور جب جاگیریں مل جاتیں تو سپاہیوں کو علحدہ کر دیتے اور اگر دوبارہ معائنہ کیا جاتا تو ادھر ادھر کے لوگوں کو جمع کر کے دکھا دیتے تھے، اس قسم کی بدعنوانیاں شیر شاہ کے زمانہ حکومت میں بھی تھیں، لیکن شیر شاہ ایک جہاں دیدہ شخص تھا، اس لیے وہ امراء اور سپاہیوں کے مکر و فریب سے اچھی طرح واقف تھا، ان چالاکیوں کو روکنے کے لیے "داغ" کا نظام قائم کیا، وہ گھوڑوں کو اپنے سامنے داغ لگواتا اور بغیر داغ کے تنخواہ نہ دیتا تھا۔ اکبر نے سابقہ فوجی نظام کا نقشہ تبدیل کر کے نئے آئین بنائے، جسے اس نے ۶۶ حصوں میں ترتیب دیا، جس کی تفصیل بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں منصب داروں اور فوجوں کی تنخواہوں کا معیار تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ قریب قریب یہی رہا۔ عالمگیر کے زمانہ میں یورپین سیاح برابر آتے رہے، اس کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے، اس زمانے میں ہتھیاروں کی جنگ کے بجائے شجاعت، بہادری، جانبازی اور مردانگی کی جنگ ہوتی تھی، اسی لیے جرات اور پامردی پر بھروسہ کرنا پسند کیا جاتا تھا، اس کے باوجود کچھ اسلحہ بھی ساتھ ہوتا تھا، لیکن مردانگی کا اصلی جوہر اس کی شمشیر کو مانا جاتا تھا، ہندی تلواروں کے بھی مختلف نام نظر آتے ہیں مثلاً تورمان، سورمان، مان گوہر، پرالک، جاوادر پرنگس (اسے موج دریا بھی کہتے تھے) وغیرہ، ان میں سے کچھ تلواریں سخت اور گہرے زخم لگاتی تھیں۔

محمود غزنوی کی محبوب تلوار قلاچوری تھی، جو لمبی ہونے کی وجہ سے نیزہ کا کام بھی دیتی تھی اور اس کے خم سے بڑا گہرا زخم لگتا تھا۔ تیموری دور میں ان تلواروں کے علاوہ کچھ اور تلواروں کا اضافہ ہوا، ایک قسم عصا شمشیر اور دوسری سروہی، سروہی چونکہ راجپوتانہ کے ایک مقام سروہی میں تیار ہوتی تھی اس لیے اس کا نام سروہی پڑ گیا۔ سلاطین دہلی کے عہد میں عام طور پر جو کمانیں رائج تھیں ان میں چاچی، خوارزمی، پروانچی، غزنیچی، لاہوری، کروری، ہندوی اور کوہی تھیں، ان سب کی علحدہ علحدہ خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔

اکبری دور میں بعض کمانوں کے لیے تخش کمان اور کنتھا کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی، اس لیے ان سب تلواروں کی بناوٹ اور خصوصیات کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ شاہجہان کا بڑا لڑکا دارا اپنے مذہبی عقائد ورجحانات کی بدولت ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں میں بہت مقبول ہو گیا اس زمانہ میں جب تخت وتاج کا مسئلہ درپیش ہوا تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت، فوجی سردار دارا کی حمایت میں آگے بڑھے اور اورنگ زیب کی حمایت کرنے میں راجپوت ہندوؤں کے خلاف معرکہ آرا ہونے سے بھی گریز نہیں کیا، اس زمانے میں جو گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے ان کی افزائش نسل اور دیکھ بھال کے لیے اہتمام بھی کیا جاتا تھا، اکبر عراقی اور ترکی نسل پر زیادہ زور دیتا تھا، اس مقالہ میں گھوڑوں کی خوراک، ساز وسامان، خدمت گذار وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

صلیبی جنگ میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ الم ناک اور طرب ناک واقعہ ظہور پذیر ہونے کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے صلیبی فوج کی نوعیت کیا تھی، مسلمانوں کا سیاسی انتشار کیسے ہوا، پہلی صلیبی جنگ اور عیسائیوں کے مظالم پھر عمادالدین زنگی کے کارنامے مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب، دوسری جنگ صلیبی اور نورالدین زنگی اور مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش، صلاح الدین ایوبی کی دانش مندی اور ہوش مندی سے ہی بیت المقدس واپس ملا، صلیبی جنگ کے سیاسی اثرات کے ساتھ ساتھ وہاں کے تجارتی واقتصادی، معاشرتی اور علمی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے، تجزیہ بھی کیا ہے۔

تہوار میں انھوں نے عہد رسالت کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت صرف دو ہی تہوار منائے جاتے تھے یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ، لیکن عہد تغلق، عہد فیروز شاہی، عہد مغلیہ، عالمگیر اور بہادر شاہ کے زمانے میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا اور شب برات، عید میلاد النبی ﷺ، جشن نوروز کے علاوہ سلاطین اور عہد اکبری کے نوروز کا بھی ذکر ملتا ہے، بعد ازاں جشن نوروز اور برسات کا پہلا چھینٹا پڑنے پر کس طرح خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا اور شاہانہ جشن کے فوائد پر بھی مفید معلومات ملتی ہیں۔

ہندوستان میں روئی بکثرت پیدا ہونے کی وجہ سے وہاں ریشم اور اون کی کمی نہیں ہوتی تھی، سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت ہر عہد میں اعلیٰ درجہ کی رہی، خاص طور پر مغلیہ دور میں اس صنعت کو کافی فروغ ملا، اس مقالہ میں کپڑوں اور جگہ کے نام کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے کی

کوشش کی ہے یہ کپڑا کہاں کا ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، اس کے بعد بنگال، لاہور اور اودھ وغیرہ کی صنعت کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کہاں کہاں چھینٹ ململ، سوتی کپڑا، اونی کپڑا، شال، کامدانی اور زردوزی وغیرہ کی وجہ سے ہندوستان کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں ہوئی۔

ان مقالوں کو پڑھنے کے بعد مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ انھیں یکجا کر کے ایک مستقل کتابی شکل دے دی جائے، اگر صرف صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے مقالات پڑھ لیے جائیں، تو اسلامی تاریخ وتہذیب کے تمام پہلو اجاگر ہو جائیں گے، اس اعتبار سے ان کے یہ مقالات علمی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں، امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب دل چسپی سے پڑھی جائے گی۔

خصوصیت کے ساتھ اپنے شوہر سلطان احمد کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، میں اپنی بہن نسیم کی بھی بہت ممنون ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی، جس کی وجہ سے میں یہ کام کر سکی۔

میں نے کوشش کی ہے کہ پروف میں کوئی غلطی نہ ہونے پائے لیکن اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو بشر سمجھتے ہوئے معاف کردیں۔

ڈاکٹر مہ جبین زیدی

maablib.org

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی ورزش

ہندوستان کے اسلامی عہد میں فوج کا ہر فرد اپنے جسم کو توانا، تندرست اور چست رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، اس لیے ہر سپاہی مختلف قسم کے سپاہیانہ کھیلوں سے شوق رکھتا تھا، ان تاریخی مگر دل چسپ کھیلوں اور ورزشوں کا حال ناظرین معارف کی دل چسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے، یہ ورزشیں حسب ذیل تھیں:

صید افگنی، شہسواری، چوگان بازی، شمشیر زنی، تیر اندازی، مشت بازی اور کشتی وغیرہ۔

صید افگنی:

سلطان بلبن اپنی فوجوں کو برابر شکار میں مشغول رکھتا تھا، تا کہ امن وامان کے زمانے میں بھی ان کی سپاہیانہ قوتیں بیدار رہیں، جاڑے کے موسم میں جب تھوڑی رات گذر جاتی، تو ایک ہزار سواروں اور ایک ہزار پیدل تیر اندازوں کے ساتھ اپنے محل سے شکارگاہ کی طرف روانہ ہو جاتا اور جب کچھ رات باقی رہتی، تو واپس آجاتا، شکارگاہ میں کھانے پینے کے اخراجات خزانہ شاہی سے ادا کیے جاتے، جب بلبن کے شوق شکار کا حال ہلاکو خان نے سنا، تو اس نے کہا کہ بلبن تجربہ کار اور عقل مند بادشاہ ہے، بظاہر تو شکار کا شغل رکھتا ہے، لیکن اس طرح سواری اور غیر معمولی مشقت اٹھانے کی ورزش کرتا ہے اور خوانین، ملوک لشکریوں اور گھوڑوں کو بھی پسینہ سے شل کر کے ورزش کراتا ہے، تا کہ بڑی بڑی لڑائیوں کے موقع پر یہ کاہل اور بزدل ثابت نہ ہوں، جب لشکر کو مشقت اٹھانے اور گھوڑوں کو پسینے سے شل ہونے کی عادت رہے گی، تو لڑائی میں دشمن ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے اور یہ بادشاہ شکار میں تفریح نہیں کرتا، بلکہ اس طرح ملک کی حفاظت کرتا ہے اور جب ہلاکو خان کی اس رائے کی خبر بلبن کو ہوئی تو اس نے ہلاکو کی فراست کی تعریف کر کے کہا کہ سچ ہے کہ سیاست و حکمرانی کے قواعد وہی شخص کچھ خوب جانتا ہے، جس نے خود بھی جہانداری

ملک گیری کی ہو۔ ا

سلطان محمد تغلق کے شکار کے بارہ میں صبح الاعشیٰ کا مصنف لکھتا ہے کہ ''شکار میں سلطان کی بالکل جداگانہ شان وشوکت ہوتی ہے، وہ خود تو نہایت معمولی لباس میں ملبوس رہتا ہے، لیکن ایک لاکھ سوار اور دو سو ہاتھی اس کے ہم رکاب رہتے ہیں۔ شکار کے سلسلہ میں نقل وحرکت کرنے والے محل خاص طور پر ذکر کے لایق ہیں، یہ شان وشوکت کے ساتھ آراستہ وپیراستہ قصر ہوتے ہیں، جو میدان میں دو منزلہ کھڑے کئے جاتے ہیں اور محل کی پوری عمارت زرکار ریشمی پردوں سے ڈھکی ہوتی ہے، اس کا سامان دو سو اونٹوں پر لادا جاتا ہے، دیگر خیمہ وخرگاہ جو شکار کے لیے مخصوص ہیں، اس کے علاوہ ہیں۔ ۲

فیروز شاہ تغلق بھی بڑی شان وشوکت سے شکار کے لیے جایا کرتا تھا، شمس سراج عفیف مؤلف تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے کہ سلطان فیروز شاہ شکار کے لیے روانہ ہوتا، تو اس کے ساتھ اس کی فوج بھی ہوتی، خوانین، ملوک اور شہزادے بھی اس کے ہم رکاب رہتے اور جب یہ فوج قرگاہ یعنی شکارگاہ کو پہنچتی، تو اس کی صف بندی میدان جنگ ہی کی طرح ہوتی، بائیں اور دائیں جانب ایک ایک ملک کو خاص جھنڈے کے ساتھ متعین کر دیا جاتا، دونوں کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ یعنی پانچ کوس سے دس کوس تک رکھا جاتا، دونوں طرف کی صفیں علیحدہ علیحدہ ہوتیں، پہلے تیز و باز ہوتے، پھر خیل دار سواروں کی صف ہوتی، اس کے بعد امراء، امراء کے پیچھے کچھ سوار اور ان کے پیچھے شکاری ہوتے، یہ تمام صفیں اس طرح ترتیب دی جاتیں کہ ایک حلقہ بن جاتا، ان صفوں کے ساتھ خیمے بھی نصب کیے جاتے اور صف بندی کے دور کی طرح خیموں کا بھی ایک دائرہ بن جاتا، جو چار پانچ کوس تک پھیلا ہوا ہوتا اور جب اس طرح صف بندی کر لی جاتی اور ہر قسم کے جانور حلقہ میں نظر بند ہو جاتے، تو بادشاہ شکار کرتا، اس کے ساتھ پانچ پانچ چھ چھ سو سوار، شاہزادے، خوانین اور ملوک ہوتے، فیروز شاہ نے پرندوں کے علاوہ بہت سے شیروں کا بھی شکار کیا تھا، وہ شیر کو اپنے

ا تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۵۵

۲ صبح الاعشیٰ اردو ترجمہ معارف نمبر ۶، جلد ۲۶ مزید تفصیل کے لیے دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۲۲

تیر سے ہلاک کر دیتا تھا، اس کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی رہتے، جو بھینسے کی پیٹھ پر سوار ہو کر شیر کا شکار کیا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فیروز شاہ ہاتھی شیر پر چھوڑ دیتا اور کبھی شیر سے ہاتھیوں پر حملہ کراتا تھا، کبھی کبھی بڑے جال میں شیروں کو پھنسا بھی لیا جاتا تھا، شکار کے لیے سلطان فیروز شاہ اپنی فوجوں کے ساتھ ستر ستر کوس کی مسافت طے کیا کرتا تھا۔[۱]

سلاطین دہلی کے عہد میں میر شکار کا عہدہ بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اور اس پر کوئی ممتاز امیر مامور کیا جاتا، شکار عموماً کسی بڑی فوجی مہم سے پہلے یا بعد کھیلا جاتا، مہم سے پہلے شکار کھیل کر دشمنوں کو فریب دینے کی بھی کوشش کی جاتی کہ وہ اس کو بادشاہ یا سر لشکر کا محض تفریحی مشغلہ سمجھ کر فوج کشی کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں، بڑی مہم کے بعد شکار محض تفریح کے لیے کھیلا جاتا تھا۔

اکبر بھی بہت ہی منظم طریقہ پر شکار کھیلا کرتا تھا، شکار میں اس کے ساتھ امراء کی ایک جماعت اور کچھ فوج بھی ہوتی، شکارگاہ کو تیز اور چابک دست فوج کا دستہ چاروں طرف سے گھیر لیتا اور پھر جا بجا نگراں مقرر کیے جاتے، جو امراء ہی میں سے ہوتے، اکبر شیروں اور چیتوں کو تیر یا بندوق سے ہلاک کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ایک بار شکار میں ایک شیر ببر یکایک اس پر حملہ آور ہوا لیکن اس نے بڑی پھرتی سے اپنی کمان کھینچ کر شیر کے سر پر ایسا تیر لگایا کہ وہیں ہلاک ہو کر رہ گیا، ایک اور موقع پر ایک شیر نے ایک پیادہ کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا، اس کے ہمراہیوں نے اس کو شیر سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی، لیکن اکبر نے پہونچ کر شیر کے جسم پر ایسی گولی ماری کہ وہ ہلاک ہو کر علحدہ گر پڑا اور پیادہ کی گلو خلاصی ہوئی، بعض دلیر اور تجربہ کار شکاری بھینسے کی پشت پر سوار ہو کر شیر کا شکار کیا کرتے، ایسے شکاری بھینسے کو شیر سے لڑاتے، بھینسا اپنی سینگوں سے شیر کو اوپر اچھالتا اور گراتا، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتا، بھینسے کے علاوہ چیتوں، سیاہ گوش، کتوں اور ہرنوں کو بھی خاص طور پر تربیت دے کر شکار کے لیے استعمال کیا جاتا[۲] اکبر جب کسی مہم پر جاتا اور راستے میں کوئی جنگل پڑ جاتا تو اس میں فوجیوں کو ضرور شکار کھلاتا مثلاً وہ اپنے نویں سال جلوس

۱۔ فیروز شاہ تغلق کے شکار پوری تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف مقدمہ یازدہم۔

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھو آئین اکبری - آئین ۲۷ و ۲۸

میں مالوہ کی مہم پر گیا، تو راستے میں ناروار کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کھیلا، اسی مہم کی واپسی میں شاہی فوج مانڈو ہوتے ہوئے کھمرا رپہنچی، تو وہاں کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کیا، فوجیوں نے ایک جنگلی ہاتھی کو بڑی مشکل سے کمند میں پھنسایا، اکبر اسی وقت ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اس کو اپنے قابو میں کیا،[۱] بارھویں سال جلوس میں اکبر نے دریائے بہت (جہلم) کے پاس پچاس ہزار فوجیوں کے ساتھ شکار کھیلا تھا اور یہ شکار ایک مہینہ تک ہوتا رہا۔[۲]

ابوالفضل نے شاہی شکار کی بڑی اہمیت بتائی ہے، وہ لکھتا ہے کہ اکبر شکار ہی میں اپنے ہمراہیوں کے جوہر کا اندازہ کرتا تھا اور اس کے ذریعہ حکمرانی کے بہت سے رموز سے واقف ہو جاتا تھا۔[۳]

جہانگیر نے جس کو آج کل کے مورخین محض ایک عیش پسند حکمران بتاتے ہیں، بارہ برس کی عمر سے پچاس سال تک اٹھائیس ہزار پانچ سو تیں جانور شکار میں مارے، جن میں چھیاسی شیر چینتیس ہرن، چندرہ بھیڑیے، چونسٹھ جنگلی بھینسے اڑتالیس لکڑ بگڑ، تین عقاب اور دس گھڑیال تھے[۴] ایک بار ایک شیر کو اس نے بندوق کے کندے سے مار گرادیا[۵]، بھیڑیے کو ایک تیر میں ہلاک کرتا تھا، حالانکہ مشہور ہے کہ بھیڑیے بیسوں تیر کھانے کے بعد بھی نہیں مرتے، یہ تو ایک عیش پسند بادشاہ کے کارنامے ہیں، معلوم نہیں اس کے ساتھ شکار کھیلنے والے چالاک، چست اور چابک دست فوجیوں نے کتنے جانوروں کو کس کس طرح مارا ہوگا، شاہی شکار کا اہتمام میر شکار، میر توزک، میران منزل کرتے، ان عہدوں پر معزز درباری ہی مقرر کئے جاتے۔

---

۱ اکبر نامہ جلد سوم ،ص ۲۳۳

۲ اکبر نامہ جلد دوم ص ۸۳-۳۸۱

۳ اکبر نامہ جلد دوم، ص ۳۲۸

۴ تزک جہانگیری ص ۱۸۲

۵ تزک جہانگیری ص ۳۶۷

شہسواری:

شہسواری میں اعلیٰ مہارت پیدا کرنا ہر سوار کے لیے ضروری سمجھا جاتا، چناں چہ اپنی فوجی ورزش میں ہر سوار شہسواری کے خاص خاص فن مشق کیا کرتا تھا، ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں ملتان کے فوجیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس جگہ بہت سی کمانیں پڑی ہوئی تھیں، جو کوئی لشکری تیراندازی کا کمال دکھانا چاہتا تھا، وہ اپنی طاقت کے مطابق کسی کمان کو ہاتھ میں لے کر کھینچتا تھا اور اگر اپنی سواری کا کمال دکھانا چاہتا تھا، تو ایک چھوٹا نقارہ دیوار میں لگا ہوا تھا، وہ شخص اپنا گھوڑا دوڑا کر اپنا نیزہ اس میں لگاتا تھا اور چھوٹی سی دیوار پر ایک انگشتری لگی ہوتی تھی ۔سوار اپنا گھوڑا دوڑا کر نیزے کی انی میں پرو کر انگشتری لے جاتا تھا اور ایک گیند بھی پڑی ہوتی تھی، سوار گھوڑا دوڑا کر اس پر چوگان لگاتا تھا، جس قدر کمال کوئی ان کھیلوں میں دکھاتا تھا، اسی قدر اس کے عہدہ میں ترقی ہوتی تھی ۔ (اردو ترجمہ ص ۲۳-۲۲)

شہسواری کے خاص خاص فن یہ تھے، گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ تیزی سے دوڑانا، اس کو دو پاؤں پر کھڑا کر دینا، اس کو پانی میں ڈال کر کھائی یا دریا پار ہو جانا، اس پر سوار ہو کر دیواریں پھاندنا، اس پر بیٹھ کر نیزے سے کھونٹے اکھاڑنا یا لمبے نیزے سے ہاتھی پر بیٹھے ہوئے دشمن کو زخمی کر کے ہلاک کر دینا یا ژوپین (ایک قسم کا نیزہ) سے سوار کو مع گھوڑے کے میدان جنگ میں گرا دینا۔

ترائین کی جنگ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے پرتھوی راج کے بھائی گوبندرائے پر جو ہاتھی پر سوار تھا۔ اپنے گھوڑے پر سے نیزہ کا ایک ایسا وار کیا کہ نیزہ اس کے منہ میں گھس گیا اور اس کے دانت ٹوٹ گئے، گوبندرائے نے ہاتھی پر سے وار کا ایسا جواب دیا کہ سلطان شہاب الدین کا بازو زخمی ہو گیا، سلطان نے گھوڑے کا رخ موڑنا چاہا، لیکن وہ زخم سے نڈھال ہو کر گھوڑے پر سے گرنے ہی کو تھا کہ ایک خلجی سپاہی اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور سلطان کو اپنے سینہ سے لگا کر میدان جنگ سے اتنی تیزی سے بھاگا کہ دشمن اس کا پیچھا نہ کر سکے[1]، بعض سوار بہت ہی تیز رفتار ہوتے تھے، شیر شاہ کے زمانہ میں ایک سوار نے چتوڑ سے

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۱۹

گورنگ آٹھ سو میل کی مسافت تین روز میں طے کی تھی ۱۔ بابر کے زمانہ میں سوار بدخشاں سے آگرہ ایک مہینہ میں پہنچ جایا کرتے تھے، تیموری عہد میں میورے بہت ہی تیز رفتار شہ سوار سمجھے جاتے تھے جہانگیر کی موت کی خبر شاہجہاں کو ایک سوار نے لاہور سے جنیر (احمد نگر) بیس روز میں پہنچائی تھی، مسافت ڈیڑھ ہزار میل کی تھی۔ ۲

۱۰۳۵ھ میں جہانگیر نور جہاں کے ساتھ کشمیر سے کابل جا رہا تھا، تو جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، شاہی جلو کے اکثر امراء اور لشکری جہلم کی دوسری طرف جا چکے تھے، شاہی آقا کے حراست میں لیے جانے کی خبر پا کر بعض امراء کو بڑا طیش آیا، چناں چہ ایک امیر فدائی خان کچھ سواروں کے ساتھ اپنے آقا کی رہائی کے لیے روانہ ہوا، مہابت خان کے راجپوت سپاہیوں نے دریا کے پل میں آگ لگادی، لیکن فدائی خان نے بڑی دلیری سے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا، اس کے پیچھے اس کے ہمراہی بھی چلے، دریا میں بڑا تلاطم تھا، کچھ سوار موجوں کی تاب نہ لا سکے اور غرقاب ہو گئے، لیکن کچھ سوار فدائی خان کے ساتھ ساحل پر پہنچ گئے اور پھر خود نور جہان نے بھی اپنا ہاتھی دریا میں ڈال دیا، تو اس کی جان نثار اور جانباز فوج بھی دریا میں کود کر ساحل پر پہنچ گئی۔ ۳

کرنال کی جنگ میں نادر شاہ کے بعض سوار اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر الٹے منہ بیٹھ کر تیر اور بندوق چلاتے تھے اور گھوڑوں کو تیزی سے پیچھے کی طرف بھگاتے تھے۔

تیموری شہزادوں کے لیے شہ سواری کی ورزش بہت ہی ضروری سمجھی جاتی تھی، چناں چہ اورنگ زیب شہزادہ سلطان محمد کو برابر تاکید کرتا تھا کہ وہ سفر کی حالت میں بھی دو گھڑی تک سواری کی مشق ضرور کر لیا کرے۔ ۴

---

۱ تاریخ شیر شاہی از عباس خاں سروانی ایسٹ چہارم ص ۲۰۰

۲ شاہجہاں نامہ از محمد صالح کنبو جلد اول، ص ۳۱۲

۳ اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۶۲۔۲۶۰ ۴ رقعات عالمگیر، معارف پریس ص ۳۷

چوگان بازی:

سلاطین و امراء کی فوجی ورزش میں چوگان بازی بھی شامل تھی، سلطان قطب الدین ایک چوگان کھیلتے ہی میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوا[1]، سلطان علاؤالدین خلجی کی چوگان بازی پر امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں چوگان اور گیند کا ایک منظوم مکالمہ لکھا ہے، ملک کافور[2] اور سکندر لودی[3] چوگان کے بڑے مشاق کھلاڑی تھے، ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چوگان بازی سے طاقتور انسان مشاق شہسوار ہوتے ہیں اور گھوڑوں میں اطاعت پذیری، چستی اور چالاکی پیدا ہوتی ہے[4]، اکبر نامہ میں ہے۔

"اودرضمن چوگان بازی کہ درآداب آویزش و لگاپوے جبقلش نبردی سترگ بخشد، تربیت مجاہدان دولت و جواہر افزائی خیول کہ گزیدۂ نشاط سپاہیگری ست، سرانجام یابد۔" (جلد سوم ص ۱۷۳-۱۷۴)

تیموری عہد میں اس کھیل کے کھیلنے کا طریقہ یہ تھا کہ دس آدمی سے زیادہ اس کھیل میں شریک نہیں ہوتے۔ دو دو آدمی پہلے کھیلتے اور ایک گھڑی گزرنے کے بعد وہ آرام لیتے اور دوسری جوڑی میدان میں آتی، یہ کھیل دو طریقے پر کھیلے جاتے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ گیند کو چوگان کے خم میں لے کر آہستہ آہستہ وسط میدان سے حال تک (شاید گول پوسٹ مراد ہو) لے جاتے تھے۔ اس طریقہ کو ہندی میں رُول کہتے تھے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گیند کو تاک کر چوگان زور سے مارتے اور وسط میدان سے اس کو دور تک پھینک دیتے

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۴۰

[2] خزائن الفتوح انگریزی ترجمہ ص ۶۵

[3] تاریخ داؤدی ایسٹ جلد چہارم ص ۴۵۵-۵۷

[4] آئین اکبری۔ آئین ۲۹

کھلاڑی گیند کے ساتھ دوڑتا اور گیند کے قریب پہنچ کر اس کو وسط میدان میں لاتا، اس طریقہ کو ہندی میں بیلہ کہتے تھے، بیلہ مختلف طریقوں سے کھیلا جاتا تھا، کھلاڑی یا تو اپنے داہنے ہاتھ میں چوگان پکڑتا اور گیند پر ضرب لگاتا اس کو داہنی جانب آگے یا پیچھے پھینکتا یا یہ کہ بائیں ہاتھ میں چوگان لے کر ایسا ہی کرتا اور یا یہ کہ گیند کو گھوڑے کے سینہ کے سامنے لاکر اس کو دائیں یا بائیں طرف پھینکتا، گھوڑے کے سینہ کے علاوہ اس کے پاؤں کے پیچھے یا اس کے جسم کے نیچے سے بھی گیند اس کی طرف پھینکی جاتی، اگر گیند گھوڑے کے سامنے ہوتی۔ تو بھی سوار اس کے آگے پھینکتا یا یہ کہ گھوڑے کی پشت پر کچھ پیچھے ہٹ کر گیند کو آگے بڑھاتا، گیند کے جال میں پہونچنے کے بعد نقارہ بجایا جاتا، یہ کھیل رات کو بھی کھیلا جاتا اور اس وقت ایک روشن گیند استعمال کی جاتی، یہ پلاس کی لکڑی کی بنائی جاتی، جو جلد آگ پکڑتی اور دیر تک روشن رہتی۔[1]

شمشیر زنی:

ہر لشکری کی کمر میں ایک تلوار ضرور رہتی، اس لیے وہ شمشیر زنی کے مختلف طریقوں سے واقفیت رکھنے کی کوشش کرتا، جو اس کو فوجی ورزش کے سلسلہ میں سکھائے جاتے، بعض فوجی تلوار لے کر صرف ایک ہاتھ سے حریف کا مقابلہ کرتے، ان کو ''ایک ہاتھ'' کہا جاتا، ہندوستان کے مشرقی علاقہ کے شمشیر باز ڈھال لے کر دشمنوں سے لڑتے، ان کی ڈھال معمولی سپر سے کچھ چھوٹی ہوتی، جس کو چردہ کہتے تھے، دکنی شمشیر بازوں کی سپر اس قدر لمبی ہوتی تھی کہ ایک سوار ان کی آڑ میں چھپ جاتا، ایسی سپر کو تلوہ کہتے تھے، شمشیر بازوں کا ایک گروہ بھرایت کہلاتا تھا، ان کی سپر صرف ایک گز چوڑی ہوتی تھی، ایک اور گروہ بانایت کہلاتا تھا، اس گروہ کی تلوار بہت لمبی ہوتی تھی، جس کا قبضہ ایک گز سے زیادہ کا ہوتا، یہ گروہ دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ کر عجیب وغریب ہنر اور کرتب دکھاتا، ایک اور گروہ بنکولی کے نام سے منسوب تھا، بنکولی ایک قسم کی تلوار تھی، جو سرے پر خم دار لیکن قبضے کے

---

[1] آئین اکبری جلد اول آئین۔۲۹

قریب بالکل سیدھی ہوتی تھی، یہ گروہ سپر استعمال نہیں کرتا تھا۔[1]

فوجی ورزش میں ہر فوجی کو یہ بتایا جاتا کہ وہ تلوار لے کر اپنے حریف سے مقابلہ کرنے میں کس طرح غیر معمولی پھرتی، ہاتھ کی صفائی، پینترا بدلنے میں مشاقی اور بہادری کا جوہر دکھلا سکتا ہے اور جو فوجی ان چیزوں میں اعلیٰ مہارت دکھاتا، وہ اعلیٰ مدارج طے کرتا۔

گھوڑے پر بیٹھ کر شمشیر زنی کی مشق کے جو بہت سے اصول تھے، ان کو آداب الحرب کے مصنف نے اس طرح بتایا ہے کہ جب تلوار چلائی جائے، تو دایاں ہاتھ قبضہ پر ہو اور بایاں ہاتھ اس حصہ پر جس سے تلوار لٹکائی جاتی ہے اور پھر سوار اپنے پہلو کو اچھی طرح خم دے اور گھوڑے کی گردن کے پاس تلوار کو سیدھی کرے، تلوار کی ضرب لگاتے وقت کمر کو لچکائے، بغل کشادہ رکھے، اپنی تین انگلیوں کو قبضہ پر سخت کرے اور پھر ضرب لگائے، اس وقت گرفت ایسی ہو کہ تلوار کی دھار خراب نہ ہونے پائے، اس طرح گہرا زخم آتا ہے اور گھوڑا بھی زخمی ہونے سے محفوظ رہتا ہے تلوار چلاتے وقت گھوڑا گھومتا رہے اور دشمن پر ضرب سر شمشیر سے لگانی چاہیے، ایسی ضرب سے ایک بالشت کا زخم لگتا ہے۔ (باب یازدہم)

سلاطین، شہزادے اور امراء بھی شمشیر زنی کے فن میں بڑے مشاق ہوتے، سلطان محمود غزنوی ملتان کے محاصرہ میں تلوار لے کر کودا تو دشمنوں کے خون سے اس کا ہاتھ اس کی تلوار کے قبضہ میں اس طرح جکڑ گیا تھا کہ لڑائی کے بعد قبضہ گرم پانی سے دھویا گیا، تو ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی[2]، علاؤ الدین خلجی کی فوج ظفر خان کی نگرانی میں کیلی کے میدان میں مغلوں سے لڑی تو ظفر خان نے جس کی شجاعت اور نبرد آزمائی اس عہد میں ضرب المثل تھی، اس لڑائی میں اپنی تلوار سے پانچ ہزار مغلوں کو موت کے گھاٹ اتارے[3]، غیاث الدین تغلق نے تخت نشینی سے پہلے مغلوں کے حملے کو روکنے کے سلسلہ میں اپنی تلوار کے اعلیٰ سے اعلیٰ جوہر دکھلائے تھے، اسی لیے اس کو غازی

---

[1] آئین اکبری، جلد دوم آئین ۶۔

[2] آداب الحراب بحوالہ سلطان محمود آف غزنہ، مؤلفہ ڈاکٹر ناظم، ص ۱۵۴

[3] فتوح السلاطین ص ۲۵۶

ملک کا خطاب ملا، اس کی تلوار کے متعلق امیر خسرو رقم طراز ہیں۔

سر میدان تیغش خانۂ مرگ   کمند و گرز دام و دانۂ مرگ
سر تیغش زند بر خانمان برق   ہمیں است از بود آتش فشان برق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

کہ ہم تیغش جہانگیر است وہم رائے   بکین ہم تیغ زن ہم کار فرمائے[1]

شیر شاہ نے اپنے عنفوان شباب میں جب وہ بہار خان کا ملازم تھا، ایک شیر کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا تھا، بہار خاں نے اس بہادری پر اس کو شیر خان کا خطاب دیا تھا[2]، تلوار سے ایک شیر کو ہلاک کرنے کی مثالیں بہت ملتی ہیں، اکبر چھٹے سال جلوس میں مانوہ کی مہم سے آگرہ واپس آ رہا تھا، تو نارودار کے پاس ایک شیر ببر اپنے پانچ بچوں کے ساتھ فوج میں گھس آیا، اکبر نے بڑھ کر اس کو اپنی تلوار کی ایک ضرب میں ہلاک کر دیا، بقیہ پانچ بچوں کو فوج کے اور بہادروں نے تلوار اور تیر سے مار ڈالا[3]، جہانگیر اپنے پانچویں سال جلوس میں شکار کے لیے گیا، تو شکارگاہ میں ایک شیر نے جہانگیر کے ایک ہم راہی انوپ رائے کو دبوچ لیا، انوپ رائے کو اس حالت میں دیکھ کر شہزادہ خرم آگے بڑھا اور اپنی تلوار کی ایک ایسی ضرب لگائی کہ شیر زخمی ہو کر گر گیا، جہانگیر نے خرم کی اس شجاعت پر اس کو دو ہزاری ذات پنج ہزاری سوار کا منصب عطا کیا[4]، نور جہاں کے پہلے شوہر کو شیر افگن کا خطاب اس لیے ملا تھا کہ اس نے بھی ایک شیر کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا تھا، اورنگ زیب اپنی تلوار سے مست ہاتھی کو پیچھے ڈھکیل دیا کرتا تھا[5]، اورنگ زیب کا لڑکا اعظم شاہ جاجو کے میدان میں اپنے بھائیوں کے خلاف لڑائی لڑنے کے لیے اترا، تو بھائیوں کے پاس توپ تفنگ

---

1. تغلق نامہ ص ۳ و ۸۷۔
2. تاریخ شیر شاہی از عباس خان، ایسٹ جلد چہارم ص ۳۲۵
3. اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۴۲
4. تزک جہانگیری، ص ۹۰
5. بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری جلد اول، ص ۹۸-۴۹۲

زیادہ دیکھی، لیکن اپنی شجاعت اور بہادری کے نشہ میں مخمور ہو کر بار بار کہتا کہ توپ تفنگ تو بازیچۂ اطفال ہیں، بہادروں کا ہتھیار تلوار ہے، جنگ کا فیصلہ تلوار ہی سے ہونا چاہئے۔

گھمسان کی لڑائی کے موقع پر بہادر سپاہی ہاتھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے اتر آتے پھر زمین پر پاؤں جما کر کھڑے ہو جاتے، اپنی پوشاک کو دامن میں سمیٹ کر کمر سے باندھ لیتے اور ہاتھ میں تلوار لے کر لڑنا شروع کر دیتے، دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی پھرتی سے اپنی تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور اپنی جان کی فکر مطلق نہ کرتے، یہ شجاعت اور بہادری کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی۔

تیر اندازی:

تیر اندازی کی مشق اس طرح کی جاتی کہ مٹی کا ایک تودہ بنایا جاتا، جو عموماً پانچ فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا ہوتا اور اس تودہ پر تیر انداز کے کمال کا اندازہ ہوتا، کبھی تودہ پر ایک نشان بنا دیا جاتا، جس کو ہدف کہتے، اسی کو تاک کر ایک تیر انداز اپنا تیر چلاتا، تیر پھینکتے وقت تیر اندازوں کو بتایا جاتا کہ کمان پر ان کی گرفت بڑی مضبوط رہے، ان کی شہادت کی انگلی انگوٹھے کے ناخن یا تیر کے دندانہ پر اچھی طرح جمی ہو اور تیر چلاتے وقت ان کا اگلا پاؤں مستحکم رہے، بایاں پاؤں اور بقیہ انگلیاں ڈھیلی رہیں، جسم سیدھا ہو اور پیشانی اٹھی رہے اور کہنی بھی سیدھی ہو، ایک ہی آنکھ سے نشانہ لگائیں اور دونوں ہاتھ ایک ہی سمت ہوں، اگر ان تمام باتوں میں کوئی نقص رہ جاتا، تو تیر اندازی میں بھی نقص آ جاتا۔ اگر دو سو گز پر کسی سوار کو تیر سے ہلاک کرنا ہوتا، تو اس کے سر کو ہدف بنایا جاتا پھر تیر اس کے سینے پر آ کر لگتا اور اگر سوار صرف سو قدم پر ہوتا، تو اس کے سینہ پر تیر چلانے کے لیے اس کے چہرہ کو تاک کر نشانہ بنایا جاتا، اسی طرح اگر سوار صرف پچاس قدم پر ہوتا، تو گھوڑے کی زین کو تاک کر تیر پھینکا جاتا، اس طرح تیر سوار کے سینہ پر آ کر لگتا۔[1]

تیر اندازی کی مشق کرتے وقت عموماً ایسی کمان استعمال کی جاتی، جس میں لوہے کی زرہ

---

[1] بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری جلد اول، ص ۹۸-۲۹۲

" وتیر اتان را پیکان سودودی نیمہ جہار پر باید و اندازہ نہ سشت تیر انداز باید و بقول بعضی از

ہوتی۔ انگلیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک زہ گیر ہوتی، جو ایک بڑی اور چوڑی انگوٹھی جیسی ہوتی، زہ گیر کی مدد سے تیر زیادہ سے زیادہ دور پھینکا جا سکتا تھا۔

آداب الحرب کے مولف نے سقراط کا ایک قول نقل کر کے لکھا ہے کہ تیر اندازی سے جسم نرم ہوتا ہے، جوڑ کھلتے ہیں، بدن کا گوشت سخت ہوتا اور بڑھتا ہے، آنکھوں میں روشنی زیادہ ہوتی ہے، ہاتھ اور پاؤں سیدھے رہتے ہیں، لڑائی کا فن آتا ہے، آدمی دلیر ہوتا ہے۔

ہر شہزادہ کے لیے بھی دو گھڑی تیر اندازی کی مشق ضروری سمجھی جاتی تھی[1]، تیر اندازی کا ایک بڑا کمال یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں تیر کو تیر ہی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا، توپ تفنگ کے بعد تیروں ہی کے ذریعہ سے غنیم کے لشکر میں رخنہ اندازی اور سراسیمگی پیدا کی جاتی تھی، میدان جنگ میں تیر انداز عموماً بادشاہ یا سر لشکر یا سپہ سالار کو اپنے تیروں کا ہدف بناتے، اگر وہ تیروں سے مارے جاتے، تو فتح کا سہرا اسی تیر انداز کے سر ہوتا، بعض تخم انداز (جو تیر اندازی کی ایک قسم ہوتی تھی) اپنے تیر کو سپر، ڈھال، زرہ بکتر اور خود کے اندر پیوست کر دیتے، بعض تیر ایسا زہریلا ہوتا کہ گو جسم سے نکال بھی لیا جاتا، تو اس کا زہر اندر اندر پھیل جاتا، بعض تیر آتشیں بھی ہوتے، عام طور سے ازبک اور تورانی تیر اندازی میں بڑے مشاق اور ماہر سمجھے جاتے تھے، تورانیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے ہر تیر سے گھوڑے کی پیٹھ اس کے سوار سے خالی کر دیتے تھے، تیروں کا حملہ روکنے میں افغانی امتیازی حیثیت رکھتے تھے، عظیم الشان اور جہاندار شاہ کے درمیان جنگ جانشینی ہوئی، تو اول الذکر کے افغانی لشکریوں کے ارد گرد تیروں کی جو بارش ہوئی، تو مورخوں کا بیان ہے کہ افغانی اس کو پھولوں کی بارش تصور کر رہے تھے۔

نیزہ بازی:

نیزہ بازی کی مشق کرتے وقت عام طور سے لشکری حسب ذیل باتیں سیکھنے کی کوشش

(بقیہ حواشی)

استادان از زیر بغل تا سر انگشت سبابہ باید و بقول بعضے از سر کتف تا سر انگشت میانگی و بقول بعضے ہر دو مشت بیش گیرد و سر ہر سر انبہ از سر آرنج راست تا سر آرنج چپ بہ پنما علا اندازہ تیر آن قدر باشد"

[1] رقعات عالمگیر معارف پریس ص ۱۷۴۔

کرتا، تیز رفتار سوار کو لمبے نیزے سے روکنا[1]، سوار کو مع گھوڑے کے زخمی کر کے زمین پر گرا دینا[2]، ہاتھیوں کو زخمی کرنا[3] اور ہودج نشینوں پر وار کرنا ہے، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ بعض نیزہ باز اپنا گھوڑا دوڑا کر دیوار سے لگی ہوئی انگشتری کو اپنے نیزہ کی انی میں پرونے کی کوشش کرتے، جو نیزہ بازی میں اعلیٰ کمال کا ثبوت ہوتا، آداب الحرب میں ہے کہ اگر بن نیزہ اور سرنان سے زخم لگایا جاتا تو گہرا زخم آتا، چناں چہ اس کی بھی مشق کرائی جاتی، تبر، گرز، جمدھر اور کھپوا وغیرہ جیسے چھوٹے اسلحہ کی بھی مشق فوجی ورزش میں اس لیے کرائی جاتی کہ جب دونوں طرف کی فوجیں گڈمڈ ہو جاتیں اور تیر اندازی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا استعمال ممکن نہ ہوتا، تو یہی چھوٹے اسلحہ کام دیتے، مشت بازی یعنی (Boxing) کی تعلیم بھی اسی لیے دی جاتی کہ رو در رو جنگ کرنے میں مشت بازی سے بھی کام لیا جاتا، ڈنڈ کرنا، بیٹھک لگانا اور مگدر ہلانا بھی فوجی کھیل میں داخل تھے، جو عہد قدیم سے اب تک مروج ہیں۔

کشتی:

فوجی ورزش میں کشتی بھی تھی، فوجی اپنے پٹھوں اور اعضاء کی توانائی کے لیے آپس میں کشتی لڑا کرتے تھے اور زور آزمائی کے لیے کبھی کبھی جانوروں اور درندوں سے بھی کشتی ہو جایا کرتی تھی، سلطان قطب الدین ایبک کے حضور میں بختیار خلجی پیش ہوا، تو سلطان نے اس کو ایک بہت ہی ہیبت ناک ہاتھی سے لڑنے کا حکم دیا۔ بختیار خلجی نے پہلے ہی وار میں ہاتھی کی سونڈ پر گرز کی ایک ایسی زد لگائی کہ ہاتھی منہ پھیر کر فرار ہو گیا اور بختیار خلجی نے دور تک اس کا تعاقب کیا[5]، اکبر مست ہاتھیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور جب دو ہاتھی لڑتے لڑتے اور مست ہو جاتے، تو ان

---

۱ مثال کے لیے دیکھو اکبر جلد سوم ص ۱۵

۲ تغلق نامہ ص ۳۰

۳ فرشتہ جلد اول ص ۳۴ و بادشاہ نامہ ص ۹۰-۲۸۹

۴ طبقات ناصری ص ۱۱۹

۵ طبقات ناصری ص ۱۳۸

کے درمیان کود کر ان کو لڑاتا اور ان کو قابو میں لے آتا[۱]، ایک دفعہ ایک مردم خوار شیر قصبۂ باری میں گھس آیا، اکبر کو معلوم ہوا، تو اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر اس کو مارنے کے لیے روانہ ہوا، شیر نے اکبر کے ہاتھی کو دیکھا، تو ایک جست لگائی اور ہاتھی کی پیشانی پر ایک ایسا پنجہ مارا کہ اس کا سر زمین پر جھک گیا، اکبر سنبھلا اور شیر سے پہلوان کی طرح لڑنے لگا اور لڑ کر اس خونخوار جانور کو پسپا کر دیا[۲]، ایک بار اکبر شکار کھیلنے گیا، تو اس کے لشکر میں عادل نامی ایک فوجی تھا، عادل نے ایک شیر کو تاک کر مارا، لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا، شیر نے بپھر کر عادل کو دونوں پنجوں سے آدبوچا، عادل نے اپنے بائیں ہاتھ کو تو شیر کے منہ میں ڈال دیا اور دائیں ہاتھ سے خنجر نکالنے کی کوشش کی، بدقسمتی سے خنجر قبضہ میں الجھ گیا، خنجر نکالنے میں دیر ہوئی، تو شیر نے اس کے ہاتھ کو چبالیا، پھر بھی عادل نے خنجر نکال کر شیر کے منہ پر دو زخم لگائے، لیکن اس تصادم میں عادل کا دایاں ہاتھ شیر کے منہ میں چلا گیا، اس کشتی کو دیکھ کر اکبر کے اور ہم راہی عادل کی مدد کو بڑھے اور شیر پر تلواروں کی پے در پے ضربیں لگائیں، اتفاق سے ایک ضرب عادل پر بھی لگ گئی، جس کے کاری زخم سے دو چار مہینے پریشان رہ کر راہی عدم ہوا[۳]، اسی طرح کا ایک واقعہ جہانگیر کے شکارگاہ میں بھی پیش آیا، جہانگیر کے ایک ساتھی انوپ رائے پر ایک شیر نے جست لگائی، انوپ رائے کی کمر میں تلوار تھی اور ہاتھ میں ڈنڈا، اس نے دونوں ہاتھوں سے شیر کو دو ڈنڈے مارے، لیکن شیر غالب آیا اور اس کو زمین پر دے مارا، شیر اوپر تھا اور انوپ رائے نیچے، انوپ رائے اپنے دونوں ہاتھوں کو شیر کی گردن اور پیٹھ میں حائل کیے ہوئے تھا، پھر وہ یکایک کروٹ لے کر اور زانو پر زور دے کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور گو اس کا سینہ زخمی ہو گیا تھا، لیکن اس نے بڑھ کر شیر کے سر اور چہرہ پر دو کاری زخم لگائے، جس سے شیر کی دونوں آنکھیں کٹ گئیں اور دونوں ابروؤں کی کھال آنکھوں پر لٹکنے لگی، انوپ رائے اور شیر کی اس کشتی میں شہزادہ خرم نے بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھلائے، اس نے شیر کو ایسی ضرب لگائی کہ شیر زخمی ہو کر علحدہ ہو گیا اور بالآخر وہ

---

۱ اکبر نامہ جلد سوم ص۷۲-۷۳

۲ آئینِ اکبری ص۲۷-۲۸

۳ اکبر نامہ جلد دوم ص۳۳۹

مارا گیا، جہانگیر نے خوش ہو کر شہزادہ خرم اور انوپ رائے دونوں کو خطاب اور منصب عطا کئے۔[1]

(اپریل ۱۹۵۱ء)

اورنگ زیب جب چودہ برس کا تھا، تو ایک بار شاہجہاں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا، ایک ہاتھی بھک کر اورنگ زیب کے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا، اورنگ زیب نے اپنے برچھے سے ہاتھی کی پیشانی پر دو زخم لگائے، ہاتھی اور بھی زیادہ غضب ناک ہوا اور اس نے اورنگ زیب کے گھوڑے پر اس زور سے حملہ کیا کہ گھوڑا اورنگ زیب سمیت لڑکھڑا کر گر گیا، لیکن اورنگ زیب لوٹ پوٹ کر پھر کھڑا ہو گیا اور اپنی تلوار سے ہاتھی کو پیچھے دھکیل دیا، اس اثناء میں اور فوجی سردار اس کی مدد کو پہنچ گئے اور جب ہاتھی پسپا ہوا، تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کو سینہ سے لگا لیا اور اس پر موتی اور روپے نچھاور کئے، شاہجہانی دربار کے ملک الشعراء ابوطالب کلیم نے اس واقعہ کو منظوم بھی کیا۔

(اپریل ۱۹۵۱ء)

[1] تزک جہانگیری، ص ۹۰

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بعض آلاتِ حرب

ازمنۂ وسطی میں سڑکوں کی کمی اور نقل وحمل کی مشکلات کی وجہ سے آلاتِ حرب ایسے ہوتے تھے، جو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکیں، جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی، تو اس کے دوردراز علاقوں میں پہنچنے کے لیے وہی دقتیں پیش آئیں، جو براعظم ایشیا کے مختلف ملکوں میں پہونچنے میں پیش آتی ہیں، اس لیے فوج کے سپاہیوں نے ایسے اسلحہ استعمال کیے، جنھیں اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے یا گھوڑوں یا بار برداری کے جانوروں پر آسانی سے لادے جاسکتے تھے، اس کے علاوہ اس عہد میں ہتھیاروں کی جنگ نہیں ہوتی تھی، بلکہ شجاعت، جانبازی اور مردانگی کی جنگ ہوتی تھی، اس لیے ہر فوجی اسلحہ سے زیادہ اپنی جرأت اور پامردی پر بھروسہ کرنا پسند کرتا تھا، پھر بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ اسلحہ ضروری تھے، اس کی مردانگی کا اصلی جوہر اس کی شمشیر سے ظاہر ہوتا تھا، اس لیے اس زمانہ کا یہ بہت ہی محبوب اور مقبول ہتھیار سمجھا جاتا تھا- آداب الحرب[1] والشجاعۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اگر لشکری کے پاس تمام اسلحہ ہوں اور شمشیر نہ ہو، تو اس کے آلاتِ حرب ناقص اور نامکمل ہیں اور اگر شمشیر کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں، تو اس کا حربی سامان ناقص نہیں اور اس کو نقصان پہونچنے کا کم خطرہ ہوتا ہے، اسی مصنف نے شمشیر زنی کی اہمیت کے ثبوت میں یہ روایت لکھی ہے کہ ایک روز حضرت خالدؓ بن ولید حضرت عمرؓ کے پاس گئے، تو انھوں نے ان سے پوچھا کہ تیر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے- حضرت خالد نے جواب دیا، اچھا ہتھیار ہے، اس سے دشمنوں کو دور رکھ کر مغلوب کیا جاسکتا ہے، لیکن تیراندازی میں خطا کے امکانات بہت ہوتے ہیں- حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ نیزہ کے متعلق کیا

---

[1] یہ کتاب مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر نے ۶۰۷ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان لکھی اور سلطان التمش کے نام معنون کی۔

رائے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب دیا کہ لشکریوں کا پشت پناہ ہے، لیکن اس سے اکثر دھوکا ہوتا ہے، جب یہ دشمن کے جسم میں چار انگل تک گھس جاتا ہے، تو نیزہ باز اپنے کو غیر محفوظ پاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا اور سیف کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت خالدؓ نے جواب دیا، یہی وہ چیز ہے، جو ماؤں کو اپنے لڑکوں کے لیے رلا دیتی ہے۔

تیغ:

آداب الحرب کے مصنف نے اپنے زمانہ کی تلوار کی بہت سی قسمیں بتائی ہیں مثلاً چینی، روسی، خزری، رومی، فرنگی، یمانی، سلیمانی، شاہی، علائی، کشمیری اور ہندی لیکن سب سے زیادہ تیغ ہندی کی تعریف کی ہے۔

"اما از ہمہ تیغہا ہندی بہتر و گوہر والہ تر و برندہ تر آید"۔

تیغ ہندی کے مختلف نام تھے مثلاً پرگس (جو موج دریا بھی کہلاتی تھی) پرالک، تراوتہ، رومیہیا، مان گوہر، باحری، تورمان، سورمان اور بناہ ان تلواروں میں موج دریا بہت ہی قیمتی سمجھی جاتی تھی، یہ شاہی خزانہ میں بھی ایک سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اہل ہند پرالگ، تراوک اور رمیہیا ہی زیادہ پسند کرتے تھے، یہ تلواریں سخت ہوتیں اور گہرے زخم لگاتی تھیں، وہ رات کو پانی میں رکھ دی جاتیں، تو دوسرے دن اُن سے اور بھی کاری زخم لگتا تھا، باحری بھی بڑی جوہر دار تلوار تھی۔ خراسان اور عراق کے بعض صناعوں نے باحری کی نقل اتارنی چاہی، لیکن وہ ہندوستان جیسی تیار نہ کر سکے۔

تورمان کا نام ایک ہندو راجہ کے نام پر تھا، جو دسویں عیسوی صدی کے آغاز میں وادی کابل کا حکمران تھا۔ افغانی قبائل کے لوگ زیادہ تر تورمان اور سورمان ہی استعمال کرتے تھے۔ بناہ بہت ہی خطرناک سمجھی جاتی تھی، اُس کی زد سے جو زخم آتا، اس کا مندمل ہونا ناممکن نہ ہوتا، یہ نرم لوہے، مس اور چاندی کی دھات سے بنائی جاتی تھی۔

تلواروں کے بعض بہترین صناع دریائے سندھ کے ساحل پر لیہ اور بھکر کے درمیان کروڑ کے پاس حصار گورج کے رہنے والے تھے، وہ فولاد سے تلواریں بناتے تھے، جن کے

جوہر کھجور کی پتیوں کی طرح ہوتے تھے[1]، راناؤں، ٹھاکروں اور قبائلی علاقہ کے لوگوں میں یہ تلوار بہت مقبول تھی۔

محمود غزنوی کی محبوب تلوار قلاچوری تھی، جو اتنی لمبی ہوتی تھی کہ نیزہ کی طرح بھی استعمال کی جاتی تھی اور اس کے خم کی وجہ سے اس سے بڑا گہرا زخم لگتا تھا۔

تیموریوں کے دور میں تلواروں کی مذکورہ بالا اقسام میں کچھ اور اضافہ ہوا مثلاً تلوار کی ایک قسم کا نام عصا شمشیر تھا، جس کو دھوپ اور کھانڈہ بھی کہتے تھے، یہ تلوار بالکل سیدھی، کافی چوڑی اور چار فٹ لمبی ہوتی تھی، اس کا قبضہ گہرا ہوتا، اس کا رکھنا شاہی دبدبہ کے لوازم میں داخل تھا۔ بادشاہ جب دربار میں آتا، تو ایک شخص اس تلوار کو مخمل کے منقش غلاف میں سیدھے اٹھا کر آگے آگے چلتا تھا اور جب بادشاہ دربار میں بیٹھ جاتا، تو اس کی مسند پر سامنے رکھ دی جاتی، کبھی یہ تلوار امراء اور جانباز سپاہیوں کو بطور انعام بھی دی جاتی تھی۔ ایک اور قسم کی تلوار سروہی کہلاتی، جو راجپوتانہ کے ایک مقام سروہی میں تیار ہوتی تھی، اس سے بڑی کاری ضرب لگتی تھی، اگر سر پر وار کیا جاتا، تو کمر تک اترتی چلی جاتی، بعض سیدھی تلواروں کے نام پٹہ، گپتی اور اعصا تھے، چھوٹی تلوار کو نیمچہ شمشیر کہتے تھے۔[2]

سپر:

ہر تلوار کے ساتھ سپر یعنی ڈھال کا ہونا ضروری تھا، جو عام طور سے بیل، نیل گائے، ہرن ہاتھی اور گینڈے کے چمڑے سے بنائی جاتی، گینڈے کے چمڑے کی ڈھال بہت قیمتی ہوتی

---

[1] ان تلواروں کی صنعت سازی کی تفصیل یہ ہے:
" آہنگر کہ تیغ خواہد زد دو خفجہ از آسن بولاد بکشند، بعد ازاں ہر دو را نیک گرم کند دیگرے را براست، تباید و دیگرے را بجب تباید، بس در گل گیر بلک شبان رو زانرا در کور نہد دید مدتا ہر دو خفجہ بگدازند، دیربلک دیگر سخت شود، بس از گل بیرون کشند و تیغ زنند، دباندام کند، چوں چرخ کند و دارد دید گوہر او بر مثل برگ خرما کہ بر درخت باشد ہمچنان پیدا آید "

[2] آئین اکبری حصہ اول کے آئین ۳۵ میں بعض تلواروں کی تصویریں ملیں گی۔

تھی۔ ہندو جو چمڑے کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے، عموماً ریشم کی ڈھال بناتے تھے، لوہے کی اکثر ڈھالیں منقش اور مطلا ہوتی تھیں۔ بید سے بنی ہوئی ڈھال کو پھری کہتے تھے، ڈھال کی قسموں میں چرواہ اور تکواہ بھی تھیں۔ اکبر جب میدانِ جنگ میں شریک ہوتا، تو شمشیر بازوں کی ایک جماعت چرواہ اور تکواہ لیے اس کے گرد حصار کیے رہتی تھی، ڈھال کا قطر ۱۷ سے ۲۴ انچ تک ہوتا تھا، میدانِ جنگ میں یہ ہمیشہ بائیں ہاتھ میں ہوتی اور لڑائی کے بعد کاندھے پر لٹکائی جاتی۔

کمان:

سلاطین دہلی کے عہد میں عام طور سے جو کمانیں رائج تھیں، اُن کی حسب ذیل قسمیں تھیں۔

''چاچی، خوارزمی، ہروانچی، غزنیچی، لاہوری،
کروری، ہندوی، کوہی۔''

چاچی کمان سخت ہوتی تھی، جس کو زیادہ تر ماوراء النہر کے لشکری استعمال کرتے تھے، خوارزمی کمان کا خانہ تو چھوٹا ہوتا، لیکن اُس کے گوشے یعنی جس میں زہ باندھی جاتی تھی، دراز ہوتے تھے، اس کی زہ یعنی چلہ یا ڈوری گھوڑے کی کھال سے بنائی جاتی، جو موٹی ہوتی تھی اور اس کا تیر بھی موٹا ہوتا، لیکن اس کا پیکاں چھوٹا ہوتا تھا، اس سے زخم اچھا نہ لگتا تھا، کیوں کہ تیر کے بھاری اور پیکاں کے ہلکے ہونے سے تیر چھوڑتے وقت اس میں لرزش پیدا ہو جاتی، پروانچی، غزنیچی، لوہوری اور کروری کمان قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوتی تھیں، کوہی کمان پہاڑی بکرے کی سینگ سے بنائی جاتی، ہندی کمان بانس سے تیار کی جاتی اور اس کی زہ بھی بانس ہی کی ہوتی تھی، اس کا تیر دور تو نہیں جاتا تھا، لیکن نزدیک سے اس سے سخت زخم لگتا، امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں کمان کے اقسام میں چاچی کے علاوہ خطائی، لاچی اور ایبک کے نام بھی بتائے ہیں۔ خطائی اور لاچی غالباً خطا اور لاچین میں تیار ہوتی تھیں۔

بعض کمانیں بھینس کی سینگ لکڑی، بانس، ہاتھی کے دانت اور لوہے کی بھی ہوتی تھیں لیکن کمان کا بالائی حصہ یعنی بیرونی حصہ لکڑی ہی کا ہوتا، جس کو خوبصورت بنانے کے لیے منقش کر دیا جاتا، کمان چار فیٹ لمبی اور دونوں طرف جھکی ہوتی، کمان کی ڈوری یعنی زہ یا چلہ دونوں طرف

باندھ دیا جاتا، جس کو گوشہ یا سفار کہتے تھے- زہ عموماً سفید ریشم کی ہوتی یا کبھی نے کے چھلکے اور بھیڑیے، گینڈے، نیل گائے اور گھوڑے کی کھال کی بھی بنائی جاتی، زہ کے بیچ میں تین یا چار انچ کی گرہ ہوتی، جس کو انگوٹھے سے کھینچتے اور کھینچتے وقت شہادت کی انگلی ناخن پر ہوتی تھی کہ کھینچنے میں سہولت ہو یا تیر کے دندانہ پر ہوتی تاکہ گرنے نہ پائے، انگلیوں کے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بڑی اور چوڑی انگوٹھی جیسی زہ گیر ہوتی تھی، یہ حسب حیثیت قیمتی پتھر، بلور، ہاتھی دانت، سینگ، مچھلی کے کانٹے سونے، چاندی یا لوہے کی ہوتی تھی، کبھی زہ گیر کے بجائے انگشت وانے (یعنی انگشتانے) استعمال کرتے تھے، جو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی انگلی پر چڑھے رہتے تھے[1]، زہ گیر اور انگشتانے کے استعمال سے تیر زیادہ سے زیادہ دور پھینکا جا سکتا تھا، تیر اندازی کے استاذ اپنی ہر کمان کے لیے دو زہ اور دو انگشتانے رکھتے، تاکہ اگر ایک خطا کرے تو دوسرے سے فوراً کام لے لیا جائے-

آئین اکبری میں بعض کمانوں کے لیے تخش کمان اور کنٹھا کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، تخش کمان چھوٹی کمان کو کہتے تھے، کنٹھا بھیلوں کے استعمال میں رہتی تھی، اس کے استعمال کا طریقہ یہ تھا کہ کمان کو پاؤں سے دبا کر اور زہ کو ہاتھ سے کھینچ کر تیر اس زور سے پھینکتے تھے کہ ہاتھی کے پیٹ کے اندر گھس جاتا، ایک اور قسم کی کمان گروہہ تھی، جو شاید غلیل کی طرح ہوتی تھی-[2]

تیر:

تیر زیادہ تر بید اور کلک کے ہوتے تھے، کلک کا تیر بہت ہلکا ہوتا تھا اور ایک اچھا تیر انداز اس کو لوہے اور فولاد کے اندر بھی پیوست کر سکتا تھا، نرکٹ سے بھی تیر بنایا جاتا تھا-

پھر تیر گدھ اور عقاب کے دُم سے بناتے تھے اور اگر گدھ اور عقاب کی دُم نہ ملتی، تو

---

1. انگشتوانہ کے متعلق آداب الحرب کے مولف نے لکھا ہے-

"چند نوع است غازی دارد میری دار و ترکی دار اما بہترین غازی دار باشد تا سر انگشت ترند کہ ہر کسے تیر انداز استاد نباشد"

2. آئین اکبری آئین ۲۵، آئین قورخانہ میں ان کمانوں کی تصویریں بھی دیکھی جا سکتی ہیں-

شاہین، کلنگ، سرخاب، بط، چیل، شتر مرغ، بوتیمار، مور اور شکرے کے پروں سے بھی بنالیتے تھے، کبھی کبھی ایک تیر میں کئی پر ہوتے تھے، جو زہر آلود کر دیئے جاتے تھے۔

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر کے سپہر پنجم میں تیروں کے حسب ذیل اقسام بتائے ہیں:

"ہوائی، زمینی، برگ بید، سوری، گزہ، تیر گز، بیلک"

تیموریوں کے آخری زمانے میں بعض تیروں کے نام یہ تھے:

"گھیر، دو سونہا، طرح ماہ، طرح ہلال، طرح بادام، طرح توکو(؟) طرح بھالا، طرح خار، طرح خاکی وغیرہ جن کی نوعیت اُن کے ناموں سے ظاہر ہوگی"۔

تیر پیکان، گائے، بھینس اور گدھے کی ہڈیوں سے بناتے اور اس کو بھی زہر آلود کر دیتے تھے، زہر آلود تیر اور پیکان سے جو زخم آتا، وہ مشکل ہی سے اچھا ہوتا، اگر مندمل بھی ہو جاتا، تو برسوں تکلیف باقی رہتی [1]، جس تیر میں پیکان نہ ہوتا، اس کو تکہ کہتے تھے [2]، بعض تیر انداز تیروں کو ایک نلکی کے ذریعہ سے پھینکتے تھے، جس کو ناوک کہا جاتا تھا، تیر انداز جس میں تیر رکھا کرتے اس کو ترکش کہتے تھے، ترکش عموماً چمڑے کا ہوتا، اس میں ایک چمڑے کی ڈوری لگی رہتی تھی، جس کو تیر انداز اپنے گلے یا کاندھے میں لٹکا لیتا تھا۔ امراء منقش مخمل کے بھی ترکش رکھتے تھے، ہر تیر انداز ایک پیکان کش بھی ساتھ رکھتا تھا، جس سے وہ ضرورت کے وقت زخمی جسم سے پیکان نکال لیتا تھا [3]۔

نیزہ یا ستان:

عربی، عراقی اور خراسانی نیزے عموماً بید کے ہوتے تھے، لیکن سب سے اچھا نیزہ

[1] آداب الحراب باب یازدہم

[2] برہان قاطع میں ہے "نوعے از تیرست کہ بجائے پیکان گرہے دارد"

[3] برہان قاطع میں ہے

"نوعے از تیر باشد و آن تیر سیت کوچک و بعضے گویند آنئے ست جوبین و میان خالی کہ تیر ناوک را در میان آن گذشتہ می انداختند" و بعضے گویند ناوک باشد از آہن کہ تیر کوچکے دران نہند و بعد ازان در کمان گذاشتہ اندند۔

ہندوستان کا ہوتا تھا، جو نے سے بنایا جاتا تھا۔ آداب بحرب میں ہے۔

"ہیچ نیزہ بہتر از نے نیزہ ہندوستان نیست" (باب یاز دہم)

نے سے نیزہ بناتے وقت اس کا خیال رکھا جاتا کہ نے کا اندرونی حصہ بھرا نہ ہو، بلکہ خالی ہو، کیوں کہ ایسا نیزہ ہلکا ہوتا تھا، اس میں لرزش پیدا نہیں ہوتی، بھیڑیے کی پنڈلی اگر نیزہ میں لگادی جاتی، تو اس سے کاری زخم آتا۔[1]

نیزہ کی ایک قسم نیزہ مرد گیر ہوتی، جو چوگان کی طرح لمبا ہوتا تھا، اس کے سرے پر ایک خم دار پھل ہوتا، حربہ ایک چھوٹا نیزہ تھا، جو سلطان کے محافظوں کے پاس رہتا، شل وژوبین بھی ایک قسم کا لمبا نیزہ تھا، جس سے اگر پوری قوت سے ضرب لگادی جاتی، تو سوار مع گھوڑے کے ہلاک ہوجاتا، پیل کش بھی ایک نیزہ تھا، جس سے ہاتھی کو زخمی کیا جاتا تھا، نیم نیزہ چھوٹا نیزہ ہوتا، خشت نیزہ اور تیر کی ملی جلی قسم تھی۔

آئین اکبری میں نیزہ کی کئی قسمیں لکھی ہیں، نیزہ، برچھا، سانگ، سینٹھی، بیلرہ۔

جو نیزہ سواروں کے استعمال میں رہتا تھا، وہ بہت ہی لمبا ہوتا، جس کا دستہ بانس کا اور سرا لوہے کا ہوتا تھا، برچھا نیزہ سے وزنی اور تمام لوہے کا ہوتا تھا، برچھا پیدل سپاہیوں کے ہاتھ میں رہتا۔

آئین اکبری تصویر میں سانگ برچھا سے چھوٹا دکھایا گیا ہے، یہ بھی تمام تر لوہے ہی سے بنایا جاتا، اس کا منہ چوپہل یا سہ پہل ہوتا، سینٹھی سانگ سے چھوٹا، لیکن بیلرہ سینٹھی سے بڑا اور سانگ سے چھوٹا ہوتا تھا، ایک چھوٹے قسم کے نیزے کو نیزہ خورد وتی کہتے تھے۔[2]

گرز:

گرز سلاطین دہلی[3] اور شاہان مغلیہ دونوں کے عہد میں استعمال کیا جاتا تھا۔ آئین اکبری کی تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ تیموری عہد میں گرز تقریباً ڈھائی فٹ کا ایک چھوٹا، آہنی ڈنڈا ہوتا

۱۔ آداب الحرب باب یازدہم

۲۔ نیزہ کی اور قسموں کے یہ نام تھے اعلم، گز اسار، پنج کھی، چندی بلم، لنگے، گز صیا، علم وغیرہ

۳۔ طبقات ناصری ۹۹، ۱۳۰، ۱۱ و آداب الحرب باب یازدہم

تھا، جس کے سر پر تین بڑی اور وزنی مدور لٹو ہوتا تھا، دو ادھر ادھر اور ایک بیچ میں گرز کی ایک قسم ششپر بھی تھی، جس کے اوپر ایک بہت وزنی لٹو ہوتا ہے۔[1]

ناچخ:

ناچخ گرز ہی کی ایک قسم تھی، جس میں تلوار بھی ہوتی تھی، یہ شاہی ہتھیار تھا۔ آداب الحرب میں ناچخ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

"سلاح بادشاہانست کہ ہم دوست را شاید ہم دشمن را، دوست رااز مہرہ ناچخ زنند دبجاے گرز کار کنند و دشمن رابروے، ناچخ زنند، بجائے شمشیر کار کنند"۔[2]

آئین اکبری کے آئین قورخانہ کی فہرست میں ناچخ کا ذکر نہیں۔

تبر:

تبر دیلمیوں کا ہتھیار تھا، لیکن عام طور سے ہندوستان میں بھی رائج ہو گیا تھا، یہ گھوڑے کی زین میں آویزاں رہتا تھا، اس کی شکل کلہاڑی سے ملتی ہے۔

آئین اکبری میں مختلف قسم کے تبر کی تصویر دی ہوئی ہے، ایک تبر کا پھل مستطیل نما یعنی

---

[1] گرز کے بعض نام دھارا اور گرگز بھی تھے، دھارا کے سر پر چھ لٹو ہوتے اور اس کا دستہ ہشت پہل ہوتا، گرگز کے اوپر آٹھ لٹو ہوتے اور اس کا قبضہ بید کا ہوتا، گرز کا ایک نام پچاق بھی تھا، برہان قاطع میں ہے:

"گرز آہنین شش پروہ را گویند و درین زمان جو بدست سر گرہ داردامی گویند"

[2] برہان قاطع میں ناچخ کی یہ اور تشریح ہے:

"تبرزین را گویند، و آن نوعے از تبرست کہ سپاہیان بہ پہلوے زین اسپ بندند و بعضے گویند سنانے ست کہ سر آن دو شاخ باشد و نیزہ کوچک را نیز گویند۔"

[3] آداب الحرب باب یازدہم

کھاڑی کے پھل کی طرح ہوتا تھا، بعض تیر میں پھل کے علاوہ اس کے سر پر نیزہ کی طرح ایک لمبی نوک نکلی ہوتی تھی، اس کی ایک اور دوسری قسم کو زاغنول (کوے کی چونچ) کہتے تھے، جس کے پھل کے دونوں طرف دھار ہوتی تھی، اگر زاغنول کے دو طرف پھل ہوتے، تو وہ زاغ نول کہلاتا تھا، اس کی ایک طرف کا پھل چوڑا اور دوسری طرف کا نوکیلا ہوتا تھا، تیر دستہ کی لمبائی عموماً ۲۲ انچ ہوتی تھی، جس تیر کا دستہ بہت لمبا ہوتا، اس کو تر نگالہ کہتے تھے، غالباً چھوٹے تیر کی قسم بسولہ بھی تھی، جس کی شکل چھینی سے ملتی ہوتی ہے، اس کے ساتھ ایک دو مدور ہالے ہوتے تھے، جن کو چکر بسولہ کہا جاتا، بعض تیر بہت مرصع ہوتے، جو زیادہ تر دربار میں شاہی محافظوں کے ہاتھوں میں دکھائی دیتا، تیر کے لیے چھماخ کی بھی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔[۱]

پیازی:

آئینِ اکبری (ص ۸۰) میں تیر، زاغنول، چکر بسولہ کے ساتھ پیازی کا بھی نام درج ہے، شاید یہ تبر ہی کی کوئی قسم ہو، لیکن برہانِ قاطع میں ہے۔

"نوعے از گرز ہم ہست وآن چنان ست کہ چند گوے فولادی راباچند زنجیر کوتاہ مضبوط کردہ بدستہ از چوب محکمے نصب کنند وآن رابہ ترکی چوگن گویند"

فلاخن یا فلاسنگ:

یہ سنگ اندازی کا آلہ تھا، اس میں ریشم یا رسی کا پھندا ہوتا، جس میں وزنی پتھر رکھ کر غنیم پر پھینکا جاتا، یہ پتھر جس کے سینہ یا پیشانی سے ٹکراجاتا، تو یا وہ ہلاک یا بری طرح زخمی ہوجاتا،[۲] تیموری دور میں فلاخن کے لیے گوپھن کی بھی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔[۳]

۱۔ برہانِ قاطع، ص ۳۲۶

۲۔ آدابُ الحراب

۳۔ خافی خاں جلد دوم ص ۵۵۶

کمند:

اس سے حصار اور قلعہ کی دیواروں پر چڑھنے میں مدد ملتی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کی فوج کے ایک لشکری نے ایک لڑائی میں دشمن کے ایک سوار اور اس کے گھوڑے کو کمند کے پھندے میں الجھا کر اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا، جس سے غنیم کی صف میں انتشار پھیل گیا تھا، کمند کا استعمال تیموری دور میں بھی جاری رہا۔

کٹارہ:

کٹارہ کے متعلق آداب الحرب کے مصنف نے صرف اتنا کہا ہے کہ:

"سلاح ہندوان وبیے باکان و غدارا نست"

آئینِ اکبری کی تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تلوار اور خنجر کی ملی جلی شکل کا ایک ہتھیار تھا، اس کا پھل کچھ تیز ھا ہوتا تھا، جس کی چوڑائی قبضہ کے پاس تین انچ اور سرے پر ایک انچ ہوتی تھی، گرفت میں لینے کے لیے دو الگ الگ دستے ہوتے تھے، جو قبضے کے پاس ایک دوسرے سے مل جاتے، کٹارہ کے لیے کبھی کٹار اور کبھی کٹاری کی بھی اصطلاح استعمال ہوتی۔

دشنہ:

آداب الحرب میں ہے:

"سلاح عیار پیشگان و جان بازان و دردانست"

برہان قاطع میں ہے:

"نوعے از خنجر است کہ بیشتر امردم لارسی دارند"

آئینِ اکبری میں تیموری دور کے اور ہتھیاروں کے نام یہ دیئے گئے ہیں۔

جمدھر:

اس کا دستہ تقریباً کٹاری کی طرح ہوتا، لیکن پھل سیدھا اور چوڑا ہوتا تھا۔

خنجر:

اس کا پھل کچھ ٹیڑھا اور قبضہ تلوار کے جیسا ہوتا۔

خنجر کی اور قسموں کے نام جم کھاک بانک، بچھوہ، جنبوہ اور نرسنگھ موٹھ، پیش قبض وغیرہ تھے، ان کی ساخت میں کچھ تھوڑا فرق ہوتا تھا۔

کارد:

قصاب کی چھری کی طرح ڈھائی فیٹ لمبی ہوتی، اس کا پھل دو انچ چوڑا ہوتا۔

کچھی کارد:

یعنی وہ بڑی اور لمبی چھری جو چھڑی کے اندر ہوتی۔

تچی کارد:

اس کی شکل تچی یعنی کوڑے کی طرح ہوتی تھی۔

چاقو:

یعنی وہ چھری جو مڑ کر چوبیں دستے میں رہتی تھی، اس کے کئی پھل ہوتے تھے۔

تفنگ دہان:

یہ غالباً ایک نلی ہوتی تھی، جس سے منہ سے پھونک کر مٹی یا پتھر کی گولیاں پھینکی جاتی تھیں۔

پشت خار:

یہ ہاتھ اور بازو کی شکل کا ایک آہنی ہتھیار تھا۔

خار ماہی:

اس کے دونوں طرف مچھلی کے کانٹے کی طرح کیلیں نکلی رہتی تھیں۔

گرہ کشا:

یہ نیزہ کی طرح لمبا ہوتا تھا، اس کے سرے پر چاند کی شکل کا ایک پھل ہوتا تھا، جس کے اوپر ایک نکلی ہوئی تیز نوک بھی ہوتی تھی۔

شعت آویز:

آئین اکبری میں اس کی کوئی تصویر نہیں دی ہے۔

اس مقالہ میں آتشیں اسلحہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، آئندہ کسی موقع پر کیا جائے گا۔

ستمبر ۱۹۵۳ء

maablib.org

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجوں کا معائنہ

غزنویوں کے دور میں فوجی معائنہ کی ذمہ داری صاحب دیوان عرض یا عارض پر ہوئی تھی وہ تمام لشکریوں کے حالات اور تفصیلات کے رجسٹر رکھتا تھا، جس میں ان کی حاضری، غیر حاضری، رخصت، بیماری اور موت وغیرہ باضابطہ درج رہتی تھی۔ صاحب دیوان عرض کے فرائض میں ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ فوج کی کارگی کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے، اسی لئے وہ فوج کا معائنہ برابر کرتا رہتا تھا، یہ معائنہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور ہوتا ہے، لشکر کے تمام افراد حدود سلطنت کے اندر اور باہر سے آکر غزنین کے پاس باہر کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور پوری فوج صاحب دیوان عرض کے سامنے گزرتی تھی کبھی کبھی سلطان بھی اس موقع پر چتر شاہی سر پہ ڈالے ہاتھی پر سوار موجود رہتا تھا[2]، سلطان محمود کے زمانہ کے ایک فوجی معائنہ کی تصویر گردیزی نے اس طرح کھینچی ہے۔

> "۴۱۴ھ میں (سلطان محمود نے) فرمایا کہ لشکر کا معائنہ کیا جائے ۴۵۰ ہزار سوار شاہ بہار کے میدان میں عرض کے لئے حاضر ہوئے۔ ان میں مملکت کے باہر کے سوار اور نواح کے شحنے بھی تھے، جو ہاتھی معائنہ کے لئے آئے تھے ان میں و برگستوان اور اسلحہ سے مسلح تیرہ سو ہاتھی تھے۔ دوسرے جانور مثلاً اونٹوں اور گھوڑوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی"[3]

---

۱ بیہقی جلد اول ص ۵۳۲ بحوالہ محمود آف غزنہ مصنفہ ڈاکٹر ناظم الدین

۲ بیہقی ایلیٹ جلد دوم ص ۱۲۱

۳ زین الاخبار صفحہ ۸۰

ہاتھیوں پر سلطان محمود کی خاص توجہ تھی، جب لشکر کے ہاتھی غزنین میں رہنے کی وجہ سے دبلے اور لاغر ہو جاتے تو ان کو کچھ دنوں کے لئے ہندوستان بھیج دیا جاتا۔ جہاں کی آب وہوا ان کے لئے مناسب ہوتی۔

مملوک سلاطین کے یہاں بھی فوجوں کا معائنہ غزنوی اور غوری بادشاہوں کی روایت کے مطابق ہی ہوتا تھا، لیکن سلطان شمس الدین التتمش کے بعد فوجی عہدیدار اپنی اپنی جاگیروں کو موروثی بنا کر اس قدر آسودہ حال اور آرام طلب ہو گئے تھے کہ معائنہ میں حاضر ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے معائنہ کے وقت دیوان عرض، نائب عارض ممالک اور اس کے دفتر کے لوگوں کو رشوتیں مثلاً شراب، بکری، مرغ، کبوتر، روغن، غلہ وغیرہ دے کر غیر حاضر رہا کرتے تھے، بلبن نے ان کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا، توانا اور تندرست لشکریوں کی جاگیریں بند کر دیں، گو اس کو یہ حکم بعد میں منسوخ کرنا پڑا، لیکن معائنہ میں سختی ہونے لگی، بلبن کی یہ ہدایت تھی کہ فوج کی کیفیت روزانہ اس کے سامنے پیش کی جائے اور اس کے لئے وہ دیوان عرض ممالک کے عہدہ پر بہت زیرک اور ہوشمند خان یا ملک کو مامور کرتا تھا۔ امیر خسرو کے نانا عماد الملک روایت نے دو قرن تک یہ خدمت انجام دی۔ بلبن نے ان پر بھروسہ اور اعتماد کر کے اس کو بالکل مطلق العنان بنا دیا تھا، عرض یعنی معائنہ کے وقت جو سوار مستعد اور چالاک نظر آتا، عماد الملک اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا، اس کو خلعت دیتا اور عسکری عنایتوں سے نوازتا، اگر کسی سوار کا گھوڑا یا ہتھیار ضائع ہو جاتا تو عماد الملک اپنی جیب خاص سے اس کی مدد کرتا، اگر کسی کا گھوڑا لاغر نظر آتا تو پہلے اس سوار کے متعلق دریافت کرتا کہ وہ شراب خواری یا کسی اور علت میں تو مبتلا نہیں ہے، اگر بری عادتوں سے پاک پاتا تو اس کو اپنی پائیگاہ سے فربہ گھوڑا یا اس کی قیمت دیتا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ عماد الملک اپنے لشکریوں پر اس طرح مہربان تھا، جس طرح ماں باپ اپنے بچوں پر ہوتے ہیں، وہ خود کہا کرتا تھا کہ میں فوج کا سردار ہوں، اگر ان کی فریاد نہ سنوں تو پھر میرا وجود ان کے لئے بیکار ہے وہ ہر سال دیوان عرض کو اپنے یہاں مدعو کرتا اور دفتر کے تمام کارکنوں کو بھی بلاتا، ان کو خلعت دیتا اور انعام میں بیس ہزار

ل برنی ص ۱۱۶

ٹنکے تقسیم کرتا اور ان میں سے ہر ایک کے اپنے پاس بلا کر اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا اور ان کو بڑی نرمی سے مخاطب کر کے کہتا کہ:

''تم لوگ بادشاہ پر، جو فوج کا مالک ہے، مجھ پر کہ میں فوج کا عارض ہوں، لشکر پر جو سلطنت کی رعایا کے نگہبان ہیں، رحم کرو اور لشکریوں سے رشوت کے طور پر کوئی چیز حاصل کرنے کی امید نہ رکھو، اگر تم میں سے ملوک اور امراء کے نائب عرض اپنا حق سمجھ کر لشکریوں سے کوئی چیز حاصل کریں، تو پھر ان کے نائب دوگنی تین گنی چیزیں لشکر سے وصول کریں گے اور ان کو اپنا حق سمجھ کر لشکریوں کی تنخواہ سے وضع کریں گے، اس طرح یہ لشکری تم کو دیں گے اور ایک ثلث خود رکھیں گے، اس طرح پورا لشکر تباہ ہو جائے گا لیکن تم اس کو جائز نہ رکھو کہ لشکر کی تنخواہ میں سے ایک چیتل بھی کم ہو یا ان پر کسی قسم کا بھی ظلم ہو یا ان کو کوئی بھی تکلیف پہنچے''۔

وہ اپنی مجلس کے حاضرین سے برابر کہتا کہ:

''سلطنت کا نگہبان اور بادشاہ کی مملکت کا مددگار میں ہوں، میرے ہاتھ میں فوج دی گئی ہے، ان کے تمام مشکلات کو حل کرنا میرے سپرد کیا گیا ہے اگر میں ان کے کاموں میں غفلت کروں اور دن رات ان کی فکریں نہ رکھوں تو دنیا میں حرام خوری میری طرف منسوب ہوگی اور عقبیٰ میں شرمسار ہوں گا''۔[۱]

سالانہ معائنہ کے علاوہ جب کسی مہم پر جب فوج بھیجی جاتی تو روانگی سے پہلے معائنہ ہوتا تھا[۲] کوچ کے درمیان بھی فوجوں کا جائزہ لیا جاتا تھا، چنانچہ ملک کافور جب دہلی سے ارنگل کی مہم پر جا رہا تھا، تو شاہی فوج نے کھنڈا کے مقام پر قیام کیا، وہاں چودہ دن میں لشکر کا عرض ہوا[۳] بھی میدان جنگ میں معرکہ آرائی سے پہلے بھی معائنہ کیا جاتا تھا[۴]

---

۱ برنی ص ۱۱۶ ۔ ۲ خزائن الفتوح ص ۱۲۷

۳ ایضاً ص ۸۲ ۔ ۴ عفیف ص ۲۰۱

علاؤ الدین خلجی کے عہد میں فوجی معائنہ میں بڑی سختی کی جاتی تھی، ایک سوار کی غیر حاضری پر اس کی تنخواہ بڑی مدت تک وضع کر لی جاتی تھی، اس کے بارہ میں علاؤالدین کا یہ حکم تھا:

"من درباب سوارے کہ در عرض نرسد سہ سال مواجب استدراک بستانند، حکم کردہ ام (ص ۲۹۵)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین سال کی تنخواہ وضع کر لی جاتی تھی، فرشتہ نے اس کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

"سہ سالہ بمواجب بازیافت می کنم"

لیکن یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے، شاید ایک مہینہ کی تنخواہ تین سال تک کے لئے وضع کر لی جاتی ہو، سواروں کی چالاکی اور فریب سے محفوظ رہنے کے لئے علاؤالدین نے ہر سوار کے گھوڑے پر داغ لگانا بھی شروع کیا[۱] تا کہ عرض کے وقت وہ دوسرا گھوڑا نہ دکھا سکے اور ایک ہی گھوڑے کو مختلف سوار بار بار پیش نہ کر سکیں، داغ کے وقت گھوڑے کی حلیہ کی تفصیل لکھ لی جاتی تھی، اس طرح سوار اور گھوڑے دونوں کے حلیے صاحب دیوان عرض کے یہاں محفوظ رہتے۔ جس رجسٹر میں یہ اندراج ہوتا تھا، اس کا نام ہی اصطلاح میں حلیہ پڑ گیا تھا، حلیہ جتنا مکمل طریقہ پر مرتب کر کے رکھا جاتا، اتنے ہی فوج کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا، برنی کا بیان ہے (ص ۴۳۸)۔

حلیہ سر جملہ استقامت حشم است

حلیہ میں لشکری اور اس کے گھوڑے کی تفصیل نہایت وضاحت سے ہوتی تھی، اس کا نام، باپ کا نام، قومیت، چہرہ کا رنگ، اگر چہرہ پر تل سہ یا داغ ہوتا تو اس کی بھی وضاحت ہوتی، پیشانی، ابرو، آنکھ، ناک، کان، رخسار، مونچھ، داڑھی سب کا حلیہ ہوتا، گھوڑے کے حلیہ میں ان کی

---

[۱] برنی ص ۳۱۵

نسل کے اقسام بھی لکھے جاتے تھے، ایسے ہی ہاتھی کا حلیہ اور ان کی اقسام درج کیے جاتے۔

غیاث الدین تغلق کے زمانے میں بھی علاؤ الدین کی یہ روایت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی اور جو لشکری کاہل ہوتا یا جنگ میں جانے سے گریز کرتا یا لشکر میں حاضری نہ دیتا تو اس کو نہایت سخت سزا دینے کا حکم تھا، لیکن فیروز شاہ تغلق اپنی رحم دلی اور لینت کی وجہ سے معائنہ میں سختی نہ کرتا تھا، اس کے لشکر میں تقریباً اسی ہزار سوار تھے جو بارہوں مہینے تنخواہ پاتے تھے، اس نے داغ کی رسم کو ختم کر دی تھی، اس لئے سوار ادنیٰ درجہ کے گھوڑے دیوان عرض کو دکھا کر تنخواہ پانے کے مستحق ہو جاتے اگر سلطان کے پاس اس کی شکایت پہنچتی تو وہ سن کر خاموش رہتا، بعض اوقات سال ختم ہو جاتا مگر کاہل سوار اپنے گھوڑے معائنہ کے لئے نہ لاتے، اس لئے وہ درج نہ ہوتے، بادشاہ کو خبر ہوتی تو وہ مزید دو مہینے کی مہلت دے دیتا، اس پر بھی کچھ سوار گھوڑے نہ پیش کرتے اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے، فیروز شاہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی اور ان کو برطرف کرنے سے اس لئے گریز کرتا کہ ان کی ملازمت ختم ہو جانے پر ان کی معاشی حالت بری ہو جائے گی اور ان کے گھروں میں ماتم برپا ہو جائے گا، اس لئے وہ حکم دیتا کہ جو سوار حاضر نہیں ہو سکتا ہے وہ اپنے اقطاع کے دیوان عرض کے یہاں اپنے گھوڑے کا معائنہ کرائے یا اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دے اور اگر اس کے پاس گھوڑا نہ ہو تو نیا گھوڑا ہی پیش کر دے، یہ نرمی فوج کے لئے بالکل ہی مناسب نہ تھی، لیکن عفیف کا بیان ہے کہ فیروز شاہ کی اس شفقت و مہربانی کی وجہ سے معائنہ میں خرابی پیدا نہیں ہوئی اور اس کے چہل سالہ دورِ حکومت میں کوئی بھی لشکری ایسا نہ تھا جس کا عرض نہ ہوا ہو۔

"چوں مزاج شہنشاہ بریں بود، مدت چہل سال ہیچ کسے در دیوان عرض نا گذشتہ نماند"۔ (عفیف ۳۰۰-۲۹۸)

جشن عید کے موقع پر شاہی لشکر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ معائنہ کے لئے پیش کیا جاتا اس موقع پر پورا لشکر بادشاہ کو سلامی دیتا، فیروز شاہی عہد میں عید کے موقع پر جس طرح فوج

ل برنی ص ۴۳۸

پیش کی جاتی تھی، اس کا ذکر شمس سراج عفیف نے اس طرح کیا ہے۔

"چاشت کے وقت بادشاہ کی تشریف آوری ہوتی اور وہ محل کوشک میں قیام کرتا، اس کے وقت ملک نائب باربک بھی باہر آتا، سب سے پہلے شمشیر باز سپاہی حاضر ہوتے، اس کے بعد اکیس چتر میمنہ اور میسرہ میں رکھے جاتے تھے جن میں دس چتر بادشاہ کے دائیں اور دس بائیں جانب ہوتے اور ایک خاص بادشاہ کے سر پر ہوتا ان سب کے رنگ میں بڑا تنوع ہوتا تھا، بعض چتر سرخ، بعض سبز، بعض سیاہ، بعض سفید، بعض کنج (؟) بعض تُنج (؟) ہوتا تھا، برسات کے موسم میں سیکھد (مہلیک) رنگ کا چتر بادشاہ کے سر پر سایہ فگن ہوتا، جب چتر اپنی اپنی جگہ پر نصب ہو جاتے تو مکلف اور مکلل نشانات بادشاہ کے سامنے سے گزارتے، نشان پیادہ کو اس دن پیش ہونے کی اجازت نہ تھی اور عکسانی (؟) نشان جو تعداد میں ایک سو ساٹھ یا ایک سو ستر ہوتے تھے، بہت خوبصورت نظر آتے، اس طرح تمام علم بردار اپنے اپنے مراتب کے مطابق محل کے اندر جاتے تھے، اس کے بعد پائیگاہ کے زریں پوش گھوڑے محل میں داخل ہوتے، اس کے بعد طلائی اور نقرائی جھول سے آراستہ ہاتھی تخت کے سامنے زمین بوس ہوتے، سلام کرتے اور دعا دیتے پھر اپنی اپنی جگہ میمنہ و میسرہ میں کھڑے ہو جاتے" [1]

سکندر لودھی نے اپنے دور میں حلیہ رکھنے کا قاعدہ پھر سے جاری کیا اور اس کی اصطلاح چہرہ ہو گئی، اس میں بھی جیسا کہ آگے ذکر آئے گا بڑی تفصیل ہوتی۔

ابراہیم لودھی کے زمانے میں حکومت کی کمزوری سے امراء نے بے جا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا، جب جاگیر کی صورت ان کا ماہانہ مقرر ہوتا تو وہ اپنے ساتھ رکھنے والے لشکریوں اور گھوڑوں کی کثیر تعداد دکھا دیتے اور جب ماہانہ مقرر ہو جاتا تو بیشتر لشکریوں کو علیحدہ کر دیتے اور جن

[1] عفیف ص ۶۳۔۲۶۲ ترجمہ آزاد ہے۔

کو اپنے ساتھ رکھتے بھی ان کو تنخواہ دینا ضروری نہیں سمجھتے، معائنہ کے وقت ادھر اُدھر سے کچھ آدمی اور گھوڑے جمع کر کے پیش کر دیتے۔[1] اس طرح یہ لشکری نہ اچھی تربیت پاتے اور نہ ان میں کوئی تنظیم ہوتی، اسی لئے جب ابراہیم لودھی بابر کے خلاف پانی پت کے میدان میں اترا تو گو بابر کے مقابلہ میں اس کی فوج کی تعداد زیادہ تھی لیکن وہ زیادہ دیر تک جم کر نہ لڑسکی، بابر پانی پت کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ غنیم کا لشکر جتنا سامنے تھا اس کا تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا تھا اور ہزار کے قریب ہاتھیوں کی تعداد بیان کی جاتی تھی، بابر یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندوستان میں یہ طریقہ ہے کہ جس وقت جنگ ہوتی ہے، اس وقت کچھ دن کے لئے فوج بھرتی کر لیتے ہیں، اس کو سر بندی کہتے ہیں، ایسی فوج ظاہر ہے کہ زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتی، بابر کے پاس اس لڑائی میں پندرہ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی، لیکن جتنی تھی وہ تربیت یافتہ تھی، اس لئے جب وہ ابراہیم کی غیر تربیت یافتہ فوج سے لڑی تو ان کے پچاس ساٹھ ہزار سپاہیوں کو آسانی سے مغلوب کر لیا۔[2]

شیر شاہ لودھی سلاطین دہلی کے عہد کی ان بدعنوانیوں سے اچھی طرح واقف تھا، اس لئے وہ اپنی فوج کی تنظیم و ترتیب میں بڑا محتاط رہا، اس نے داغ اور چہرہ کے رواج کو پھر سے جاری کیا گھوڑوں کو اپنے سامنے داغ لگواتا تھا اور اس نشان کے بغیر کسی کو تنخواہ نہ دیتا، سپاہیوں اور گھوڑوں کا چہرہ بھی اپنے سامنے باضابطہ لکھواتا تھا اور اسی حساب سے تنخواہ دیتا تھا، اس کا معمول تھا کہ نماز اشراق کے بعد لشکر کا معائنہ کرتا، امراء اور سپاہیوں سے پوچھتا کہ ان میں کوئی بغیر جاگیر کے تو نہیں ہے؟ اگر ہوتا تو مہم سے پہلے اس کو جاگیر دے دیتا، اگر کوئی سپاہی مہم کے وقت جاگیر کے لئے عرض کرتا تو سزا پاتا، پرانے سپاہیوں کے لشکر کی حاضری اور نئے سپاہیوں کا امتحان خود لیتا، اگر ان سے مطمئن ہو جاتا تو ان کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا۔[3]

بابر و ہمایوں کی زندگی زیادہ تر کیمپ ہی میں گزری، اس لئے وہ اپنی فوجوں کا معائنہ قدیم

---

[1] الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۲

[2] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۹۷

[3] تاریخ شاہی از عباس خان بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۳

روایت کے مطابق کرتے تھے، کبھی مہم سے پہلے، کبھی کوچ کے درمیان، کبھی میدان جنگ میں، ۹۳۲ھ میں جب بابر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور بکرام کے پاس دریائے سیاہ کے پاس پہنچا تو امیروں، بخشیوں اور مصاحبوں کے چھ سات حصے کر کے ان کو نیلاب کے گھاٹ اترنے والے لشکر کا جائزہ لینے اور ان کا شمار کرنے کے لئے مقرر کیا، انھوں نے جائزہ لینے کے بعد بادشاہ کو لشکر کی صحیح تعداد سے مطلع کیا[1] دوسری جگہ بابر لکھتا ہے کہ ''معمول ہے کہ جب فوج تیار ہو کر چلنے لگتی ہے تو کمان یا چابک ہاتھ میں لے کر دستور کے موافق اس کی تخمیہ کیا جاتا ہے اور اسی کے بموجب حکم لگایا جاتا ہے کہ اتنا لشکر ہے۔[2]

جب ہمایوں، شیر شاہ سے جنگ کرنے کو قنوج کی طرف روانہ ہوا تو بھوجپور میں اس کی فوج ٹھہری، اس نے یہاں فوج کا جائزہ لیا، سواروں کی تعداد دو ہزار تھی ان میں سے بعض کے گھوڑے اور اسلحہ خاطر خواہ نہیں تھے، اس لئے ہمایوں نے ان کو گھوڑے اور اسلحہ دینے کا حکم دیا، اعلیٰ عہدیداروں کو خلعت اور دوسرے اعزاز سے سرفراز کیا اور ہونے والی جنگ کے لئے ان میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس قسم کا فوری معائنہ اکبر سے لے کر آخری دور مغلیہ تک برابر ہوتا رہا، اکبری عہد سے عرض کا نظام بہت قریب ہوتا گیا اور داغ کا قانون روز بروز اہم ہوتا گیا، آئین اکبری میں قانون داغ کی تفصیل ایک جگہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ داغ اندازی کے وقت کبھی ''نظر'' اور کبھی ''داغ'' کا لفظ اور کبھی سات کا ہندسہ گھوڑے پر لکھ دیا جاتا، سرکاری گھوڑے کے چہرے کے دائیں جانب داغ لگایا جاتا تھا اور جب وہ شاہی اصطبل میں واپس ہو جاتا تو بائیں جانب داغ دیا جاتا، کبھی کبھی گھوڑے کی قیمت بھی لکھ دی جاتی، عراقی و مجنس گھوڑے کی قیمت داہنے رخسار اور ترکی و تازی گھوڑے کی قیمت بائیں پر درج ہوتی، مثلاً اگر دس مہر کا گھوڑا ہوتا تو دس ہندسہ لکھ دیا جاتا، اگر بیس مہر کا ہوتا تو ۲۰ لکھا جاتا اگر پیشی کے وقت اس کی قیمت میں اضافہ یا کمی ہوتی تو پرانے

---

[1] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۳

[2] تذکرۃ الواقعات

نقش کو مٹا کر جدید قیمت کے لحاظ سے داغ اندازی کی جاتی ہے۔ [1]

لیکن داغ کی نشانات خود اکبر ہی کے دور میں وقتاً فوقتاً بدلتے رہے، ابوالفضل کا بیان ہے کہ ابتدا میں جب داغ لگانے کا رواج ہوا تو گھوڑے کی گردن کے دائیں طرف سین کے دن دانوں کی شکل (۳) کا ایک نقش بنا دیا جاتا تھا، اس کے بعد کچھ عرصہ تک نشان کی شکل دو الف کی ہوتی جو ایک دوسرے نوے زاویہ قائمہ پر قطع کرتے تھے (+) الف کے سرے جلی ہوتے تھے اور یہ نشان گھوڑے کی داہنی ران پر ڈالا جاتا تھا، اس کے بعد کمان کی شکل کا نشان بنایا گیا، جس کا چلہ اترا ہوا ہوتا تھا، لیکن آخر میں ہندسوں سے داغ ڈالنے کا طریقہ جاری کیا گیا، یہ نشانات بھی گھوڑے کی داہنی ران پر لگائے جاتے تھے، پہلی مرتبہ داغ لگانے میں ایک کا ہندسہ گھوڑے کی ران پر بنا دیا جاتا تھا اور دوسری مرتبہ دو کے ہندسے سے داغ دیا جاتا تھا اور اسی طرح جس قدر داغ ڈالے جاتے، اسی اعتبار سے ہندسوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، بعد میں اکبر نے شہزادوں، شاہی خاندان والوں، سپہ سالاروں اور دوسرے درباریوں کے جانوروں کے لیے علیحدہ علیحدہ نشانات مقرر کیے، داغ مکرر کے وقت اگر سوار نیا گھوڑا لاتا تو یہ درخواست کرتا کہ اسے آخری تنخواہ پانے کے بعد سے گھوڑا لانے کے وقت تک کی کل بقایا رقم دی جائے، جس کو بخشی دلواتا تھا۔

دور اکبری میں ہر تیسرے سال نقش پذیری کی تجدید ضروری تھی، اگر کوئی عہدیدار داغ ڈلوانے میں تاخیر کرتا تو اس کی جاگیر کا دسواں حصہ ضبط کر لیا جاتا، بہت سے ایکچی اور ایسے ملازم جن کو اپنی جاگیر کا انتظام کرنے کی مہلت نہ ملتی، وہ سرکاری خزانے سے نقد وصول کر لیتے اور ڈیڑھ برس کے بعد اپنے جانوروں پر داغ ڈلواتے، جو منصب دار دارالخلافت سے دور رہتے ان کے لیے طویل مدت مقرر تھی، لیکن اگر نقش پذیری پر مسلسل چھ سال گزر جاتے تو جاگیر کا دسواں حصہ ضبط کر لیا جاتا، جس امیر کے منصب میں اضافہ ہوتا اور اس کے جانوروں کو نقش پذیری کو تین سال گزر چکے ہوتے تو اس کی ذاتی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جاتا، لیکن اس کے اضافہ شدہ سوار اور سپاہی کی تنخواہیں داغ پذیری کے بعد جاری کی جاتیں، اس داغ پذیری کے بعد ترقی یافتہ امیر کے نئے اور

---

[1] آئین اکبری ص ۹۷

پرانے ملازم اپنی مقررہ رقم وصول کرتے اگر تجدید کے وقت کوئی سوار کسی نقش پذیر گھوڑے کے بدلے دوسرا عمدہ گھوڑا لاتا تو نیا جانور بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا اور شاہی حکم کے مطابق قبول کرلیا جاتا۔[1]

پنج ہزاری امرا اور ان سے اوپر کے منصب داروں کے لیے داغ کے قانون کی پابندی ضروری نہیں تھی، لیکن وہ اپنی فوج کو معائنہ کے لیے ضرور پیش کرتے تھے، جس کے لیے ''محلی'' کی اصطلاح تھی، لیکن عام طور سے داغ کے لیے بھی داغ محلی ہی کی اصطلاح رائج تھی۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور میں لشکریوں میں بڑی بے ایمانی اور خباثت تھی، بعض طمع دار سوار اپنے عمدہ گھوڑے فروخت کرکے یا پیادوں میں شامل ہو جاتے یا عمدہ گھوڑے کے بجائے ادنیٰ درجہ کے گھوڑے خرید کر سواروں میں شامل ہو جاتے اور پوری تنخواہ طلب کرتے اگر تنخواہ نہ ملتی تو بے ہودہ گوئی کرکے تشدد پر آمادہ ہو جاتے، گھوڑوں کو عاریتاً ایک دوسرے کو دینا سواروں کے لیے عام بات تھی اور اس سے فوج میں بڑی بدانتظامی اور بے قاعدگی پیدا ہوگئی تھی، لیکن ابوالفضل کا بیان ہے کہ داغ اندوزی اور چہرہ نویسی سے یہ خرابی جاتی رہی[2] مگر ملا عبدالقادر بدایونی صورت حال کے اس ترقی پر زیادہ مطمئن نہ تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

''شہباز خاں میر بخشی نے داغ و محلی کے رواج کو از سر نو جاری کیا، جس کو سلطان علاؤ الدین خلجی نے جاری کیا تھا اور بعد میں شیر شاہ کی نسبت بھی یہ طے ہوا کہ ہر امیر بیستی کے منصب سے اپنے عہدہ کا آغاز کرے اور اپنے تابعیان کے ساتھ کنگ، جاری اور فجار کے لیے حاضر رہے اور جب ضابطہ کے مطابق وہ اپنے بیس سواروں کو داغ کے لیے حاضر کرے تو یک صدی یا اس سے زیادہ کا منصب دار بنا دیا جائے اور دستور کے مطابق ہاتھی گھوڑے اور اونٹ رکھے، ان کے معائنہ اور استعداد کے شرائط پوری

---

1. آئین اکبری ص ۱۳۵۔۱۳۲
2. آئین اکبری آئین سپاہ آبادی، دفتر دوم

گھوڑے اور اونٹ رکھے، ان کے معائنہ اور استعداد کے شرائط پوری کرنے کے بعد اس کو ہزاری، دو ہزاری بلکہ پنجہزاری منصب دیا جائے اور اگر معائنہ میں پورا نہ اترے تو پھر اس کا درجہ کم کر دیا جائے، لیکن اس نئے ضابطہ سے سپاہیوں کی حالت اور بدتر ہو گئی کیوں کہ امراء سب کچھ اپنی خواہش ہی کے مطابق کرتے تھے، وہ عرض کے وقت اپنے خاص ملازموں اور بارگیروں کو سپاہی کا لباس پہنا کر لے آتے اور اپنے منصب کو بحال رکھتے اور جب ان کو جاگیر مل جاتی تو بارگیر کو علیحدہ کر دیتے اور جب پھر ضرورت ہوتی تو وقتی طور پر بہت سے سپاہی جمع کر لیتے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد ان کو رخصت کر دیتے، اس طرح منصب داروں کے خزانہ اور جمع و خرچ میں کسی قسم کی کمی نہ ہوتی لیکن سپاہی بے چارے پریشانی میں مبتلا اور مستعدی سے کام کرنے کے لائق نہ رہتے، اہل حرفہ میں سے ہندو اور مسلمان جولاہے، نداف، بنجارے، بقال کرایہ پر گھوڑے لے آتے اور ان پر داغ ڈلوا کر منصب پا جاتے یا کروری یا احدی یا داخلی کے زمرہ میں داخل ہو جاتے مگر کچھ دنوں کے بعد ان موہوم گھوڑوں اور ان کے زین کا کہیں پتہ نہ ہوتا اور سوار، پیدل سپاہی بن جاتے، ایسا بھی ہوتا کہ معائنہ کے وقت بادشاہ دیوان خانہ خاص میں اپنے سامنے سپاہیوں کے مع ان کے لباس کے وزن کراتا اور وہ کم و بیش ۲۲/۲ یا ۳ من بھی ہوتے، لیکن یہ سپاہی بھی کرایے کے ہوتے، لباس وغیرہ بھی مانگے کا ہوتا، بادشاہ کو اس کی واقفیت ہوتی تو کہتا کہ میں اس کو جو کچھ دیتا ہوں وہ دیدہ و دانستہ اس کی گذر اوقات کے لیے دیتا ہوں، کچھ دنوں کے بعد احدیوں کو دو اسپہ، یک اسپہ اور نیم اسپہ میں تقسیم کیا گیا، نیم اسپہ میں دو سوار کے درمیان ایک گھوڑا ہوتا اور دونوں برابر تنخواہ پاتے ...... لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بادشاہ اپنے اقبال کی بلندی کے سبب تمام دشمنوں

پر غالب آیا۔ اس کو زیادہ سپاہیوں کی چنداں ضرورت بھی نہ ہوتی تھی،
اور امرا بھی اپنے لشکریوں کی بے جا ناز برداری سے محفوظ رہے"۔ ۱؎

مگر اس میں شک نہیں کہ لشکریوں کی خیانت اور بے ایمانی پر داغ کا قانون ایک بڑا فن تھا، اس لیے آخر آخر دور تک اس کا اہتمام رہا، داغ شدہ گھوڑوں کے سوار لشکر کے بہترین سپاہی سمجھے جاتے، اس سے پہلے ایک مضمون میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک منصب دار اگر ایسے صوبہ میں ہے جو اس کی جاگیر میں نہیں ہے تو وہ اپنے منصب سوار کا ۳/۴ حصہ داغ کے لیے پیش کرتا۔

اورنگ زیب نے داغ کے لیے خاص خاص نشانات مقرر کیے تھے، مثلاً پنجہ، مرغ (یعنی مرغ کے پنجہ کا نشان) میزان (ترازو کا نشان) چہار پرہا، کھڑی اور پڑی لکیریں وغیرہ، جب جنگ جانشینی کے لیے اورنگ زیب کا لڑکا اعظم شاہ دکن سے روانہ ہوا تو اس کے گھوڑوں پر ''اعظم'' منقوش تھا، والا جاہ کے جانوروں پر ''خیل'' اور اعلیٰ تبار کے گھوڑوں پر آٹھ کے داغ تھے، بعض امرا نے اپنے نشانات علیحدہ بنا رکھے تھے، مثلاً تیموری سلطنت کے آخری عہد کے مشہور مشہور امیر سید عبداللہ کے گھوڑے پر عبد کا نشان تھا۔

داغ کی نگرانی اور اس کی تصدیق و تصحیح کرانے والا داروغہ و تصحیحہ کہلاتا تھا، ان کے معروف امیر اور مشرف ہوتے، جو میر بخشی کے ماتحت مقرر ہوتے تھے۔

چہرہ نویسی:

تیموریوں کے دور میں چہرہ نویسی کا مکمل انتظام تھا، لشکریوں اور گھوڑوں کی تفصیل باضابطہ رکھی جاتی تھی، لشکری اگر ملازمت میں داخل ہوتا تو اس کا نام، اس کے باپ کے نام، اس کی سکونت، اس کی قومیت لکھی جاتی، مثلاً اگر مسلمان ہے تو مغل یا پٹھان ہے اگر سید ہے تو حسنی یا حسینی، شیخ ہے تو صدیقی یا فاروقی یا عثمانی، اسی طرح اگر ہندو ہے تو راجپوت، دکنی ہے یا کچھ اور، چہرہ کا رنگ بھی درج ہوتا، مثلاً گندم گوں، سبز، سفید، سرخ، شیر فام اسیگوں وغیرہ قد بھی لکھا جاتا کہ

۱؎ منتخب التواریخ جلد دوم ص ۱۹۱-۱۹۰

بلند ہے، یا میانہ، یا پستہ قد ہے، پیشانی کشادہ ہے یا غیر کشادہ، اگر اس پر تل مسہ یا داغ ہوتا تو اس کی وضاحت بھی ہوتی، آبرو کا حلیہ بھی ہوتا کہ پیوستہ ہیں یا کشادہ آنکھ حلیہ میں آہو چشم، میش چشم، ارزق چشم، گربہ چشم یا کور چشم کی تفصیل ہوتی، اسی طرح داڑھی کا رنگ سیاہ یا سفید، تراشیدہ ہے یا دراز، کھوسہ ہے (جس کے داڑھی مونچھ نہ ہو) یا جھبو گھنی داڑھی ہے، چہرہ کے حلیہ میں داغ چیچک، تل مسہ، زخم شمشیر، برچھی اور تفنگ وغیرہ کی بھی تفصیل ہوتی تھی، گھوڑوں کے چہروں میں اس کی اقسام نسل ترکی، یابو عراق جنس تازی وغیرہ کا حال لکھا تھا، ان کا رنگ مثلاً نیلہ بوز، نیلہ کبود، نیلہ سرخنگ، نیلہ گمسی لاکھوری، کشتی، سرنگ، سرخی، ابلق مشکی، سنجاب، بلور، صندلی وغیرہ کی تفصیل ہوتی، ہاتھی کا حلیہ اور اس کے اقسام کا بھی رجسٹر ہوتا، چہرہ نویسی کا رجسٹر اوراق چہرہ کہلاتا، چہرہ نویسی کی تصدیق ہر تھوڑی مدت کے بعد ہوا کرتی تھی، ابوالفضل کا بیان ہے کہ وہ مہینہ چہرہ نویسی کے لیے احدیوں کا مجمع ہوتا، جس میں ایک سند جس پر دیوان اور بخشی کے دستخط ثبت ہوتے، خزانے کے اہلکار کو دی جاتی اور وہ اس سند کی بنیاد پر جس کو اصطلاح میں تصحیحہ کہتے تھے، ایک رسید لکھتا اور اس پر اپنے دستخط کرتا، اس کے بعد اس رسید پر وزیر کی مہر ثبت کی جاتی اور خزانچی اس رسید کو اپنے پاس رکھ کر رقم ادا کرتا۔

سیاہہ داغ و تصحیحہ اور اوراق چہرہ کے علاوہ سررشتہ فوج کے اور دوسرے کاغذات جو میر بخشی کے معائنہ کے لئے پیش ہوتے، ان میں سے بعض کے نام یہ تھے۔

فہرست برطرفی و بحالی، سیاہ طلب تنخواہ، سیاہہ نگہداشت، اوارجہ مساعدت، اوارجہ کے معنی وہ فہرست جس میں ہر شے کی تفصیل علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے، یہ سیاہہ کی ایک قسم تھی، مساعدت سے مراد قرض اور مالی امداد ہے، تفصیلات حاضر ضامنی، تصحیحہ نامہ، سیاہہ چوکی، سیاہہ حضور، فہرست تعیناتیان وغیرہ، ان کی نوعیت ان کے ناموں سے ظاہر ہوگی۔

اگست ۱۹۵۶ء

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں سواروں کا نظام

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں عام طور سے تین حصے ہوتے تھے (۱) سوار (۲) ہاتھی (۳) پیدل۔ تیموریوں کے زمانے میں بندوقچیوں اور توپچیوں کا اضافہ ہوا۔

سواروں کی اہمیت:

فوج کا بہترین حصہ عموماً سواروں پر مشتمل ہوتا تھا، ازمنہ وسطیٰ کا ایک فوجی اپنی مردانگی اور شجاعت کا مظاہرہ گھوڑے کی پیٹھ ہی پر سے کرتا تھا، ایک سوار جب جنگی لباس میں ملبوس اور تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہو کر آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر نکلتا تو اس کو اپنی اس امتیازی شان میں پندار محسوس ہوتا اور غیر لشکری بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، چنانچہ خصوصی وقار کا اظہار بعض سلاطین کے سکوں میں بھی ہوتا تھا، مثلاً سلطان شمس الدین التتمش کے بعض سکوں میں ایک سوار اپنی پوری جنگی شہامت کے ساتھ نبرد آزما دکھائی دیتا ہے، لشکر کے بڑے بڑے عہدیدار کے لیے ایک اچھا شہسوار ہونا ضروری تھا، اس زمانے میں جنگ کی نوعیت بھی کچھ ایسی تھی کہ روبرو اور بالمقابل لڑائی کے لیے سواری مفید ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ دور دراز مقامات کی تسخیر اور فوج کی نقل و حرکت میں سواروں کے ذریعہ سے جو سہولت میسر ہوتی تھی، وہ لشکر کے کسی حصہ میں نہ ہوتی، اسی لیے لشکر میں سواروں کی تعداد نسبۃً زیادہ رہتی۔

maablib.org

سلاطین دہلی کے سوار:

تیموری عہد کے پہلے کے سواروں کا لباس عموماً زرہ، خود، جوش اور دستوانہ ہوتا تھا اور آلات میں تلوار، سپر، کمان اور تیر ہوتا، کبھی گرز، سنان، نیزہ اور ناچخ لے کر بھی اپنی شجاعت کا جوہر

دکھاتے۔ محمود غزنوی کے زمانہ میں ہر سوار کے پاس دو گھوڑے ہوتے تھے۔[1] شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کے خلاف لاہور پر یلغار کی، تو فرشتہ کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ بیس ہزار اسپہ و سہ اسپہ سوار تھے۔

"سلطان شہاب الدین محمد غوری از راہ دیگر با بیست ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ جریدہ و سبک از غزنین یلغار کردہ بکنار آب لاہور آمدہ"[2]

اس سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ شہاب الدین غوری کے ہر سوار کے پاس دو یا تین گھوڑے ہوتے تھے، لیکن سلاطین دہلی کے زمانے میں سہ اسپہ سواری کی مثال نہیں ملتی ہے۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں بھی دو ہی قسم کے سوار تھے، ایک تو وہ جن کے پاس ایک گھوڑا رہتا تھا، دوسرے وہ جن کے پاس دو گھوڑے ہوتے تھے[3] (برنی ص ۳۰۳) دوسرے گھوڑے کے لیے علحدہ الاؤنس مقرر ہوتا تھا۔

تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف مولانا ضیاء الدین برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی کے زمانے میں عام طور سے ایک خان ایک لاکھ سوار، ایک ملک دس ہزار سوار، ایک سپہ سالار ایک سو سوار اور ایک سرخیل دس سوار رکھتا تھا (۱۴۵)

مغلوں کی متواتر یورشوں کو روکنے کے لیے علاؤالدین خلجی کو ایک لشکر جرار تیار کرنے کی ضرورت ہوئی، تو سواروں کے گھوڑوں کی خریداری کے لیے اس کے پاس شاہی خزانے میں کافی

---

۱ بیہقی جلد اص ۳۱۳ بحوالہ ڈاکٹر محمد ناظم

۲ فرشتہ جلد اول ص ۵۲ نولکشور پریس

۳ ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے اپنی کتاب ایڈمنسٹریشن سلطنت آف دہلی میں لکھا ہے علاؤالدین خلجی کے سواروں کی تین قسمیں تھیں، مرتب، یک اسپہ دو اسپہ مرتب کے پاس کوئی گھوڑا نہ ہوتا، یک اسپہ، یک گھوڑا اور دو اسپہ دو گھوڑے رکھتا مرتب سب میں معزز ہوتا دو اسپہ سے یک اسپہ زیادہ معزز سمجھا جاتا لیکن اس رائے سے راقم کو اتفاق نہیں، برنی کی مبہم عبارت کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔

رقم نہ تھی، اس لیے پہلے تو اس نے ضروری اشیاے زندگی اور اجناس کی قیمتوں میں کمی کر کے اقتصادی خوش حالی کی کوشش کی، پھر گھوڑوں کی قیمت کا نرخ بھی کم کرایا، چنانچہ اول قسم کے گھوڑے کی قیمت ۱۰۰ تنکے سے ۱۲۰ تنک، دوقسم کے ۸۰ سے ۹۰ تنک سوم قسم کے ۶۵ سے ۷۰ تنک اور ٹٹو کی ۱۰ سے ۲۵ تنک رکھی گئی ہے؂۱۔

اس شاہی نرخ کی خلاف ورزی پر قتل اور جلاوطنی کی سزا دی جاتی تھی، علاؤالدین ہر چالیس روز کے بعد یہ تحقیق کیا کرتا تھا کہ شاہی نرخ میں کوئی فرق تو نہیں ہے؂۲۔ سوداگروں کو بازار میں گھوڑے فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی، حکومت ان سے براہ راست خریداری کر لیتی تھی، سو لشکریوں کو گھوڑے کی قیمت شاہی خزانہ سے ادا کی جاتی ہے۔ اس طرح ہر سوار براہ راست بادشاہ کا ملازم تھا، کسی لشکری کا گھوڑا میدان جنگ میں مارا جاتا تو اس کو دوسرا گھوڑا حکومت ہی کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ گھوڑوں اور بازار کی اشیا کی قیمت پر قابو پالینے کے بعد علاؤالدین خلجی کے پاس چار لاکھ پچھتر ہزار سوار کی ایک جرار فوج تیار ہوگئی تھی۔

لیکن علاؤالدین کے ان ضوابط و قوانین کی پابندی اس کے بعد کے دور میں نہیں کی گئی، مختلف سلاطین اپنی سہولتوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے قواعد بناتے اور ان پر عمل کرتے۔ محمد تغلق خان ملک امیر اور اقطاع داروں کو بڑی بڑی جاگیریں دیا کرتا، جو حسب مراتب ضرورت کے وقت سوار مہیا کیا کرتے تھے، بڑی بڑی مہموں میں محمد تغلق خود بھی سوار میں بھرتی کرلیا کرتا تھا، مثلاً خراسان کی مہم میں تین لاکھ ستر ہزار سواروں کی بھرتی دیوان عرض کے ذریعہ سے کرائی اور گھوڑوں کی قیمت اور سواروں کی تنخواہیں شاہی خزانہ سے دیں، یہاں تک کہ شاہی خزانہ بالکل خالی ہوگیا ہے۔ فیروز شاہ کے زمانے میں یا تو اقطاع دار (صوبہ کے حاکم) سوار فراہم کرتے یا دیوان بھرتی کرتے تھے۔ فیروز شاہ باضابطہ فوج (وجہ دار) گھوڑوں کی قیمت شاہی خزانہ سے ادا کرتا تھا، بلکہ اس کے لیے جاگیریں مقرر کر رکھی تھیں، بے ضابطہ فوج (غیر وجہ دار)

---

۱ برنی ص ۳۱۳

۲ برنی ص ۳۱۴ (۳، ۴، ۵، ۶) ایضاً ص ۳۱۳، ۳۲۸، ۴۷۷

گھوڑوں کی قیمت شاہی خزانہ سے ملتی تھی۔[۱] لودھیوں کے زمانے میں جاگیر کا رواج تھا، ہر جاگیردار سوار مہیا کیا کرتا تھا۔[۲] اور وہی ان کو تنخواہ بھی دیا کرتا تھا۔ شیر شاہ نے جاگیرداری بالکل ختم کر دی تھی، وہ خود لشکری بھرتی کر کے ان کو مختلف صوبوں میں تعینات کر دیتا تھا، اس طرح ہر فوجی سوار اپنے کو بادشاہ کا ملازم سمجھتا تھا اور فوجی امراء کو محض سردار، شیر شاہ کے دور میں ایک سپاہی کی تنخواہ میں اس کے گھوڑے کی قیمت اور خوراک بھی شامل ہوتی تھی، اس لیے فوج کے تمام گھوڑے شاہی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔[۳]

گھوڑوں کی فراہمی:

سلاطین دہلی بہتر سے بہتر گھوڑوں کی فراہمی کا پورا اہتمام رکھتے تھے، عربی، ترکی، تاتاری اور روسی گھوڑے لشکریوں کے لیے برابر منگائے جاتے تھے، بلبن کہا کرتا تھا کہ

"آراستگی ملک ہندوستان از پیل و اسپ است" (برنی ص ۵۳)

اس کی پائگاہ ☆ میں یعنی (جہاں گھوڑوں کی نسلیں تیار ہوتی تھیں) ہر قسم کے گھوڑے تھے، وہ سندھ سے بھروچی اور تاتاری گھوڑے منگایا کرتا تھا، پھر سامانہ، بھٹنڈہ، بھٹنیر وغیرہ سے چیدہ چیدہ ہندی گھوڑے منگواتا تھا، اس کا خود بیان ہے کہ ان گھوڑوں کی وجہ سے اس کے لشکریوں کو اچھے اور سستے گھوڑے اتنی فراوانی سے مل جاتے کہ مغلوں کے دیار سے گھوڑے برآمد کرنے کی حاجت باقی نہیں رہ گئی تھی۔[۴] علاؤالدین خلجی کی پائگاہ میں اچھی نسل کے ستر گھوڑے تھے۔[۵] اگر کسی کو اچھی نسل کا گھوڑا دیا جاتا تو یہ بہترین تحفہ سمجھا جاتا، محمد تغلق ہر سال دس ہزار اچھی نسل کے عربی گھوڑے تحفے میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کی سلطنت میں پانچ بڑی بڑی پائگاہیں تھیں، جن میں خاص خاص نسل کے گھوڑے پیدا کیے جاتے تھے۔[۶]

---

۱ عفیف ص ۲۲۱ ۲ الیٹ جلد ۴ ص ۳۱۲ ۳ الیٹ جلد ۴ ص ۴۲۵

۴ برنی ص ۵۲ ۵ ایضاً ص ۲۶۳ ۶ عفیف ص ۳۳۰

☆ صحیح لفظ پائی گاہ ہے

سواروں کی نبرد آزمائی:

"سواروں کی کارکردگی، زیرکی، ہوش مندی، چالاکی، چستی، پھرتی اور نبرد آزمائی ہی پر عموماً لڑائی کی فتح و کامرانی کا دارو مدار ہوتا تھا، راجہ پتھورا کے خلاف ترائین کی لڑائی میں شہاب الدین غوری کو اس لیے فتح حاصل نہ ہو سکی کہ پتھورا کے دو لاکھ سواروں کے مقابلہ میں اس کے سوار موثر نہ ہو سکے، لیکن اسی جنگ میں ایک سوار کی غیر معمولی جرأت اور شجاعت نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا، میدان جنگ میں شہاب الدین اپنے سواروں کے ساتھ ایسی مردانگی کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ دوست و دشمن سب ہی اس کی ثناخوانی کر رہے تھے۔ فرشتہ کا بیان ہے

"سلطان...... شمشیر از نیام کشیدہ با تفاق لشکر قلب بر سپاہ خصم تاختہ آغاز کار زار کردہ."

بر آں تن کہ زد خنجر سخت کوش	در آمد سرش ہاے کوہاں زدوش
بہر سو کہ شمشیر او کار کرد	یکے را دو کردہ دو را چار کرد

چنانچہ دوست و دشمن بر میدان داری و خنجر گزاری او آفرین کردہ مراسم تحسین بجاے آوردند(جلد اول ص ۵۷)

سلطان شہاب الدین کے افغان اور خلجی سردار راجپوتوں کے دباؤ سے منتشر ہو رہے تھے اور سلطان کا پورا لشکر راجپوتوں کی طویل صفوں کی گود میں آ گیا تھا، لیکن اس خطرہ انتشار کا خیال کیے بغیر سلطان دشمنوں کے بیچ میں گھس گیا، پہلے تو تلوار سے لڑا، پھر نیزہ لے کر گوبند رائے (یا کھنڈے رائے) سپہ سالار دہلی کے ہاتھی کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر ہاتھی پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کے دانت ٹوٹ گئے، لیکن گوبند رائے (کھنڈ رائے) نے بھی سنبھل کر ہاتھی کی پیٹھ پر سے سلطان شہاب الدین غوری کے بازو پر تلوار کا ایک کاری زخم لگایا اور قریب تھا کہ سلطان غش کھا کر گھوڑے سے نیچے گر جائے کہ ایک خلجی سوار بڑی برق رفتاری سے سلطان کے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر کود کر بیٹھ گیا اور سلطان کو اپنی گود میں سنبھال کر میدانِ جنگ سے لے اڑا[1] اس کا میدان جنگ چھوڑنا تھا کہ اس کے سپاہیوں نے میدان چھوڑ دیا، لیکن اگر خلجی سوار کی شجاعت کام نہ کرتی اور سلطان

---

[1] طبقاتِ ناصری ص ۱۱۹

معرکۂ کارزار میں شہید ہو جاتا تو ہندوستان میں اس کے جانشینوں کی حکومت سے جو نیا تمدن اور نیا کلچر پیدا ہوا، اس سے محروم رہتا۔ شہاب الدین غوری ایک سال کے بعد اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کر کے پھر پتھورا کے خلاف معرکہ آرا ہوا، اس کی فوج میں ایک لاکھ سے زیادہ سوار تھے، جدھر سے ان کا پرا گزرتا، تیروں، تلواروں اور نیزوں کا بن نظر آنے لگتا تھا۔ پتھورا کے پاس بھی تین لاکھ سوار بے شمار پیادے اور ہاتھی تھے۔ ترائین کے میدان میں شہاب الدین غوری کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ دیکھ کر اس طرح بھڑکتے تھے، جس سے سواروں کو قدم جما کر لڑنے میں بڑی دقت ہوتی، دوسری جنگ سے پہلے سلطان نے گھوڑوں کو اس طرح سدھایا کہ مٹی اور لکڑی کے قوی ہیکل ہاتھی مجسمے بنوائے اور ان کو عماری اور برگستوان کے ساتھ ایک میدان میں لا کھڑا کیا اور پھر سواروں کو ان نقلی اور مصنوعی ہاتھیوں کے آس پاس گھوڑے دوڑانے کو کہا، اس طرح گھوڑے ہاتھیوں کے کچھ ایسے عادی ہو گئے کہ ان سے ان کا خوف جاتا رہا۔

شہاب الدین غوری کے لشکری اس مرتبہ سر بکف ہو کر میدان جنگ میں شریک ہوئے، وہ طے کر کے آئے تھے کہ اپنی جانبازی اور بہادری سے سر دے کر جاں بحق ہو جائیں گے، لیکن پیٹھ نہ دکھائیں گے، اس لیے حریف کی کثرت تعداد سے بالکل خوف زدہ نہ تھے، جنگ کے آغاز سے پہلے سلطان نے اپنے سواروں کو چار حصوں (میمنہ، میسرہ، خلف و قدام) میں تقسیم کر دیا، یہ سوار مسلح ہو کر جس طرح صف آرا ہوئے اس کی تصویر عصامی نے اس طرح کھینچی ہے۔

شنیدم دریں بار با شہر یار | رسیدہ سوارے صدوسی ہزار
ہمہ زیر پولاد و آہن نہاں | ہیونان شان غرق برگستواں
چو از دوسو لشکر آراستہ | زجولان شان گرد بر خاستہ

سلطان نے ان سواروں کو حکم دیا کہ جب لڑائی شروع ہو تو آگے نکل نکل کر غنیم کے جنگی ہاتھیوں اور سواروں پر حملہ کریں اور جب وہ بڑھیں تو یہ پیچھے ہٹ کر ہر طرف منتشر ہو جائیں اور اپنے تیروں اور تلواروں اور نیزوں کی کاری ضربوں سے دشمنوں کا صفایا کریں، چنانچہ یہی ہوا سلطان کے جانباز اور تربیت یافتہ سوار اپنے صبا رفتار اور تند گھوڑوں پر آگے بڑھتے، ہٹ کر پلٹ

۱؎ فتوح السلاطین ص ۷۵-۷۴ مدراس ایڈیشن

پلٹ کر غنیم کے بازوؤں کی صفیں الٹ دیتے تھے۔ پتھورا کے عظیم الجثہ جنگی ہاتھی چنگھاڑیں مار مار کر ادھر ادھر منتشر ہونے لگے، ان کی جھولوں میں جو آئینے لگے ہوئے تھے وہ سورج کی کرنوں سے چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے، لیکن سلطان کے سوار مطلق خوف زدہ نہ ہوتے، ہاتھی ان کی طرف بڑھتا تو وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کر دور نکل جاتے اور پھر پلٹ کر تیروں کی بوچھار سے ہاتھیوں کے جسم کو خار پشت بنا دیتے اور جب ان میں کافی انتشار پیدا ہوگیا تو سلطان نے بھی میان سے تلوار کھینچ لی اور جب وہ آگے بڑھا تو اس کے ساتھ بارہ ہزار جرار سواروں کی بھی تلواریں فضا میں چمکنے لگیں، پھر ان ہی سواروں نے اپنے نیزے گھوڑوں کے کان پر سیدھے رکھ لیے اور گھوڑے اڑا کر غنیم پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کا دل بادل پراگندہ ہونے لگا، وہ تاب نہ لا سکے اور منہ موڑ کر پیٹھ پھیر دی۔[1]

بعض بہادر سوار :

سلطان شہاب الدین کے ماتحت سرداروں نے بھی سواروں کی حربی قیادت میں عجیب وغریب مثالیں پیش کیں، جب سلطان نے کھکھروں کے خلاف فوج کشی کی تو ایلتتمش بھی بداؤں سے ایک بڑی فوج لے کر اس کی مدد کے لیے پہنچا، کھکھروں کی فوج دریائے جہلم کے اس پار تھی، سلطان کے لشکریوں کا کوئی قابو غنیم پر چل نہ رہا تھا، ایلتتمش نے اس موقع پر اپنی ہنر آزمائی کا جوہر دکھایا، اس نے برگستوان پہنے اپنے گھوڑے کو مردانہ وار دریا میں ڈال دیا۔۔۔۔۔۔ اس کے پیچھے اس کے ماتحت سوار بھی گھوڑوں پر پانی میں کود پڑے اور دریا پار کر کے ہزاروں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، غوری ایلتتمش کی اس جرأت اور جلادت کا نظارہ کر کے بے حد متاثر ہوا اور لڑائی کے بعد پیشن گوئی کی کہ اس سردار سے بڑے بڑے کام انجام پائیں گے اور یہ صحیح ثابت ہوئی۔[2]

سلطان کے ایک اور مشہور سردار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی اور اس کے سواروں کے

ا۔ طبقاتِ ناصری ص ۱۲۰ فرشتہ جلد اول ص ۵۸ فتوح السلاطین مدراس ایڈیشن ص ۷۷-۷۸

۲۔ طبقاتِ ناصری ۱۶۶-۱۷۰

کارنامے بھی حیرت انگیز ہیں۔ محمد بختیار خلجی کو جب اودھ کا حاکم ملک حسام الدین کی سرکار کی طرف سے اس کی جنگی خدمات کے صلے میں مرزا پور اور بنارس کے پاس پرگنہ بھگوت اور بھیولی جاگیر عطا ہوئی تو اس نے اور سواروں کے ساتھ منیر اور بہار کے قریبی اضلاع کو اپنی جولانگاہ بنالیا اور صرف دو سو سواروں کی جلادت اور شجاعت کی بدولت بہار کو فتح کر لیا، جو فتح و تسخیر کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ محمد بن بختیار خلجی بہار میں اپنی قوت مستحکم کر کے مشرقی بنگالہ کی طرف بڑھا، اس کے ساتھ سواروں کا ایک چھوٹا سا رسالہ تھا، اس کو مشرقی بنگالہ کے دارالسلطنت ندیا پہنچنے کے لیے جھارکنڈ (چھوٹا ناگپور) کے جنگلی علاقوں کے دشوار گذار راستوں سے گذرنا پڑا اور جب وہ دو منزل سہ منزل کوچ کر کے ندیا پہنچا تو اس کے ساتھ کل اٹھارہ سوار تھے اور بقیہ پیچھے چھوٹ گئے تھے، مگر یہ اولوالعزم اور نڈر سردار اپنے سواروں کی تعداد کی کمی کا خیال کیے بغیر راجہ کے قلعہ کے دروازہ پر پہنچ گیا اور اپنے سواروں کو تلواریں کھینچ لینے کا حکم دیا اور وہ ایسا بد حواس ہوا کہ ننگے پاؤں محل کے چور دروازے سے نکل بھاگا اور اس طرح بنگالہ پر اٹھارہ سواروں کی بدولت خلجی کی حکومت کا پرچم لہرا گیا۔ محمد بن بختیار نے اپنا پایہ تخت لکھنوتی (گور) میں قائم کیا اور تمام جنگی محاذوں کی ناکہ بندی کر کے لکھنوتی سے دس ہزار سواروں کا ایک لشکر لے کر تبت و ترکستان کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا، اس مہم کے راستے بہت ہی دشوار گذار اور صبر آزما تھے، لیکن اس منچلے فوجی سردار کو اپنی جانبازی اور قوت جسمانی پر غیر معمولی بھروسہ تھا، وہ بڑھتا چلا گیا، پہاڑی قبیلوں کوچ و میچ کے علاقہ میں پہنچا تو مؤخر الذکر قبیلہ کے سردار نے اسلام کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر محمد بن بختیار خلجی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا، جس کا نام علی میچ رکھا گیا۔ محمد بن بختیار بڑھتا ہوا کا مرود (کاروپ) پہنچا اور ایک دریا (بنگ متی) پار کر کے پہاڑی دروں سے گذرتا ہوا سولہ روز کی منزل طے کر کے تبت کے علاقہ میں گھسا اور سرحدی علاقہ کے باشندوں کو مغلوب کیا، اس سے آگے بڑھنے میں اس کے ہواخواہوں نے اس کو روکا، حالاں کہ وہ کرم پٹن جیسے مشہور شہر سے قریب ہو گیا تھا، جہاں پندرہ سو گھوڑے روزانہ بازار میں فروخت ہوتے تھے لیکن محمد بن بختیار کے سوار بہت تھک چکے تھے اور ان کی رائے یہ ہوئی کہ آئندہ سال کے لیے یہ مہم اٹھا رکھی جائے، چناں چہ وہ تبت کو تسخیر کیے بغیر واپس ہو گئے لیکن اسی اثنا میں دشمنوں نے واپسی کے راستوں میں آگ لگا کر

سارے علاقہ کو بے آب وگیاہ بنادیا تھا، پندرہ روز تک ان لشکریوں کو نہ کھانے کی کوئی چیز ملی اور نہ گھوڑے کو ایک پرکاہ، فاقہ سے پریشان ہو کر انھوں نے گھوڑوں کے ذبح کر کے کھانا شروع کیا اور جب وہ دریا کے پاس پہنچے تو پل بھی مسمار کردیا گیا، لشکریوں کو کشتیاں نہ ملیں، تو انھوں نے دلیرانہ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے، محمد بن بختیار خلجی تو موجوں کو چیرتا پھاڑتا ساحل پر پہنچ گیا لیکن اس کے زیادہ تر ہم راہی سوار دریا کی طغیانی اور روانی کو مغلوب نہ کرسکے۔ [1]

سواروں کے خورد و نوش کے سامان:

سوار کوچ کرتے وقت اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان ضرور رکھتے لیکن اس کی مقدار بہت ہی کم ہوتی، کیوں کہ کیمپ کے بازاروں میں ان کو ساری چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں، لیکن پھر بھی روٹی گوشت اور گھوڑے کے لیے گھاس اور جو ساتھ رکھ لیتے، ان کے پاس زین کی مرمت کے لیے چھوٹے موٹے اوزار بھی ہوتے، ضرورت کے وقت وہ اپنے گھوڑوں کو آختہ بھی کرلیتے، گھوڑے زیادہ سرکش ہوجاتے تو ان کے جسم سے خون بہا کر ان کو رام کرلیتے، اس ترکیب سے بھی ان کو آگاہی رہتی ہے چنگیز خانی سوار بڑی بڑی تعداد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر یورش کرتے بھی چھ چھ لاکھ سواروں کا کول بادل ہوتا، کوچ کے وقت ان کے دس دس سواروں کی ٹولیاں بنادی جاتیں اور ہر ٹولی کے پاس کھانا پکانے کے لیے ایک دیگچہ اور پانی پینے کے لیے ایک مشک ہوتی، وہ گھوڑے کے گوشت یا گھوڑی کے دودھ سے پیٹ بھر لیتے۔

تاتاری سواروں کی بے بسی:

یہ عجیب بات ہے کہ چنگیز خانی سواروں نے تاشقند، بخند، بلخ، استرآباد، آذربیجان، مرو، خراسان، ہرات اور بدخشاں وغیرہ کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بالکل پامال کردیا تھا، لیکن یہ ٹڈی دل ہندوستان جب جب آیا تو یہاں خوں ریزی اور غارت گری کی ہولناکیاں تو ضرور برپا کیں مگر ہندوستان کے جانباز سواروں نے ان سے ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا، وہ ان سے لڑ کر شکست

---

1. طبقات ناصری ص ۱۸۵-۱۳۱

2. آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء

کٹ کر میدان جنگ میں گرتے رہے، لیکن ان کا قدم ہندوستان میں جمنے نہ دیا، ان مغلوں کی یورش کی روک تھام کے لیے غیاث الدین بلبن نے سواروں کا ایک ایسا جرار لشکر مرتب کیا تھا کہ ان کی مستعدی اور قواعد دانی دور دور کے ملکوں میں مشہور ہوگئی تھی، امن کے زمانے میں بلبن سواروں اور گھوڑوں کو شکار کے بہانے سے شکارگاہ لے جاتا اور ان کو دوڑا دوڑا کر پسینہ سے شل کر دیتا، محض اس لیے کہ امن کے زمانے میں کاہل نہ ہو جائیں اور لڑائی کے موقع پر بزدل نہ ثابت ہوں۔ (برنی ص ۵۵)

مغل سوار نہایت جری اور خونخوار ہوتے ان کی قزاقی اور غارت گری سے دنیا کانپ اٹھی تھی، لیکن کسی قوم نے اگر شجاعت اور جاں بازی سے ان کا دلیرانہ مقابلہ کیا ہے تو وہ ہندوستان کے ترک سوار تھے، جنھوں نے اپنی پیہم ناکامیوں کے باوجود مغلوں کے دلوں پر اپنی پامردی، نبرد آزمائی، سرفروشی اور شمشیرزنی کا سکہ بٹھا دیا تھا، تاتاریوں کی پامالی سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کی خاطر بلبن نے ملتان کو ایک دفاعی مرکز بنایا تو اس کا اقطاع دار اپنے چہیتے شہزادہ محمد سلطان کو مقرر کیا، جس کی حکومت میں ساحل بحر سے دریائے جہلم تک کے علاقے تھے اور مستقر ملتان تھا، یہاں بارہ تیرہ سال تک رہ کر شہزادہ محمد سلطان نے چنگیز خانیوں کا مقابلہ جس مردانگی سے کیا ہے وہ اس کا ایک زریں کارنامہ ہے، اس مدت میں تاتاری سواروں کی بڑی سی بڑی جماعت کو بھی شمالی چناب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ کھلے میدان میں جب بھی لڑے، شکست کھائی، شہزادہ محمد سلطان بڑا ہی علم دوست، علم نواز اور ہنر پرور بھی تھا، اس کا وقت زیادہ تر شعراء، علماء اور صلحا کی مجلسوں میں گذرتا لیکن جب کبھی مغل حملہ آوروں کی خبر ملتی تو علمی و ادبی مجلسیں چھوڑ کر سپاہی بن جاتا اور خود بڑے سے بڑے مخدوش اور خطرناک جنگی مقام پر پہنچ جاتا، اس طرح اس نے تاتاریوں کے دو خوفناک حملوں کو بڑی دلیری سے روکا، اسمر خاں کی رہبری میں تیسرا حملہ اس جب ۶۸۳ھ میں ہوا تو شہزادہ نے لاہور کے پاس دریا کے کنارے اس کی بھی اچھی طرح سرکوبی کی اور اس کو مار بھگایا اور جب اس کی فوج مفرورین کے تعاقب میں آگے بڑھ گئی تو وہ ایک جگہ ظہر کی نماز پڑھنے لگا کہ یکایک دو ہزار مغل کمین گاہ سے نکل کر شہزادہ پر حملہ آور ہوئے، شہزادہ نے نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور اس پر سوار ہو کر بڑی دلیری اور جانبازی سے

مغلوں کا مقابلہ کیا، گو اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور وہ مقابلہ کرنے کے بجائے بچ کر آسانی سے نکل سکتا تھا، لیکن اپنی شجاعت کے جوش میں پیچھے ہٹنا اور گھوڑے کا منہ موڑنا بزدلی سمجھا اس کی پامردی سے مغلوں کے پاؤں اکھڑنے کے قریب ہی تھے کہ اچانک اس کو ایک تیر ایسا آکر لگا کہ اس کے زخم سے جانبر نہ ہوسکا، اس معرکہ کے آغاز میں شہزادہ محمد کے سوار جس طرح صف آرا ہوئے اس کے چشم دید حالات امیر خسرو نے وسط الحیوٰۃ میں اس طرح منظوم کیے ہیں۔

جنگ شہ دیدی و ہر گردون غبار انگیختن	باد پا ہر کا فران خاکسار انگیختن
غلغلہ در انجم از جوش سپاہ انداختن	زلزلہ در عالم از شیر سوار انگیختن
از خروش کوس دبانگ اسپ و آواز سوار	لرزہ در صحرا و دشت و کوہسار انگیختن
انچہ بعیت بود وقت کار زار آراستن	وانچہ وحشت بودگاہ گیرو دار انگیختن
نعل در آتش نہادن توستان گرم را	وز سم ہر آتشین لعلے غبار انگیختن
از فروغ تیغ ور سرتف و تاب انداختن	ور خیال نیزہ در دل خار خار انگیختن
برولان ور حملہ از بہر مخالف سوختن	بیدلال در حیلہ از بہر فرار انگیختن ۔ لے

بلبن کے تربیت یافتہ سواروں نے اندرون ملک میں بھی اپنی شجاعت کا ڈنکا بجا رکھا تھا، بلبن کہا کرتا کہ اس کے چھ سات ہزار سوار ہندوؤں کے ایک لاکھ پایک اور دھانک کو تاراج کرنے کے لیے کافی ہیں ۲ے

میدان جنگ میں ہاتھی اور گھوڑوں کی یورش:

میدان جنگ میں ہاتھی گھوڑوں کو دیکھ کر بھڑکتے اور گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکتے، لیکن فنون حرب کے مسلمان ماہرین نے ہندوستان میں آکر ان دونوں جانوروں کو لڑائی کے میدان میں اس طرح سدھایا کہ دونوں مل کر غنیم کی صفوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کو درہم برہم کر دیتے، ۶۹۷ھ میں تاتاریوں نے قتلغ خواجہ کی سرکردگی میں بڑے وسیع پیمانے پر دہلی پر حملہ کیا اس کے ساتھ دو لاکھ سوار تھے اور ایسی دلیری سے دہلی آپہنچا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان اس تاتاری سیلاب میں بالکل بہ جائے گا، علاؤ الدین خلجی نے بھی ایک لشکر جرار ان کے مقابلہ کے لیے

لے وسط الحیوٰۃ ص ۱۶۳۔۱۶۲ علی گڑھ ایڈیشن

۲ے برنی ص ۵۲

بھیجا، اس میں قوی ہیکل ہاتھیوں کے علاوہ تین لاکھ صرف سوار تھے، اس کی کمان ظفر خاں، الغ خان، ورکن خاں، غازی ملک جیسے ہوش مند اور بہادر فوجی لیڈروں کے ہاتھوں میں تھی، فریقین کی فوج پانچ لاکھ سے زیادہ تھی، دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کیلی کے میدان میں ہوئی، جب لڑائی کا آغاز ہوا تو ظفر خان جو اپنی شجاعت کی وجہ سے رستم وقت کہلاتا تھا، جنگی ہاتھیوں کو لے کر آگے بڑھا، جن کے خوفناک حملوں کے ساتھ سوار بھی گھوڑے اڑا کر دشمن پر جا پڑے، مغل حملہ آور ہاتھیوں کی بلائے سیاہ سے بالکل ہی ناواقف تھے، وہ اپنی خونخواری اور گریز پائی کے باوجود ہاتھیوں کا مقابلہ نہ کر سکے، اس سے ان کی صفوں میں انتشار پھیلا تو شاہی سوار خونخوار مغلوں کو دھکیل کر تہ تیغ کرنے لگے اور جب ان کے کشتوں کو پشتہ لگ گیا تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، ظفر خان اپنے جوش تہور میں ان کو مارتا کاٹتا اٹھارہ کوس تک پیچھے ہٹاتے گیا لیکن ایک جگہ غنیم کے نرغے میں گھر کر گھوڑے سے گر پڑا، پھر بھی پیادہ لڑ کر بے شمار مغلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن بالآخر شہید ہوا، ظفر خان کی اس شجاعت وجلادت کی دھاک مغلوں پر ایسی جمی کہ اگر کسی مغل لشکری کا گھوڑا پانی نہ پیتا تو وہ گھوڑے سے کہتا کہ کیا تو نے ظفر خان کو دیکھ لیا ہے۔[۱]

علاؤالدین خلجی کے گھوڑے اور سوار:

امیر خسرو علاؤالدین خلجی کے فوجی گھوڑوں کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ وہ آہو کی طرح چوکڑی بھرتے تھے[۲] وہ جب کوچ کرتے تو ان کے سم سے کاسۂ سنگ لوٹتا رہتا اور زہرہ زمین میں شگاف ہوتا رہتا[۳] وہ بڑے بڑے دریا کودتے پھاندتے نکل جاتے[۴] اور دشوار گذار ساحلی علاقوں پر بطوں کی طرح گذرتے ہوئے نظر آتے،[۵] بعض گھوڑے ایسے تیز اور سبک رفتار ہوتے جیسے ہوا پانی کی سطح پر چلتی ہو اور بعض پہاڑی گھوڑے پہاڑی علاقے پر اس طرح دوڑتے کہ پہاڑ تیغ ہندی کی طرح چمکنے لگتے[۶] یہ بجلی کی طرح برق رفتار اور ہوا کی طرح گریز پا ہوتے اور ابرمن کی طرح اپنا سایہ پیچھے چھوڑ دیتے،[۷] ان گھوڑوں پر سوار کوچ کرتے دکھائی دیتے تو معلوم

---

[۱] برنی ص ۲۶۱ فتوح السلاطین ص ۲۶۳ـ۲۶۲ [۲] خزائن الفتوح علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۶ [۳]،[۴] [۵] ایضاً ص ۸۵،۸۴،۸۲ [۶] خزائن الفتوح علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۰۹، [۷] ایضاً ص ۱۷۷

ہوتا کہ آسمان سے بجلی برس پڑے ہیں، یا جیسے سہراب اور پیون ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہیں یا لاکھوں رستم تیر و کمان کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، یہ سوار گرگین کی طرح اور تیری صولت کے ساتھ شیروں کو زیر کر سکتے تھے۔[۱]

سواروں کی بزدلی پر سزا:

شاہی لشکر کے سوار میدان جنگ میں پیٹھ دکھانا اپنی سپاہیانہ غیرت وحمیت کے خلاف سمجھتے تھے، وہ لڑ کر کٹ مرتے تھے، لیکن لڑائی کے میدان کو چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے، ترائین کی پہلی جنگ میں شہاب الدین غوری کے سواروں نے پیٹھ ضرور دکھائی لیکن اس نے ان سواروں کے سرداروں کو ان کی کم ہمتی اور بے دلی کی بڑی عبرت ناک سزا دی غور پہنچ کر توبروں میں کچے جو بھروا کر ان کی گردنوں میں لٹکا دیے اور ان کو ایسی ہیئت کذائی سے شہر کے گرد گھمایا، اس کا حکم تھا کہ جو امیر اپنے توبرے کے کچے جو نہ کھائے اس کا سر قلم کر دیا جائے، خود اس کو پانی ہزیمت کا اتنا غم تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے اختلاط چھوڑ دیا اور بدن سے کپڑے اس وقت تک نہ اتار دیے جب تک کہ اس نے انتقام نہ لے لیا۔[۲]

تیموری دور کے سوار:

تیموریوں کے زمانے میں گھوڑوں اور سواروں کی اہمیت بدستور سابق قائم رہی، اکبر گھوڑوں کو "اساسِ دولت خانہ سلطنت کہا کرتا تھا"[۳] اس دور میں توپ وتفنگ کا اضافہ ضرور ہو گیا، لیکن توپ وتفنگ کی لڑائی مردانگی اور شجاعت کی جنگ نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لیے مردانہ اور دلیرانہ جنگ کے لیے سواری موزوں سمجھے جاتے، ان کی بہتر سے بہتر تنظیم کے لیے شاہی خزانے کے روپے زیادہ سے زیادہ خرچ کیے جاتے۔

منصب داری نظام:

اکبری دور کے شروع میں امرا جو منصب ذات رکھتے تھے اور اس کے لیے ان کو جو ماہانہ

۱۔ خزائن الفتوح علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۲۸ ۲۔ فرشتہ جلد اول ص ۵۷

۳۔ اکبرنامہ جلد سوم ص ۱۷۳

ملتا، اس میں ان کو گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی۔ آئینِ اکبری میں جو پوری فہرست دی ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر منصب دار کو کتنی تعداد میں گھوڑے اور دوسرے جانور رکھنے پڑتے تھے، مثلاً دہ ہزاری منصب دار کو ۶۸ عراقی، ۶۸۰ مجنس، ۱۳۶۰ ایابو، ۱۳۶ تازی اور ۱۳۶ جنگلہ یعنی کل ۸۸۰ گھوڑے رکھنے کا حکم تھا، اسی طرح یک صدی منصب دار ۲ عراقی، ۴ مجنس، ۲ ترکی، ۲ ایابو اور ۲ تازی یعنی کل دس گھوڑے رکھتا تھا۔

اس مقررہ تعداد کے علاوہ اکبر اپنے گھوڑے اور ہاتھی بھی ان منصب داروں کو حسبِ منصب رکھوالی کے لیے بھیج دیا کرتا تھا، ان کا خرچ شاہی خزانہ سے ادا ہوتا تھا۔ (آئینِ اکبری ا۔۱۳۵)

اکبر نے اپنے آخری دور میں منصب داروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور منصب کے ساتھ سوار کے منصب کا اضافہ کیا، مثلاً پنج ہزاری، پنج ہزار سوار، پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ اگر سواروں کی تعداد منصب کے اعداد کے برابر ہوتی تو یہ اول درجہ کا منصب شمار ہوتا اور اگر تعداد منصب کے اعداد سے نصف یا نصف سے زیادہ ہوتی، مثلاً پنج ہزاری چار ہزار سوار یا پنج ہزاری سہ ہزار سوار تو یہ دوسرے درجہ کا منصب ہوتا اور نصف سے کم ہوتا تو تیسرے درجہ کا منصب ہوتا، منصب داروں کو منصب سوار کے لحاظ سے سواروں کی تعداد رکھنی پڑتی تھی، اکبر نے پورا اہتمام رکھا کہ منصب ذات کے ساتھ منصب سوار میں تطابق ہو۔

ایک سوار کئی گھوڑے رکھ سکتا تھا، کیونکہ ایک گھوڑے کا سوار لنگڑا کہلاتا تھا، لیکن اکبر نے بعد میں حکم دیا کہ کوئی سوار تین گھوڑوں سے زیادہ نہ رکھے، ان گھوڑوں کے لیے الاؤنس شاہی حکومت کی طرف سے مقرر تھا، اکبری دور میں ہر دہ باشی امیر کے رسالے میں دو چہار اسپہ، تین سہ اسپہ، تین دو اسپہ اور دو یک اسپہ سوار رہتے تھے، یعنی دس سوار ۲۵ گھوڑے رکھ سکتے تھے، دوسرے منصب دار بھی اسی تناسب سے سواروں اور گھوڑوں کے سردار مقرر ہوتے تھے[۱] جہانگیری اور

۱؎ آئینِ اکبری ص ۱۳۲

جہانگیر نے منصب کا اعزاز بڑھانے کے لیے سوار کے منصب کے ساتھ دو اسپہ اور سہ اسپہ کی اصطلاح کا بھی اضافہ کیا، مثلاً ہفت ہزار ہفت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ[1] اس سے بظاہر تو یہ مراد ہے کہ ایک ہفت ہزاری منصب دار سات ہزار دو اسپہ رکھ سکتا تھا، دو اسپہ سوار کو گھوڑے رکھنے کی اجازت تھی، تا کہ اس کا ایک گھوڑا لڑائی میں زخمی ہو جائے تو دوسرا گھوڑا استعمال کر سکے، اس طرح سہ اسپہ کو گھوڑے رکھنے کی

"خان خانان را به منصب ہفت ہزار بذات وسوار از قرار دو اسپه و سه اسپه سرفراز نمود."

اجازت تھی، لیکن سواروں اور گھوڑوں کی تعداد فراہم کرنا لڑائی یا معائنہ کے موقع پر ضروری سمجھا جاتا تھا، ورنہ یہ تعداد مناصب کے محض امتیاز و اعزاز اور تنخواہوں کا گریڈ قائم کرنے کے لیے مقرر کی جاتی، دور دراز علاقوں کے منصب داروں یا دور دراز مہموں پر جانے والے فوجی سرداروں کو دو اسپہ اور سہ اسپہ سواروں کے مناصب عموماً زیادہ دیے جاتے، تا کہ ان کے پاس گھوڑوں کی کمی نہ ہونے پائے، مگر چونکہ ماہانہ شاہی حکومت کی طرف سے ملتا تھا اس لیے بعض اوقات دو اسپہ سہ اسپہ سوار کی تعداد مقرر کر دی جاتی، جو منصب سوار سے مختلف ہو جاتی، شاہجہانی عہد کے دو اسپہ اور سہ اسپہ سواروں کے منصب داروں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی، تو شاہجہاں نے ایسے منصب داروں کے لیے دو اسپہ سہ اسپہ کی تعداد بھی مقرر کرنے کا اہتمام رکھا، مثلاً دارا شکوہ کو بیست ہزاری بیست ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا، تو اس میں دس ہزار سوار دو اسپہ اور سہ اسپہ کی تعین کر دی گئی اور پھر جب دارا شکوہ کو شصت ہزاری چہل ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا تو اس میں اس کو تیس ہزار دو اسپہ سہ اسپہ سوار رکھنے کی اجازت تھی، اسی طرح اور منصب داروں کے ساتھ تعداد متعین کر دی جاتی کہ کتنے گھوڑے اور سوار رکھنے لازمی، کتنے رعایۃً معاف اور کتنے فرضی ہیں۔

بادشاہ نامہ مؤلفہ عبد الحمید لاہوری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلخ و بدخشاں کی مہم کے وقت پنج ہزاری پنج ہزار منصب دار نے داغ کے وقت اپنے منصب کا ۱/۵ حصہ یعنی ایک ہزار سوار

[1] تزک جہانگیری جشن بست و یکمین نوروز کے موقع پر ہے

پیش کیے، اگر یہ منصب دار اپنے سواروں کے لیے بارہ مہینے کی تنخواہ دینے کے لیے جاگیر رکھتے تو ایک ہزار سوار میں تین سو سوار سہ اسپہ (یعنی ۹۰۰ گھوڑے) ہوتے ۶۰۰ دو اسپہ (۱۲۰۰ گھوڑے) اور ایک سو اسپہ (یعنی ۱۰۰ گھوڑے) ہوتے یعنی ایک ہزار سوار ۲۲۰۰ گھوڑے رکھتے اور اگر یہ منصب دار گیارہ مہینے کی تنخواہ کی جاگیر رکھتے تو ایک ہزار سوار میں ۲۵۰ سہ اسپہ ۵۰۰ دو اسپہ اور ۲۵۰ ایک اسپہ سوار ہوتے، یعنی ان کے پاس دو ہزار گھوڑے ہوتے اسی طرح دس مہینے کی تنخواہ پانے والے منصب دار کو ایک ہزار سوار میں ۸۰۰ دو اسپہ اور ۲۰۰ ایک اسپہ سوار ہوتے اور ان کے پاس ۱۸۰۰ گھوڑے ہوتے، نو مہینے تنخواہ پانے والے منصب دار کو ایک ہزار سوار میں ۶۰۰ دو اسپہ اور ۴۰۰ ایک اسپہ رکھنا ہوتا اور ان کے پاس ۱۶۰۰ گھوڑے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

لیکن پنج ہزاری پنج ہزار سوار منصب دار کے ساتھ دو اسپہ سہ اسپہ کا بھی منصب رہتا تو ایسی صورت میں اس کو سہ اسپہ دو اسپہ سوار کی تعداد داغ کے وقت دوگنی دکھانی پڑتی، کیونکہ بادشاہ نامہ (جلد دوم ص ۵۰۷) کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دوگنی تنخواہ دی جاتی، اس لیے وہ دو گنے سوار اور دو گنے گھوڑے رکھتے، اس طرح پنج ہزاری پنج ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ منصب دار کو دو ہزار سوار میں ۶۰۰ سہ اسپہ (یعنی ۱۸۰۰ گھوڑے) ۱۲۰۰ دو اسپہ (یعنی ۲۴۰۰ گھوڑے) اور ۲۰۰ یک اسپہ (یعنی ۲۰۰ گھوڑے) دکھانے پڑتے، اس طرح دو ہزار سوار ۴۴۰۰ گھوڑے رکھتا۔

یہ تو بلخ و بدخشاں کی مہم کے وقت کیا گیا، لیکن شاہجہاں نے یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ ایک منصب دار اگر اسی صوبہ میں ہے تو اپنے منصب سوار کی مقرر تعداد کی ۱/۳ حصہ داغ کرنے کے لیے حاضر کرے اور اگر ایسے صوبہ میں ہے جو اس کی جاگیر میں نہ ہوتا تو وہ اپنے منصب سوار کا ۱/۴ حصہ داغ کے لیے پیش کرے، اس طرح بارہ مہینے کی تنخواہ پانے والا ایک ہزاری سوار ۱/۴ حصہ پیش کرتے وقت ۲۵۰ سوار حاضر کرتا، جن میں مندرجۂ بالا حساب سے ۷۵ سہ اسپہ ۱۵۰ دو اسپہ اور ۲۵ یک اسپہ سوار ہوتے، یعنی ان کے پاس ۵۵۰ گھوڑے ہوتے اور اگر منصب دار یک ہزاری ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ ہوتا تو اس کو اپنے سواروں اور گھوڑوں کی تعداد دوگنی دکھانی پڑتی، وہ ۵۵۰ سوار داغ کے لیے لاتا جن میں ۱۵۰ سہ اسپہ ۳۰۰ دو اسپہ اور پچاس یک اسپہ سوار ہوتے، اس طرح ان کے پاس گیارہ سو گھوڑے ہوتے۔

ہر منصب دار کے پاس اوسطاً اس کے منصب سوار کا ۱/۴ حصہ ضرور رہتا، اس طرح عبدالحمید لاہوری مولف بادشاہ نامہ (جلد ۲ ص ۷۱۵) کا بیان ہے کہ شاہجہاں کے پاس دو لاکھ سوار تھے، جن میں آٹھ ہزار منصب دار، ۷ ہزار احدی اور برق انداز سوار اور بقیہ ایک لاکھ پچاس ہزار شہزادوں اور امرا کے تابینان تھے

عالمگیر کے زمانے میں دکن میں تیس ہزار سوار تعینات تھے، کابل میں بارہ سے پندرہ ہزار تک اور کشمیر میں چار ہزار سوار رہتے، اسی طرح بنگال میں سواروں کی ایک کثیر تعداد رہتی، بادشاہ ہم رکاب ۳۵ یا ۴۰ ہزار سوار رہتے، اس طرح پوری سلطنت میں دو لاکھ سوار تھے، (برنیر ص ۹۲ ـ ۲۹۳)

احدی:

سواروں کی ایک قسم احدی بھی تھی، وہ کسی منصب دار کے ماتحت نہ ہوتے، بلکہ براہ راست بادشاہ کی نگرانی میں رہتے، شاہی ملازمت میں داخل ہونے کے وقت وہ اپنے گھوڑے ساتھ لاتے، ان گھوڑوں کے مرنے کے بعد حکومت کی طرف سے ان کو گھوڑے دیے جاتے، اس کے لیے وہ متعلقہ عہد داروں کی سند پیش کرتے، جس کو اصطلاح میں سنط نامہ کہا جاتا، احدیوں کی نگرانی کے لیے علحدہ دیوان اور بخشی مقرر کیے جاتے اور ایک عالی مرتبہ امیر ان کا سردار ہوتا[1] وہ بادشاہ وقت کی متفرق خدمت انجام دیتے، کسی دوسرے شعبہ میں بھی کام کرتے اور ضرورت کے وقت سوار کی خدمت بھی بجالاتے، لڑائی کے زمانے میں جنگی محاذ پر بھی بھیج دیے جاتے ان کی شہ سواری عام سواروں سے بہتر ہوتی، اس لیے وہ گھوڑے بھی بیک وقت رکھ سکتے تھے، ان کی تنخواہ بھی عام سواروں سے زیادہ ہوتی،

منصب دار داخلی:

اگر کسی منصب دار کی مرتب فوج کے کسی حصہ پر کوئی امیر سردار مقرر کردیا جاتا تو وہ منصب دار داخلی کہلاتا، چہرہ نویسی کے دفتر میں وہ شاہی حکم کے مطابق نیچے سوار لکھے جاتے اور ان

[1] آئین اکبری ص ۱۳۲

کی تنخواہ خالصہ سے ادا کی جاتی۔ [1]

کشک:

اکبر نے اپنی سلطنت کے تمام سواروں کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور اکبر ہر حصہ باری باری ایک ایک مہینہ پایۂ تخت میں آ کر کشک یعنی چوکی کی خدمت انجام دیتا، وہ دن رات شاہی آستانہ پر حاضر رہتا، یہ حصہ سات دستوں میں تقسیم کر دیا جاتا، اس طرح ہر روز ایک ایک دستہ شاہی آستانہ پر حاضری دیتا اور شاہی احکام کی تعمیل میں لگا رہتا، بارگاہ شاہی میں روزانہ شام کو یہ دستے بادشاہ کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر تسلیم عرض کرتے، یعنی سلامی دیتے، اگر کسی روز بادشاہ نہ ہوتا تو اس کی قائم مقامی شہزادے کرتے، پورے کشک کی سلامی ہر شمسی مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہوتی، اس سلامی میں سواروں کو اپنی کارکردگی پر انعام اور کاہلی پر سزا ملتی، اس طرح آئین سے اکبر کو اپنی پوری فوج دیکھنے اور پرکھنے کا موقع مل جاتا اور خود سواروں کو شاہی قربت حاصل ہونے پر شاہانہ نوازشوں سے مستفید ہونے کی آسانیاں فراہم ہو جاتیں، اس کشک میں سرحدوں پر متعین سواروں کا آنا ضروری نہ تھا۔ [2]

تیمور کے سوار:

جب یہ میدانِ جنگ میں آتے تو لڑائی کے وقت اسی تہور، طیش اور غضب کا مظاہرہ کرتے جس کے لیے تاتاری اور تیموری سوار مشہور تھے، تیمور کی ساری کشور کشائی اس کے بہادر سواروں ہی کی بدولت تھی، اس کے لشکر میں سواروں کی تنظیم بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر تھی، اس کے ہر امیر کو سو سو گھوڑے رکھنے کا حق تھا، اون باشی دس سپاہیوں کا سردار، یوز باشی سو سپاہیوں کا افسر اور مینگ باشی ایک ہزار سپاہیوں اور امیر الامراء دس ہزار سپاہیوں کے سردار ہوتے تھے، بعض سوار بازو پر آہنی سپر اور ہاتھ میں پانچ فٹ کا لمبا نیزہ رکھا کرتے تھے، وہ جب غنیم کی تعداد زیادہ دیکھتے تو ان کے سردار یہ کہہ کر ہمت دلاتے کہ اگر تم نے ان پر حملہ نہیں کیا تو پھر ان کے گھوڑے اور گھوڑوں کی زینیں کیوں کر ہاتھ آئیں گی؟ وہ حملہ کرتے وقت اتنے زور سے سورن (جنگی نعرے) لگاتے

---

[1] آئینِ اکبری ص ۱۳۳ [2] ایضاً ص ۱۳۶-۱۳۵

کہ ساری فضا میں لرزہ پیدا ہو جاتا، وہ پہاڑوں پر ہاتھوں میں سپر اور دوش پر کمان لٹکائے کیڑوں کی طرح رینگتے نظر آتے اور چٹانوں کے گوشوں اور ریتوں پر پاؤں جماتے اور چڑھ جاتے اور پہاڑ سے اتر کر نشیب میں اس طرح پھیل جاتے جیسے مٹی کے ڈھیر پر چیونٹیاں پھیل جاتی ہوں یہ سوار بعض اوقات گھوڑوں سے اتر کر ان کی پیٹھوں کی آڑ لے کر دشمنوں پر تیر چلاتے، تیمور بھی ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی پامردی سے لڑتا، ایرانیوں کے خلاف جب معرکہ آرا ہوا تو شاہ ایران منصور اس کے گھوڑے کی طرف بڑھا، تیمور نے یہ دیکھ کر اپنے نیزہ بردار سے نیزہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن نیزہ بردار پر غنیم نے اس طرح حملہ کر دیا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا اور تیمور کو نیزہ نہ ملا، اس وقت اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا، لیکن ابھی وہ تلوار کھینچنے نہ پایا تھا کہ شاہ منصور اس کی طرف جھپٹا اور اس کے سر پر دو وار کیے، تیمور نے سر پھیر لیا، منصور کی تلوار اس کے خود کو چھوتی ہوئی نکل گئی اور خود سر سے گر کر تیمور کی گود میں آپڑا، مگر وہ خود گھوڑے پر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا، یکا یک ایک تاتاری سردار اپنا گھوڑا تیمور اور منصور کے گھوڑوں کے بیچ میں لے آیا، جس سے شاہ منصور کو پیچھے ہٹنا پڑا۔[1]

ہندوستان میں تیمور محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا، تو اس کے سوار محمود کے لشکر کے کوہ پیکر ہاتھیوں اور ان کے اژدہا نما سونڈوں سے بے حد ہراساں تھے۔ ان کو خبر ملی تھی کہ ہندوستان کے جنگی ہاتھی گھوڑوں اور سواروں کو سونڈ میں لپیٹ کر ہوا میں پھینک دیتے ہیں اور زمین پر دے مارتے ہیں اور ان پر تیر و شمشیر مطلق کام نہیں کرتے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی، تو تیمور کے سواروں نے نڈر ہو کر ہاتھیوں پر حملہ کیا اور ان کو گائے کی طرح ہر طرف دوڑا کر پریشان کر ڈالا، ظفر نامہ میں ہے:

"پیلان را با آں شکوہ ہیبت گاؤ صفت می راندند" (ج ۲ ص ۱۰۴)

محمود کے قلب لشکر میں ہاتھی ہی ہاتھی تھے، لیکن تیموری سواروں نے ان پر حملہ کر کے ان قوی ہیکل جانوروں اور ان کے مہاوتوں کو تلواروں اور نیزوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا، ظفر نامہ میں ہے:

"درمیان آں نہنگاں بے ستوں ہیکل بچہار ستوں رواں درآمدند

[1] ظفر نامہ جلد ا ص ۶۱۰ ـ ۶۱۲

و پیل بانان را از قلہ آں کوہ سہانگو نسار ساختند و بہ تیرو شمشیر خرطوم آں اژدہا خلقت پیلان رامجروح می گرد اندی دمی اندا اختند"

اسی لڑائی میں تیمور کے پندرہ سالہ شہزادہ خلیل سلطان نے ہاتھی کے مقابلہ میں بڑی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا اور اپنی مردانگی اور شمشیر زنی سے ایک فیل بان کو مار کر اور ایک عظیم الجثہ ہاتھی کو گھیر کر تیمور کے پاس اس طرح لے آیا، جیسے کوئی دہقانی بھینس کو ہانک کر لاتا ہو، ظفر نامہ کے مولف نے اس واقعہ کو قلم بند کر کے کچھ اشعار بھی لکھے ہیں:

خیال ازیں چہ باشد دلیل | کہ طفلے زخیلش سگالد بہ پیل
کجا بود شہزادۂ ارجمند | ہم از پانزدہ سالگی پیل بند
ہنوز از لبش می وہد بوے شیر | چو شیراں کند پیل جنگی اسیر[1]

بابر کے سوار:

بابر ہندوستان آیا تو اس کے پاس بہت تھوڑی سی فوج تھی جس میں زیادہ تر توپچی اور سوار تھے، لیکن سواروں میں وہ تمام جنگی مہارت و تنظیم اور حربی چستی و چالاکی موجود تھی، جو لڑائی کے لیے ضروری ہے رانا سانگا کنواہہ کے میدان میں دو لاکھ دس ہزار فوج لے کر اترا تھا، جس میں تقریباً ستر ہزار سوار تھے، اس کے مقابلہ میں بابر کے پاس کل آٹھ ہزار فوج تھی، لیکن وہ اپنے توپچیوں کی مستعدی اور ثابت قدمی اور اپنے سواروں کی تیز گامی اور قواعد دانی سے راجپوتوں کے انبوہ پر غالب آیا، آغاز جنگ سے پہلے بابر نے سواروں کے ایک چھوٹے دستے کو غنیم کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا، جس سے ایک ہلکی سی جھڑپ ہوگئی اور جب یہ سوار اپنے نیزوں پر غنیم کے سر لاتے دکھائی دیے، تو بابر کی پوری فوج کی ہمت بڑھ گئی، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ فتح و کامرانی ان کے قدموں کو چومنے کی منتظر ہے، میدان جنگ میں بابر نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ دائیں اور بائیں طرف بالکل کنارے یعنی تو لقمہ اوج جرانغار اور تو لقمہ اوج برانغار پر سواروں کے منتخب اور چیدہ دستے کو کھڑا کیا اور اپنے قول کے راست و چپ توپوں کے ارابے کے پیچھے خاصہ کے شیر دل سواروں کی ایک صف ترتیب دی، جب لڑائی شروع ہوئی تو لقمہ کے تیز گام اور

1 ظفر نامہ جلد ۲ ص ۱۰۸

برق رفتار سوار چکر کاٹ کر راجپوتوں کے عقب اور پہلو میں پہنچ گئے اور ان کو نیزوں اور تلواروں سے دھکیل کر توپوں کی زد میں لے آئے، اس طرح ہر بازو کے راجپوت سپاہی اپنی صفیں توڑ توڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے، جس سے بابر کے گولہ اندازوں کو ان پر آتشیں گولوں کی بارش کرنے میں آسانی ہوئی اور جب ساری راجپوت فوج گڈمڈ ہو گئی تو ارابے کے پیچھے سے بابری سوار کو دیکھ کر آگے بڑھے، راجپوتوں کو اپنی کثرت کی وجہ سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا، پھر تو بابر کے تفنگچیوں اور سواروں نے مل کر راجپوتوں کو ڈھیر کر دیا[۱]

بابر میں اپنی سپاہ کو حرکت میں لانے کی حیرت انگیز قابلیت تھی۔ لڑائی سے متعلق جتنی باتیں ہوتیں ان کو ذہن میں رکھتا اور اپنے سرداروں کو طلب کر کے ان سے امور و طریقہ جنگ پر بحث کرتا، پھر میدان جنگ میں تمام لشکریوں کو مل کر اس طرح کام کرنے پر آمادہ کرتا جس طرح شہد کی مکھیاں مل کر کام کرتی ہیں، چنانچہ جس کے ذمہ جس قدر کام ہوتا وہ اسے کامل طور پر انجام دیتا تھا اور اگر کوئی لشکری اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرتا تو اس گھوڑے اور اسلحہ چھین لیے جاتے[۲] یا وہ اپنے عہدہ سے محروم کر دیا جاتا یا اس کی داڑھی منڈوا کر اس کو سارے لشکر میں گھما کر ذلیل و رسوا کیا جاتا[۳]، سنگین سزا میں ناک کٹوا دی جاتی[۴]، غداری کی سزائیں تو اور بھی سخت ہوتیں غلاموں کو سر بازار قتل کر دینے کا حکم ہوتا[۵]۔ اگر لشکری کسی معرکہ میں بددلی اور بزدلی کا اظہار کرتے، تو بابر ان کے سامنے موثر تقریریں کر کے ان کی غیرت و حمیت کو ابھارتا کہ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے، وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا اور جو دنیا میں آیا ہے، وہ یہاں سے جائے گا، بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہونا بہتر ہے[۶]

بابر خود ایک بڑا جری شہسوار اور دلیر سپاہی تھا، اس نے ۱۹ سال کی عمر میں ۲۴ سواروں کی مدد سے سمرقند فتح کیا، تنہا پانچ پانچ سواروں کا مقابلہ کر کے ان کو زمین پر گرا کر ڈھیر کر دیتا، دونوں بازوؤں میں ایک ایک آدمی کو دبا کر ایک کنگرہ سے دوسرے کنگرہ پر جست کر جاتا تھا[۷]۔ ان سپاہیانہ اوصاف کے علاوہ ایک فوجی قائد کی جتنی خوبیاں کسی میں ہو سکتی ہیں، وہ سب اس میں

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو بابر نامہ ص۳۱۴ [۲] [۳] [۴] بابر نامہ ص۲۱۲
[۵] بابر نامہ ص۲۱۷ [۶] بابر نامہ ص۳۰۹ [۷] طبقات اکبری جلد۲ ص۲۷

موجود تھیں، سخت سے سخت مشکلات میں وہ مطلق نہیں گھبراتا اور انتہائی صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرتا، ۱۵۰۳ء ۹۰۸ھ میں اندجان (فراغنہ) پر یورش کی تو ایک موقع کی جنگ کا حال اس طرح لکھتا ہے:

"شاید تین پہر رات گزری ہوگی کہ ایک دفعہ ہی غل غپاڑے کے ساتھ طبل جنگ کی آواز آئی، ہمارے ساتھی نیند میں تو تھے ہی، انھوں نے دشمنوں کی کمی بیشی پر خیال کیا اور نہ ایک دوسرے کی خبر لی، دفعۃً سب کے سب بھاگ نکلے، مجھے بھی اتنی فرصت نہ ملی کہ ان لوگوں کو اکھٹا کروں، مگر میں باغیوں کی طرف چلا، میر شاہ قوچین، بابا شیرزاد اور دوست ناصر میرے ساتھ تھے، ہم چاروں کے علاوہ سب بھاگ گئے، ہم تھوڑی دور آگے چلے تھے کہ وہ لوگ تیر مارتے اور غل مچاتے ہوئے ہم پر آپڑے، ایک سوار جو قشقہ گھوڑے پر تھا، میرے قریب آگیا، میں نے ایک تیر مارا، تیر گھوڑے کے لگا، گھوڑا مر گیا، وہ لوگ ذرا ٹھہر گئے، یہ تینوں آدمی جو میرے ہم راہ تھے کہنے لگے کہ اندھیری رات ہے، دشمنوں کی تعداد معلوم نہیں اور سارا لشکر بھاگ گیا، ہم چار کتنے آدمی ماریں گے یہاں سے چل دیجئے، پہلے بھاگے ہوؤں کو سمیٹئے اور پھر لڑیے، ہم دوڑے اور اپنے لوگوں میں پہنچے، ہر چند چابک تک مارے اور ٹھہرنا چاہا مگر کوئی نہ ٹھہرا، آخر ہم ہی چاروں الٹے پھرے اور تیر مارے، ادھر والے ذرا ٹھہر گئے، جب دو ایک دفعہ ہم کو انھوں نے دیکھا کہ تین چار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں تو پھر وہ ہمارے تعاقب میں اور گرانے میں مشغول ہوئے، اسی طرح تین چار دفعہ لوگوں کو میں نے ٹھہرانا چاہا، جب کوئی نہ رکا تو ناچار ان ہی تینوں کے ساتھ پلٹ کر ایسے تیر مارے کہ دشمنوں کا منہ پھیر دیا"۔ (ص ۱۰۶۔۱۰۵)

اس جنگ میں اس کو مراجعت کرنی پڑی، لیکن دوسرے سال اندجان (فراغنہ) پر پھر چڑھائی کر اور اس موقع پر جرأت اور پامردی سے لڑا اس کو پھر بیان کرتا ہے۔

میرے سامنے جو دو آدمی آئے، ان میں ایک تنبل تھا، وہ بھی آگے بڑھا، بیچ میں ایک شاہراہ کے اس جانب سے اور وہ اس طرف سے آیا یہیں ہم دونوں کا مقابلہ یوں ہوا کہ میرا سیدھا ہاتھ دشمن کی طرف اور تنبل کا سیدھا ہاتھ میری طرف ہوگیا، تنبل کے پاس گھوڑے کی زرہ کے علاوہ سارا سامان جنگ تھا، میرے پاس تلوار اور تیر کمان کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے کمان کو کان تک کھینچ

کر ایک تیر جو میرے ہاتھ میں تھا تنبل کو مارا، اس وقت ایک تیر شیبہ میری سیدھی ران میں آلگا اور آر پار ہو گیا، میرے سر پر لوہے کی ٹوپی تھی تنبل نے جھپٹ کر تلوار کا ایک ایسا ہاتھ اس پر مارا کہ میرا سر سن ہو گیا، اگرچہ ٹوپی کا تو ایک تار نہ کٹا، مگر میرا سر اچھی طرح زخمی ہو گیا، میں نے تلوار صاف نہ کی وہ اس قدر زنگ آلود تھی، اس کے نکالنے کی مہلت نہ ملی، میں بہت سے دشمنوں میں اکیلا گھر گیا۔ (۱۰۹ـ۱۰۸) وہ اکیلا گھرا ہوا تھا، لیکن پھر بھی اس کے دشمن اس کو زیر نہ کر سکے، وہ ہمیشہ سر بکف ہو کر میدانِ جنگ میں اترتا، ۹۱۱ھ میں ہزارہ ترکمانوں کے خلاف جنگ کی، تو لکھتا ہے:

''محمد علی مبشر بیگ میرے ان امیروں میں تھا جن کو میں نے بنایا تھا، بڑا بہادر اور نہایت عمدہ سپاہی تھا، جہاں دشمنوں نے لکڑیاں ڈال رکھی تھیں، اس طرف بڑھا، دشمنوں نے اس کی گردن میں تیر مارا جس سے وہ فوراً ہلاک ہو گیا، چوں کہ ہم نے حملہ کرنے میں بہت جلدی کی تھی، اس لیے اکثر جیبہ پہنے ہوئے نہ تھے، دو ایک تیر میرے سر پر سے بھی گذرتے ہوئے گرے۔ احمد یوسف بیگ بار بار گھبرا کر چلاتا تھا کہ یوں ننگے کیوں گھسے جاتے ہو، میں نے دو تین تیر تمہارے سر پر سے جاتے ہوئے دیکھے ہیں، میں نے کہا گھبراؤ نہیں، ایسے تیر تو بہت سے میرے سر سے گذر گئے ہیں۔'' (۱۶۵ـ۱۶۴) بابر کی اسی سرفروشی اور جان بازی کو دیکھ کر اس کے ہم راہی سوار اور لشکری اس کے ساتھ جلتی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے پانی میں کودنے کے لیے تیار رہتے اور جہاں اس کا پسینہ گرتا وہاں وہ اپنا خون بہاتے[۱]

اکبر کے سوار:

بابر کی شجاعت، جان بازی اور پامردی اس کے جانشینوں کو بھی وراثت میں ملی تھی، اکبر شہ سواری کے فن میں طاق تھا، وہ دن دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا اور مطلق نہ تھکتا، اس نے ایک بار آگرہ سے اجمیر تک ۶۰ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کی اور پھر دوسرے دن واپس بھی ہو گیا[۲]، وہ میدانِ جنگ میں تھوڑے سے سواروں کے ساتھ یورش کرتا تو صف اعداء میں بھگدڑ مچ جاتی، ۹۸۱ھ میں جب وہ محمد حسین مرزا گجراتی کے خلاف معرکہ آرا ہوا، تو محمد حسین کی طرف شاہ مرزا اجر انغار پر اور حبشیوں اور گجراتیوں نے برانغار پر حملہ کر کے لڑائی کی آگ مشتعل

---

[۱] بابرنامہ ص ۲۹۲ [۲] اکبرنامہ جلد ۳ ص ۲۵۱

کردی، فریقین ایک دوسرے سے دست بگریبان تھے کہ اکبر نے ایک خشم ناک شیر کی طرح اپنے سو سواروں کے ساتھ محمد حسین مرزا پر حملہ کیا، محمد حسین مرزا اکبر کا نام سنتے ہی بدحواس ہوگیا اور میدانِ جنگ سے بھاگا، پھر بھی اس کے چہرہ پر زخم لگا اور اس کا گھوڑا بھی گھائل ہوا، زقوم کی ایک جھاڑی راستہ میں ملی، اس نے اپنے گھوڑے کو جست کرانا چاہا مگر وہ زخمی ہونے کی وجہ سے جست نہ کرسکا اور ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور شاہی لشکریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، اس کی پسپائی دیکھ کر اس کے فوجی سرداروں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلیں۔ [1]

اس سے پہلے ۹۷۱ء میں اکبر کھمباٹ میں تھا کہ اس کو ابراہیم حسین مرزا کی مفسدانہ کارروائی کی خبر ملی، اس نے فوراً اپنے لشکر کا انتظام شاہزادہ سلیم، خواجہ جہاں اور قلیج خان کے سپرد کیا اور خود ۱۵۰ سواروں کی قلیل تعداد لے کر ابراہیم حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگیا راجہ مان سنگھ، راجہ بھگوان داس، سید محمد خان اور شاہ قلی خاں جیسے آزمودہ کار اور چالاک سوار اس کے ساتھ تھے، قصبہ سرپال کے پاس دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی، ابراہیم حسین مرزا کے کثیر التعداد سواروں نے حملہ کر کے شاہی تیر اندازوں کو درہم برہم کردیا، اکبر فوج کی کمی کی وجہ سے راجپوتوں کے ساتھ ایک ایسی تنگ جگہ پر کھڑا تھا، جس کے دونوں طرف زقوم کی جھاڑیاں تھیں اور تین سواروں سے زیادہ اس جگہ پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا ممکن نہ تھا، حریف کے تین سوار آہستہ آہستہ اس جگہ آئے، جہاں اکبر کھڑا تھا، راجہ بھگوان داس نے برچھے سے ان میں سے ایک کا مقابلہ کیا اور اس کو بھگا کر دوسرے سوار کی طرف متوجہ ہوا، اکبر نے جواب تنگ زقوم کی آڑ میں کھڑا ہوکر دشمنوں پر تیر پھینک رہا تھا، یہ دیکھ کر راجہ بھگوان داس کی مدد کے لیے گھوڑا دوڑایا، حریف اکبر کے حملہ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے ساتھی کے ساتھ بھاگا، اکبر فوراً تیر اندازوں کے ساتھ زقوم کی آڑ سے باہر نکل کر محمد حسین مرزا پر حملہ آور ہوا، مرزا کے لیے میدانِ جنگ تنگ ہوگیا اور وہ لڑائی سے منہ موڑ کر بھاگا، اس جنگ کا ذکر کر کے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب سے تاریخ کا پتہ چلتا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک عرش آشیانی یعنی اکبر کے سوا کسی اور بادشاہ کے بارہ میں نہیں سنا گیا کہ اس نے اپنے لشکر جرار کو چھوڑ کر ایک قلیل جماعت کے ساتھ ایک قوی دشمن پر حملہ کر کے اپنے کو ایسے عظیم الشان خطرہ میں ڈالا ہو۔ [2]

---

[1] فرشتہ جلد اص ۲۶۰

[2] فرشتہ جلد اص ۲۶۰-۲۵۹

ہاتھی اور سواروں کے مشترکہ تعاون سے اکبر صف اعداء میں جس طرح انتشار پیدا کرتا تھا، وہ فن جنگ میں غیر معمولی ترقی کا ثبوت تھا۔ ۹۷۴ھ میں علی قلی خاں اور بہادر خان نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو رائے بریلی کے پاس گنگا کے ساحل پر وہ ان کی سرکوبی کے لیے پہنچا، پہلے ہاتھی پر بیٹھ کر اپنی فوج کو لڑاتا رہا، پھر ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے ہاتھیوں کو یکبارگی علی قلی کی طرف ہانک دیا، سب سے پہلے ہیرانند نامی شاہی ہاتھی علی قلی کی طرف دوڑا، غنیم کی طرف سے رودیانہ نامی ہاتھی مقابلہ میں آیا، ہیرانند نے رودیانہ کو زمین پر دے مارا، اس ہاتھی کے گرتے ہی سوار آگے بڑھے اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی، اتفاق سے ایک تیر علی قلی خان کو آ کر لگا، وہ اس کو بدن سے نکال رہا تھا کہ ایک اور تیر اس کے گھوڑے کو لگا، گھوڑا تیر کھا کر ایسا کمزور ہوا کہ علی قلی خان اس کی پیٹھ پر سے اتر آیا، اس کے ایک لشکری نے دوسرا گھوڑا حاضر کیا اور چاہا کہ علی قلی کو سوار کرے کہ یکا یک نرسنگھ نام شاہی فیل نے پہنچ کر علی قلی خان کو زمین پر پٹک کر کچل ڈالا، یہ دیکھ کر اس کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔[1]

بعض اوقات اکبر کے شاہی سواروں کا پورا دستہ اپنی جاں بازی اور سپہ گری میں جلتی ہو آگ میں کود پڑا، قلعہ چتوڑ کے محاصرہ میں ساباط کے ذریعہ دو سرنگیں کھود کر برج تک پہنچادی گئیں، ان میں بارود بھر کر آگ لگا دی گئی تھی، اتفاق سے ایک سرنگ میں آگ لگ گئی، جس سے اس کے نیچے کا برج اڑ گیا اور قلعہ کی دیوار میں ایک بہت بڑا رخنہ پیدا ہو گیا، دو ہزار لشکری اور سوار یہ سمجھ کر کہ دونوں سرنگیں آگ سے جل گئی ہیں اور حصار میں دونوں طرف سے راستے بن گئے ہیں، یکبارگی حصار کی طرف دوڑے، ایک ہزار لشکری پہلے رخنہ پر پہنچ کر راجپوتوں کے دست و گریبان ہو گئے اور ایک ہزار دوسرے برج کے پاس پہنچے، ان لشکریوں نے جب اس برج میں رخنہ نہ دیکھا تو کچھ تو کسی تدبیر سے پلٹ آئے، لیکن کچھ غنیم سے لڑنے لگے، عین لڑائی کے وقت سرنگ میں آگ لگ گئی اور برج آگ سے یکا یک اڑ گیا، طرفین کے سپاہیوں کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ادھر ادھر گرے، قلعہ کے محصورین میں سے بے شمار آدمی ہلاک ہوئے، شاہی لشکر کے بھی پانچ سو منتخب سوار کام آئے، لیکن بقیہ اور سواروں پر کسی قسم کی سراسیمگی طاری نہیں ہوئی اور وہ

[1] فرشتہ جلد اص ۲۷۷

اسی پامردی اور دلیری سے قلعہ کا محاصرہ کیے رہے اور دوسرے دن جب قلعہ میں داخل ہوئے تو راجپوتوں نے قلعہ کے اندر جم کر مقابلہ کیا، لیکن ان کے تقریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے اور شاہی لشکر میں ایک آدمی کے سوا اور کوئی ہلاک نہیں ہوا۔[1]

اکبر کے فوجی سرداروں میں خان عالم، منعم خان خانخاناں، عبد الرحیم خانخانان، خان زماں اور بہادر خاں گھوڑے کی پیٹھ پر سے جنگ کرنے میں بڑے مشہور تھے۔ ۹۸۲ھ میں اکبر نے جب داؤد خاں کے خلاف شاہی فوج بنگال بھیجی، تو اس مہم میں ہراول کے سردار خاں عالم نے بڑی پامردی اور شجاعت کا جوہر دکھایا، شاہی لشکر کی ابھی صفیں بھی درست نہیں ہوئی تھیں کہ خاں عالم نے جوانی اور بہادری کے جوش میں جنگی قواعد کو پس پشت ڈال کر تیزی سے اپنا گھوڑا بڑھایا اور دشمن کی فوج میں گھس پڑا، منعم خاں خانخانان نے اس کو اس سے روکا اور واپس بلایا اور جب لڑائی شروع ہوئی تو داؤد خاں کی طرف سے گوجر خاں اپنے جنگی ہاتھی کو لے کر آگے بڑھا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے شاہی لشکر کے گھوڑے بھڑک گئے، جس سے صف میں انتشار پیدا ہوگیا، خاں عالم ایک نڈر اور تیز دم گھوڑے پر سوار تھا، وہ اپنی جگہ پر ثابت قدم اور جم کر لڑتا رہا اور دشمنوں کو مار مار کر ڈھیر کر دیا، لیکن یکایک اس کے گھوڑے کو تلوار کی ایک ضرب لگی اور وہ چراغ پا ہوا، خاں عالم زین پر سے زمین پر آ گیا، لیکن انتہائی چستی اور مستعدی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر پھر اسی پامردی سے لڑنے لگا، مگر اس کی قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک ایک جنگی ہاتھی اس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اس کو زد میں لے کر زمین پر گرا دیا اور دشمنوں نے اس کو گھیر کر ہلاک کر دیا، لیکن مرنے سے پہلے اس کو فخر تھا کہ اس نے اپنے شاہی آقا کے ناموس کے لیے پوری وفاداری اور جاں بازی سے جنگ کی۔ (اکبر نامہ جلد ۳ ص ۱۲۳)

اس لڑائی میں منعم خاں بھی گھوڑے ہی پر سوار ہو کر لڑا، اس کی پیشانی، گردن اور کندھوں پر متواتر ایسے زخم لگے کہ وہ مندمل بھی ہوگئے تو اس کی آنکھوں کی روشنی میں فرق آ گیا، گردن گھما کر پیچھے دیکھنے اور سر تک ہاتھ لے جانے سے معذور ہو گیا، پھر بھی بڑی بڑی

---

[1] فرشتہ جلد ۱ ص ۲۵۷-۵۸، اکبر نامہ جلد ۲ ص ۳۱۳

لڑائیوں میں شریک ہوتا رہا[۱]

عبدالرحیم خانخاں کے بارہ میں فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ معرکہ جیت لینے میں شہرہ آفاق تھا[۲] اکبر کے ۲۲ ویں سال جلوس میں مظفر گجراتی کے خلاف عبدالرحیم کو بھیجا گیا، تو احمد آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر سرکنج میں دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئے، مظفر گجراتی کے پاس چالیس ہزار اور عبدالرحیم کی کمان میں صرف دس ہزار سوار تھے، خود اکبر نے عبدالرحیم کو اس وقت تک جنگ سے روکنے کے لیے لکھا، جب تک مزید کمک نہ پہنچ جائے، لیکن مرزا عبدالرحیم نے اپنی نبرد آزمائی کا زور دکھانے کی خاطر جنگ شروع کردی اور جب لڑائی انتہائی زور پر تھی، تو عبدالرحیم ایک مقام پر سو لشکریوں اور ایک سو ہاتھی کو لے کر کھڑا تھا کہ مظفر چھ سات ہزار سوار لے کر اس پر ٹوٹ پڑا، عبدالرحیم کی پامردی میں فرق نہیں آیا اور اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کو مار بھگایا۔ اکبر نے اس کی اس جرأت اور بہادری سے خوش ہو کر پنج ہزاری منصب اور خانخانان کا خطاب عطا کیا[۳]

۱۰۰۵ھ میں نظام الملک اور قطب الملک کی فوجوں سے اکبری فوج کا مقابلہ قصبہ آشتی کے پاس ہوا، تو اس موقع پر بھی عبدالرحیم خانخانان نے حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دیا، وہ رات رات بھر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر فوج کی آراستگی اور نگرانی میں لگا رہتا، ایک موقع پر غنیم کے پچیس ہزار سوار خانخانان کے پانچ ہزار سوار پر اچانک ٹوٹ پڑے۔ خانخانان کے تمام ساتھیوں کی ہمت نے جواب دے دیا، اس کے ایک ساتھی دولت خاں لودھی نے اس کو جنگ کرنے سے روکا اور کہا کہ اس انبوہ سے مقابلہ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے، خانخانان کی غیرت جوش میں آگئی، وہ بولا کہ تم یہ کہہ کر دہلی کو برباد کرتے ہو، دولت خاں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ دشمن کو شکست ہوئی تو دہلی آباد ہو جائے گی، لیکن اگر ہم لوگ ہلاک ہوئے تو پھر معاملہ خدا کے سپرد ہے، یہ کہہ کر اس نے واپنے گھوڑے کو آگے بڑھانا چاہا، سادات بارہہ کے بہادروں میں قاسم بارہہ نے یہ صورت حال دیکھی تو آگے بڑھا اور دولت خان کو روک کر بولا " ہم ہندوستانی ہیں، لڑ کر مرجانا ہمارا شیوہ ہے، دولت خاں جھلا کر خانخانان سے پھر مخاطب ہوا کہ یہی سہی دشمن کے انبوہ کے مقابلہ میں شکست

۱۔ اکبرنامہ جلد ۱ ص ۱۲۴ ۲۔ تاریخ فرشتہ جلد ۱ ص ۲۷۰

۳۔ مآثر الامراء جلد ۱ ص ۶۰۰

لازمی ہے، لیکن یہ بتلاؤ کہ شکست کھا کے ہم لوگ تم سے کہاں ملیں" خانخاناں مردانگی اور بہادری کے پندار میں بولا "لاشوں کے ڈھیر کے نیچے" یہ سن کر سارے لشکریوں میں ایک نئی غیرت اور ہمت پیدا ہو گئی اور وہ سربکف ہو کر اس طرح لڑے کہ دشمن کی کثیر تعداد تتر بتر ہو گئی، خانخاناں نے اس غیر متوقع فتح و کامرانی کی خوشی میں میدان جنگ میں پانچ لاکھ روپے لٹائے۔[1]

اکبری امراء میں خان زمان علی قلی کے بھائی بہادر خان کے بارہ میں فرشتہ لکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے سامنے اسفندیار کی ہفت خواں داستان کو بھی ہیچ اور بے معنی سمجھتا تھا۔ شیر خان ولد محمد شاہ عدلی نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جونپور کو مغلوں سے واپس لینے کے لیے دریائے گنگا کو عبور کیا تو اکبر کی طرف سے بہادر خاں نے لڑائی میں ایسے ایسے افغانیوں کو تہ تیغ کیا، جن میں سے ہر ایک سوار اپنے کو ہزار ہزار سواروں کا ہم پلہ سمجھتا تھا۔ خان زمان اور بہادر خان دونوں ازبکوں کے سردار تھے، ازبک بڑے تیرانداز سمجھے جاتے تھے، مغل حکمران زیادہ تر ان ہی کی جنگی شجاعت و تندخوئی کی بدولت جنگ جیتا کرتے تھے۔

سادات بارہہ:

سادات بارہہ بھی ہر فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ہر معرکہ میں ان کی شہسواری اور نبرد آزمائی نمایاں رہتی۔ جہانگیر نے بھی اپنے عہد کی معرکہ آرائیوں میں ان کی جنگی خدمات کو سراہا ہے، وہ لکھتا ہے کہ... "بارہ بزبان ہندی دوازدہ را گویند، چو درمیان دو آب دوازدہ دہ بہ نزدیک ہم واقع است کہ وطن ایں سادات است بنا بریں بسادات بارہہ اشتہار یافتہ اند و بعضے مردم راصحت نسب ایشاں سخن ہا دارند، لیکن شجاعت ایشان برہانی است قاطع بر سیادت، چنانچہ دریں دولت ہیچ معرکہ نبودہ کہ اینہا خود را نمایاں ساختہ باشند و چندے بکار نیامدہ باشند، مرزا عزیز کوکہ ہمیشہ می گفت سادات بارہہ بلاگردان ایں دولت اند، الحق چنین است۔[2]

وہ "بلاگردانِ دولت" ہی نہیں رہے بلکہ آخر میں "شاہ گر" بھی ہو گئے تھے، جہاندار شاہ کے بعد حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں نے تیموری تخت پر جس کو بٹھایا اور جس کو چاہا معزول کر دیا، ان کی تلوار اور نبرد آزمائی سے پوری سلطنت کانپتی تھی۔

[1] مآثر الامراء، جلد ا ص ۱۰۷ [2] تزک جہانگیری ص ۳۷۴ ۔۳۷۵

جہانگیر نے اپنے فوجی سرداروں میں سید عبدالوہاب، سید یعقوب اور سید غلام محمد کی تعریف خاص طور پر کی ہے۔ سید عبدالوہاب کو اس کے شجاعانہ کارناموں کی بدولت جہانگیر نے دلیر خان کا خطاب دیا تھا۔[۱] ۱۰۳۲ھ میں جہانگیر کی فوج گجرات کی تسخیر کے لیے عبداللہ خان کے خلاف بھیجی گئی، تو میدان جنگ میں سید غلام محمد نے بہادری کا پورا جوہر دکھایا اور لڑتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ پر سے زمین پر آ گرا تو اس بہادر فوجی سردار کے بچانے کے لیے سو سواروں نے اپنی اپنی جانیں دیں۔[۱]

جہانگیر خود تو کوئی غیر معمولی جنرل نہ تھا لیکن اکبری روایت کے مطابق اس کے فوجی سرداروں اور ان کے ماتحت سواروں کا رعب تمام سلطنت میں بدستور سابق قائم رہا اور یہ فوجی سردار جنگی تہور بھی اسی شان سے دکھاتے رہے۔ جہانگیر ان کو بڑی محبت و شفقت سے مہم پر روانہ کرتا اور کبھی ان کو رخصت کرتے وقت خود گھوڑے پر سوار کرتا، اپنی دستار پہنا دیتا اور بغل گیر ہونے میں اشک بار ہو جاتا[۲] جس سے متاثر ہو کر یہ سردار پوری وفاداری اور جانبازی سے مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے۔ جہانگیر کے ۱۹ ویں سال جلوس میں اکبر نگر میں افغانوں کے خلاف شاہی لشکر صف آرا ہوا تو اس کی کمان ابراہیم کے ہاتھ میں تھی، اس کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے بقیہ اور سوار دوسرے بازو پر متعین تھے، لڑائی شروع ہوئی تو دشمنوں نے ابراہیم خان کے لشکر کے دوسرے بازوؤں کو درہم برہم کر دیا۔ ابراہیم یہ دیکھ کر تاب نہ لا سکا، اس کے ساتھیوں نے اس کی جان خطرہ میں دیکھی، تو اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اس کو میدان کارزار سے نکال لینا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا اور بولا کہ میدان جنگ سے منہ موڑنا مردانگی نہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا دولت حاصل ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں اپنی جان نثار کر دوں اس نے متواتر زخم کھا کر مردانہ وار جان دے دی (تزک جہانگیری ص ۳۹۳)

جہانگیر کے فوجی سردار جب بہادری کے کارنامے انجام دے کر میدان جنگ سے لوٹتے تو وہ ان کی شجاعت کی نوعیت کے لحاظ سے ان کو خطاب دیتا، مثلاً فدائی خان، زبردست خان، ہمت خان، دلاور خان، دلیر خان، دارآب خان وغیرہ، یہ دستور اور تیموری حکمرانوں کے عہد میں بھی رہا۔

۱۔ تزک جہانگیری ص ۳۷۳ ۲۔ مآثر الامراء جلد ا ص ۱۸۷

شاہجہانی عہد کے سوار:

شاہجہانی عہد میں مغل فوجوں کی سربلندی میں اضافہ ہوتا رہا، انھوں نے اپنی نبرد آزمائی اور سپہ گری کے جوہر بدخشاں، بلخ اور قندھار میں بھی جا کر دکھائے، ۱۰۵۵ھ میں شہزادہ مراد بدخشاں و بلخ کی مہم پر بھیجا گیا تو اس کی کمان میں پچاس ہزار سوار دس ہزار تفنگچی اور پیادے تھے[1] ان کی سربراہی تقریباً ڈھائی ہزار پرانے تجربہ کار فوجی سرداروں کے ذمہ تھی، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، علی مردان خان، نجابت خان، قلیچ خان، لہراسپ خان، دولت خان، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ شاہجہان نے اس لشکر کا راستہ یہ متعین کیا کہ وہ گھکھروں کے علاقہ، اٹک اور حسن ابدال ہو کر جائے، کیوں کہ ان علاقوں میں فوجی رسد کی کمی نہ تھی اور جب موسم بہار شروع ہو تو شہزادہ مراد پشاور ہو کابل روانہ ہو اور فوج کے دوسرے سردار بنگش کے زیریں حصہ سے ہو کر شہزادے سے کابل میں ملیں اور جب فوجیں کابل میں جمع ہو جائیں تو کچھ سردار مثلاً قلیچ خان خلیل اللہ خان اور مرزا نوروز اور کہمرد اور غوری پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور بقیہ تمام لشکر بدخشاں اور بلخ کی طرف جائیں، شہزادہ مراد مقررہ وقت کے بعد کابل پہنچا تو اس وقت درہ طول برف سے ڈھکا ہوا تھا، کچھ دستے ان برفانی راستوں کو صاف کرنے کے لیے آگے روانہ کیے گئے، شہزادہ مراد تین منزلوں پر قیام کرنے کے بعد چاری کاران پہنچا، یہاں سے قلیچ خاں کی سربراہی میں ایک دستہ غوری اور کہمرد کی طرف بھیجا گیا اور شہزادہ نے بدخشاں کے جانب کوچ کیا، قلیچ خان کو راستہ بہت تنگ اور دشوار گزار ملا اس لیے اس نے اپنی فوج کے کئی ٹکڑے کر کے کوچ کو جاری رکھا اور کہمرد اس طرح اچانک پہنچا کہ وہاں کے باشندے اپنی مدافعت میں کچھ نہ کر سکے وہاں دو روز ٹھہر کر غوری پہنچا، تو یہاں بھی شاہی لشکر کا کسی نے مقابلہ نہ کیا، شہزادہ مراد کو برفانی راستہ طے کرنے میں دیر لگی، درۂ طول کے برف کو ہزار ہزار مزدور صاف کرتے تو سوار اور دوسرے لشکری کچھ آگے بڑھتے، بالآخر شہزادہ سراب پہنچا، یہاں پوری فوج اکٹھی ہوئی اور وہ دیہ تاجکان ہوتی ہوئی تارین پہنچی، یہاں سے بڑھ کر اصالت خان کی نگرانی میں سواروں نے قندز پر قبضہ کرلیا، قندز چھوڑتے وقت غنیم نے بڑی لوٹ مار اور غارت گری کی،

[1] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۴۸۳

مراد نے پہنچ کر وہاں کے باشندوں کے نقصانات کی تلافی میں پچیس ہزار روپے تقسیم کرائے قندوز کے قبضہ سے بدخشاں شاہجہاں کے حدود سلطنت میں آسانی سے آگیا اور اب شاہی لشکر بلخ کی طرف بڑھا، یہ سیل رواں کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا، ان لشکریوں کی شجاعت اور نبرد آزمائی کا شہرہ وہاں تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا، اس لیے وہ کسی رکاوٹ اور مقابلہ کے بغیر کوچ کرتے ہوئے بلخ کے دروازے تک پہنچے، تفنگچی سواروں کو اپنی آڑ میں لے کر بلخ کے اندر گھسے، والی بلخ قلعہ کے اندر تھا، لشکر جرار کی آمد پر قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا اور ازبک اپنی نبرد آزمائی کے لیے مشہور تھے، لیکن مراد کی فوجوں اور سواروں کی وہ بھی تاب نہ لا سکے اور بلخ اور اس کے بعد ہی قلعہ ترمذ پر شاہجہانی پرچم لہرانے لگا، شاہی فوج کے تمام دستے جب بلخ کے اندر داخل ہوئے ہیں تو وہاں کے باشندے اس لشکر کی آرائش و نمائش کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، کوہ پیکر اور برق رفتار ہاتھیوں پر مخمل اور زربفت کی جھولیں پڑی تھیں، لشکریوں کی سیمیں اور طلائی لباس سے چمک دمک پیدا ہو رہی تھی، گھوڑوں کے زین اور لگام بھی زریں تھے، زرنگار اور مرصع جھنڈے اور علموں کی کثرت تھی، توپچیوں اور تفنگچیوں اور باندار وں کا بھی بڑا انبوہ تھا، اہل بلخ نے اس شان و شوکت کا لشکر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا [1] جب اس فتح کی خبر شاہجہاں کو پہنچی، تو اس دیرینہ آرزو کی خوشی میں آٹھ روز تک شاہانہ جشن منایا، فوجی سرداروں کے مناصب بڑھائے گئے، ان کو خلعت اور مقامات دیے گئے اور شعراء نے قصائد کہہ کر مبارک باد پیش کی ہے

مراد بلخ سے واپس چلا آیا، لیکن شاہجہاں کے حکم سے سوار اور فوج کے کچھ اور دستے خاص خاص مقامات پر متعین کر دیے گئے، مشرق کے جانب طالقان اور قندوز میں شمال مشرق کے سمت رستاق میں دریائے جیحون پر بلخ اور ترمذ میں، بلخ کے شمال میں میمنہ اور شمال مغرب کی جانب اندخود میں شاہجہانی سواروں نے ہندوستان کا پرچم لہرایا مراد کی واپسی کے بعد شہزادہ اورنگ زیب بلخ بھیجا گیا اس کے جلو میں ۳۵ ہزار فوج تھی، جس میں زیادہ تر سوار ہی تھے، اس زمانہ کا بڑا تجربہ کار فوجی جنرل امیر الامراء علی مردان خان بھی اس کے ساتھ گیا، اورنگ زیب پشاور ہوتا ہو کابل پہنچا جب کابل سے آگے بڑھا تو اس کے کچھ فوجی سردار اپنے لشکریوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے

[1] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۵۲۷

اوزبکوں نے شاہی لشکر پر تاخت کرکے اس کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی گو ان کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ مسلح سوار تھے، لیکن وہ میدان جنگ میں کھل کر لڑنے کے بجائے دشوار گزار راستوں اور پہاڑی علاقوں میں چھپ چھپ کر حملہ کرتے رہے، اس قزاقانہ جنگ کے مغل سوار عادی نہ تھے، لیکن اورنگ زیب کے سپاہیانہ تدبر اور احتیاط سے لشکر آگے بڑھتا چلا گیا اوزبک حملہ کرتے اور مار کھا کر بھاگتے رہے ان کے چھ ہزار سوار مارے گئے اور شاہی فوج کے پانچ سو سواروں کی جانیں تلف ہوئیں، اورنگ زیب راستہ میں جوشن پہنے اور سپر سے ہمیشہ مسلح فوج کی نگرانی میں مشغول رہتا تھا وہ درہ شبیر اور آق رباط ہو کیسر وکی طرف بڑھ رہا تھا کہ درہ گز کے پاس اوزبکوں نے پھر مزاحمت کی مگر اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی اچھی طرح کردی اور وہ شکست کھا کر دروں، پہاڑوں اور گزرگاہوں کی کمین گاہوں میں چھپ گئے، اورنگ زیب اوزبکوں کی قزاقانہ جنگ کے طریقوں سے کچھ واقف ہو گیا تھا اس لیے آگے بڑھا تو درہ گز سے ہو کر بلخ کو جانے والے دریا سے بلخاب کی ناکہ بندی اچھی طرح کردی، پہلے علی مردان کو ہراول بنا کر آگے بھیجا، اس کے ساتھ "شیران زنجیر خا" "دلیران جوش قبا" "بہادران تبرد پرواز" اور "تفنگچیان محکم انداز" تھے اس کے پیچھے اورنگ زیب اپنے توپچیوں، جنگی ہاتھیوں اور منتخب لشکریوں کے ساتھ روانہ ہوا، اور اوزبکوں نے ہراول پر تاخت کی مگر زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کہ علی مردان کے "صف شکن" مردافگن سواروں نے اپنی تیغ آب دار اور سنان آتش باز سے ان کو منتشر کردیا اور دو کوس تک ان کا تعاقب کرکے ان کو پیچھے دھکیل دیا اس کے بعد اورنگ زیب کو بلخ پہنچنے میں دیر نہیں لگی [1] بلخ میں کچھ احدی، سوار، پیادے اور تفنگچی چھوڑ کر وہ پوری تنظیم و ترتیب کے ساتھ آقچی کی طرف بڑھا، پہلے تفنگچی بڑھ کر راستے کو محفوظ کردیتے، ان کے پیچھے سوار کوچ کرتے کیوں کہ اوزبک باغوں اور نہروں میں چھپ چھپ کر ان پر مسلسل تیر اندازی کرکے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیتے تھے لیکن سپہ سر بکف فوج بڑھتی چلی گئی اور تیمور آباد پہنچی، اوزبک شہسواری اور تیراندازی میں بے مثل مہارت رکھتے تھے، لیکن شاہجہانی فوج کی تنظیم و ترتیب، تیزگامی اور ان سب پر مستزاد شہزادہ اورنگ زیب کی سپہ سالاری اور بیدار مغزی سے ان کا سارا تہور شورش بے مدعا بن کر رہ جاتا، وہ

---

[1] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۶۷۱-۲۷

چھپ چھپ کر شاہی فوج کے کمزور جنرل کو بھیج کر یا خود پہنچ کر ان پر ضرب کاری لگاتا، اثنائے راہ میں ایک مقام پر فریقین میں جو تصادم بھی ہوا اس کا حال خافی خان نے اس طرح لکھا ہے کہ "چاول جراتخار سعید خان کی نگرانی میں تھا، وہ بیماری کے ضعف کی وجہ سے گھوڑے پر بہ مشکل سوار ہو سکتا تھا اوز بک بھیجے، لیکن وہ مغلوب ہو گئے، پھر سعید خاں نے اپنے دو لڑکوں لطف اللہ خان اور خان زاد خان کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، یہ دونوں بڑی بہادری سے لڑے، لیکن اوزبکوں کو مغلوب نہ کر سکے اور باپ سے کمک منگوا بھیجی، اس مرتبہ سعید خان خود علالت کے باوجود جنگی نعرے لگاتا ہوا فوج کے ساتھ آگے بڑھا، اس نے اپنی تلوار سے قیامت بپا کر دی، لیکن اس کے گھوڑے کے پاؤں لڑکھڑا گئے، جس کی وجہ سے وہ زخمی ہو کر زین سے زمین پر آ گیا، اس کے کئی زخم لگے چکے تھے، پھر بھی وہ زمین سے تیزی سے اٹھا اور تین چار دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کا لڑکا لطف اللہ خان باپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا، تیروں کی بارش ہر طرف ہو رہی تھی، پھر بھی وہ اپنا گھوڑا باپ کی طرف لے چلا، یکایک ایک تیر آ کر لگا اور لطف اللہ گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا، سعید خاں کے دوسرے لڑکے خاں زاد خان نے بھائی کو اس طرح مرتے دیکھ کر باپ کو بچانے کے لیے مردانہ وار گھوڑا بڑھا دیا اور دشمنوں کو مارتا کاٹتا جا رہا تھا کہ تیروں کے متواتر زخم کھا کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور نگ زیب کو اپنی فوجی سرداروں کی پسپائی کی خبر ملی، تو ہاتھیوں، تفنگچیوں اور سواروں کا ایک دستہ لے کر ان کی مدد کو پہنچا اور کوس و کرنا کا شور ایسا بلند ہوا کہ گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی، اورنگ زیب نے دو مست ہاتھی دشمن کی طرف چھوڑ دیے اور ان کے پیچھے شیر دل سواروں نے ایسی یورش کی کہ اوزبک نہ ٹھہر سکے اور ان کے کشتوں کے پشتے لگے گئے، سعید خاں کے نوکر اس کے پاس پہنچ کر اس کو اور دونوں لڑکوں کو میدان جنگ سے باہر لائے، خان زاد خان میں رمق جان باقی تھی، اس نے اشارہ اور لکنت سے باپ کا حال دریافت کیا اور اس کی روح بھی عالم بالا میں پرواز کر گئی، تھوڑی دیر بعد باپ بھی راہی عدم ہوا۔[۱]

اورنگ زیب اس طرح لڑتا بھڑتا علی آباد پہنچا، یہاں اس کو خبر ملی کہ دشمنوں کی ایک فوج بخارا سے بلخ کی طرف بڑھ رہی ہے اس نے بلخ کی طرف مراجعت کرنا بہتر سمجھا، اوزبکوں اور بلخ

---

[۱] خافی خان حصہ اول ص ۶۶۲۔۶۶۳

کے لشکریوں نے اورنگ زیب کے بلخ تک پہنچنے میں ہر قسم کی مزاحمت کی اور جب اورنگ زیب پاشائے اور شیخ آباد ہو کر فیض آباد پہنچا تو دشمنوں سے پھر زبردست مقابلہ ہوا، لیکن اورنگ زیب کی تربیت یافتہ فوج غالب آئی اور اورنگ زیب بلخ میں داخل ہوگیا، بلخ سے روانگی اور واپسی کی مدت کل دس روز کی تھی، لیکن اس اثنا میں لشکریوں نے مطلق آرام نہ لیا ان کا کھانا ہاتھی کی پیٹھ پر تیار کیا جاتا تھا، رات رات بھر فوجی سردار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر لشکر کے چاروں طرف خندقیں کھدواتے اور ان کی نگرانی کرتے، کھانے پینے کی چیزوں کا بھی قحط پڑ گیا تھا، لیکن اورنگ زیب کی مدبرانہ قیادت، دلیرانہ رہنمائی اور سپاہیانہ احتیاط نے لشکر میں انتشار اور بددلی پیدا نہ ہونے دی اور اس کی ہمت جرات اور پامردی نے ہر وقت اس کا ساتھ دیا، وہ ازبکوں کے خلاف ایک موقع پر لڑ رہا تھا کہ دشمنوں نے مور و ملخ کی طرح اس کو گھیر لیا اس گھمسان لڑائی میں ظہر کا وقت آگیا، اورنگ زیب گھوڑے پر سے اتر آیا اور نماز جماعت کا قصد کیا، اس کے مقربین نے میدان کارزار میں اس طرح نماز ادا کرنے سے روکنا چاہا، لیکن وہ نہ مانا اور تیروں کی بارش میں پورے اطمینان و سکون سے فرض، سنت اور نفلیں ادا کیں، ازبکوں کے سردار عبدالعزیز کو اس کی خبر ملی تو وہ بہت حیران ہوا اور یہ کہہ کر جنگ سے ہاتھ روک لیا کہ ایسے شخص سے جنگ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے۔

" باچنیں کسے درافتادن برافتادن ست" ۔ ؎

قندھار کی مہم:

اورنگ زیب نے اپنی سپہ سالاری اور سپہ گری کا جوہر قندھار جا کر دکھایا، ۱۰۵۹ھ میں قندھار کی تسخیر کے لیے شاہجہاں نے جب سعد اللہ خاں اور اورنگ زیب کو بھیجا، تو ان کے ساتھ پچاس سے ساٹھ ہزار تک فوج تھی، اس مہم میں جتنے سوار اور لشکری شریک ہوئے، ان کو تنخواہ کے علاوہ سو روپے زیادہ دیے گئے، پھر منصب داروں اور احدیوں کو تین تین مہینہ کی تنخواہ پیشگی دے دی گئی اور فوج بھیرا، بنگش، کوہاٹ، جمرود، جلال آباد، کابل، غزنین، قلات اور غلوئی کے دشوار گذار راستوں سے گذر کر قندھار پہنچی، پہلے تو ایرانیوں نے قلعہ کے اندر محصور ہو کر ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن جب بالا حصار کے پاس شاہ میر میں دونوں فوجوں کا مقابلہ میدان میں

؎ مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۱

ہوا تو ہندوستانی لشکر کے سواروں اور ہاتھیوں نے مل کر غنیم کے چھکے چھڑا دیے، ایرانیوں کی فوج میں تیس ہزار قزلباش سوار تھے، لیکن ہندوستانی سواروں کی تعداد کل دس ہزار تھی، دونوں جانب توپچیوں کے علحدہ علحدہ دستے تھے، البتہ ہندوستانیوں کے پاس جو جنگی ہاتھی تھے، وہ ایرانیوں کے لشکر میں نہ تھے، گولے اور بان پھینک پھینک کر جنگ شروع ہوئی اور جب لڑائی میں گرمی پیدا ہوئی تو دونوں طرف کے سوار آگے بڑھے، قزلباش سواروں نے گھوم گھوم کر ہندوستانی فوجوں کو اپنی گود میں لے لینا چاہا، لیکن ہندوستانی فوج کے سوار اس طریقہ جنگ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے سواروں میں سے سادات، افغان اور راجپوتوں نے گھوڑے بڑھا کر ان کی یورش روکی، گو وہ تعداد میں کم تھے، لیکن اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی کے زعم میں ان کا مقابلہ کرتے رہے، قزلباشوں نے شجاعت کا پورا جوہر دکھایا، دونوں طرف سواروں کی "چپقلش مردانہ" کا حال یہ تھا کہ

از گرد و غبار سم اسپاں بر دو طرف جہاں در چشم دل باختگاں سیاہ و تیرہ گردید "۱

ہندوستانی فوج خون جگر بہا رہی تھی کہ اورنگ زیب کا ایک سردار رستم خان اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اپنے سواروں کی مدد کو پہنچا، اس کے ساتھ دوسرے سردار بھی تھے، رستم خان مارتا کاٹتا دشمن کے قلب میں گھس گیا، اس یورش میں بہت سے ہندوستانی فوجی سردار ہلاک ضرور ہوئے لیکن دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان جنگ میں ٹک نہ سکے اور جب اس فتح کا مژدہ شاہجہاں کے پاس پہنچا تو ہندوستان کے دارالسلطنت میں تین دن تک شادیانے بجائے گئے ۲

اورنگ زیب کو بدخشاں بلخ اور قندھار میں کامیابی تو ہوئی لیکن یہ علاقے شاہجہانی عہد ہی میں ہندوستان سے کٹ گئے، جہاں تک ہندوستانی سواروں کی نبرد آزمائی کا تعلق تھا وہ بدخشاں، بلخ اور قندھار کے سواروں سے زیادہ بہادر شجاع اور تربیت یافتہ ثابت ہوئے، اسی لیے ان کا مقابلہ میدانی لڑائیوں میں کم کیا گیا لیکن ہندوستانی گوریلا اور قزاقانہ جنگ کے عادی نہ تھے اس لیے ایسی لڑائیوں میں وہ اپنے غنیم پر ضرب کاری نہ لگا سکے، اس کے علاوہ محاصرہ کی جنگ میں ہندوستانی توپیں زیادہ کارگر اور موثر ثابت نہ ہوئیں، کیوں کہ ان کے غنیم خصوصاً ایرانیوں کی توپیں ان سے زیادہ بہتر اور اچھی تھیں، پھر ان علاقوں میں ہندوستانی فوجوں کے لیے خاطر خواہ رسد بھی

ایضاً   خافی خان ص ۶۹۸

نہیں ملی، اس لیے ان کے کیمپ کو برابر قحط کا سامنا کرنا پڑا پھر ہندوستانی فوجیں برفانی علاقوں میں رہنے کی عادی نہ تھیں، اس لیے جب جب وہ برفانی علاقوں سے گذریں تو بے شمار جانیں تلف ہوئیں، بلخ کی واپسی میں شاہی لشکر دریا سے سرخاب اور کوہ ہندوکش سے گذرا تو دس ہزار لشکری ،ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے جانور برف کے تودوں میں دفن ہوکر رہ گئے، دارا اور اورنگ زیب کی چشمک اور فوجی سرداروں کی رقابتوں سے بھی ان علاقوں کی مہم کو نقصان پہنچا، اورنگ زیب ان علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا ضرور جاتا، لیکن اس کو اختیارات زیادہ نہیں دیے جاتے تھے اور جب وہ اپنی خواہش کے مطابق کوئی جنگی کارروائی کرنا چاہتا، تو اس کو روک دیا جاتا یا واپس بلالیا جاتا۔ اس میں بہت کچھ داراشکوہ کو دخل رہتا۔ ان علاقوں کی فوج کشی میں شاہی خزانہ پر بڑا بار پڑا، اس لیے آخر میں شاہجہان ان پر حکومت کرنے کے خیال سے دست بردار ہوگیا، لیکن ہندوستانی فوجوں نے یہاں سے باہر نکل کر اپنی بہادری، شجاعت اور جانبازی کے جو جوہر دکھائے، وہ اس کی تاریخ میں ایک زریں مثال ہے۔

راجپوت سوار:

قندھار، بلخ اور بدخشاں کی مہم میں راجپوت سواروں نے بھی اپنی سپہ گری کے جوہر دکھائے، وہ تیموری بادشاہوں کے لشکر کا ضروری جز بن گئے تھے اور ہر چھوٹی بڑی مہم میں ضرور شریک رہتے تھے، گو کچھ راجپوت ایسے ضرور تھے جو برابر مغل سلطنت پر ضرب کاری لگانے کی فکر میں لگے رہے، لیکن مغل حکمرانوں نے ایسے راجپوتوں کی معاندانہ اور مخالفانہ روش کو ہمیشہ نظر انداز کیا اور اپنی غیر معمولی، رواداری، وسعتِ قلب، بلند حوصلگی اور سیاسی فیاضی کا ثبوت دے کر راجپوتوں کو ہر زمانہ میں اپنانے کی کوشش کی، کنواہا کے میدان میں راناسانگا تمام راجپوتوں کو جمع کرکے بابر کے خلاف اس لیے صف آرا ہوا کہ وہ راجپوتوں کی حکومت کا خواب پھر دیکھنے لگا تھا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہوا، اس کی پسپائی کے بعد بابر نے اس کے لڑکے بکرماجیت اور اس کی بیوی پدماوتی کو ستر لاکھ کی جاگیر واگذاشت کی اور ایک دوسرے لڑکے کو شمس آباد عطا کیا۔[۱]

۹۳۷ھ/۱۵۳۱ء میں ہمایوں نے چندیل راجپوتوں کے راجہ کے خلاف کالنجر پر حملہ

---

[۱] بابر نامہ ص ۳۳۳

کیا، مگر اس قلعہ کی تسخیر کے بعد راجہ کو اپنے خیر خواہوں اور امراء کے زمرہ میں داخل کر لیا، طبقات اکبری میں ہے "راجہ آنجا (کالنجر) از راہ انقیاد وعبودیت پیش آمدہ، داخل دولت خواہاں شد۔" (جلد ۲ص ۲۰) اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے، راجہ بہارامل کچھواہا، اکبر کی محبت والفت کا دم اتنا بھرتا تھا کہ اس کو اپنی لڑکی دے کر اس سے قرابت بھی قائم کر لی، اس رشتہ سے کچھواہا کے بہت سے افراد اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، خود اکبر راجہ بہارامل کا بڑا لحاظ رکھتا تھا، ۹۸۰ھ میں جب وہ گجرات کی مہم پر گیا تو فتح پور میں راجہ بہارامل ہی کو وکیل مطلق چھوڑ گیا۔[1]

راجہ بہارامل کا لڑکا راجہ بھگوان داس تو ترقی کر کے اکبر کا پنج ہزاری پنج ہزار سوار منصب بن گیا تھا، وہ آخر وقت تک اکبر کے دام اخلاص ومحبت کا اسیر رہا، اکبر کے ساتھ رانا میواڑ کے وقت جنگ کر کے اپنے قلبی تعلق کا ثبوت دیا، چتوڑ کے محاصرہ میں راجہ بھگوان داس کے ساتھ رائے پتر داس اور راجہ ٹوڈرمل بھی تھے، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس مہم کے آغاز میں رانا اودے سنگھ کا لڑکا سکت سنگھ بھی اکبر کے ہم رکاب رہا، لیکن بعد میں وفادار ثابت نہ ہوا۔[2]

۹۸۰ھ میں جب اکبر گجرات کی مہم پر گیا تو راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ تھے، لڑائی کے موقع پر اکبر اپنے خاص گھوڑے نور بیضاء پر سوار ہو کر میدان جنگ جانے لگا تو گھوڑا یکایک بیٹھ گیا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہیں ہوا، لیکن راجہ بھگوان داس نے فراست سے کام لیا اور آگے بڑھ کر اکبر سے مخاطب ہو کر بولا، "فتح مبارک ہو" اکبر نے سن کر کہا سلامت باشید یہ کیوں راجہ نے جواب دیا کہ ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو اور سینا پتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے تو فتح اسی کی ہوگی، یہ سن کر تمام لشکریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، جب جنگ شروع ہوئی تو اکبر، راجہ بھگوان داس کے ساتھ ایک ٹیلہ پر کھڑا ہو کر جنگ کا معائنہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگوان داس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہراول پر دباؤ زیادہ ہے، طور بے طور ہوا چاہتا ہے، اپنی فوج تھوڑی اور غنیم کا ہجوم زیادہ ہے، چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پیچھے سے مشت کا صدمہ زیادہ پڑتا ہے، یہ کہہ کر دونوں نے گھوڑوں کی باگ اٹھائی، اور

[1] مآثر الامراء جلد ۲ص ۱۳   [2] اکبر نامہ جلد ۲ص ۳۲۳۔۳۱۶۔۳۰۲

ان کا یہ دھاوا کامیاب رہا۔

اسی جنگ میں اکبر ایک مقام پر کھڑے ہو کر دشمنوں پر تیر چلا رہا تھا اور راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ اس کے پاس تھے کہ دشمن کے تین لشکری آگے بڑھے، ایک راجہ بھگوان داس کی طرف لپکا اور دو اکبر پر حملہ آور ہوئے، راجہ بھگوان داس نے اپنا گھوڑا بڑھایا دشمن نے گھوڑے پر سے راجہ پر تیر چلایا، لیکن راجہ نے وار بچا کر برچھا مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگا، راجہ مان سنگھ اکبر کی مدد کے لیے پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ اکبر نے للکارا کہ وہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے اور خود اپنا گھوڑا اڑا کر دونوں دشمنوں کو نرغے میں لینا چاہا راجہ بھگوان داس نے چلا کر راجہ مان سنگھ سے کہا، کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہو آگے بڑھو راجہ مان سنگھ نے کہا مہابلی خفا ہوتے ہیں، راجہ نے جھلا کر کہا یہ وقت خفگی دیکھنے کا نہیں ہے، اس عرصہ میں اکبر نے دونوں دشمنوں کو مار بھگایا، اسی لڑائی میں راجہ بھگوان داس کے بھائی ن[1] نے اکبر کو دشمنوں کے نرغے سے بچانے میں بہادری کا ایسا کارنامہ دکھایا کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ رستم و اسفندیار کیا ساری داستان بھلا دی گئی، اور آخر کار خود بھی کام آیا۔[2]

اسی لڑائی میں جب اکبر اپنی فوج کی صفیں درست کر رہا تھا تو دیکھا کہ راجہ بہارامل کا بھتیجا راجہ جے مل کچھواہا ایک وزنی بکتر پہنے ہوئے ہے، اکبر نے وہ بکتر اتروا لیا اور اپنی خاصہ کی زرہ پہنوا دی راجہ جے مل اس رعایت خصوصی سے بہت مسرور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد اکبر نے راجہ مالدیو (جودھپور) کے پوتے راجہ کرن کو دیکھا کہ اس کے پاس نہ زرہ ہے نہ بکتر، اس نے راجہ جے مل کا بکتر اس کو پہنا دیا راجہ جے مل کا باپ روپ سی بھی لڑائی میں شریک تھا، اس کو یہ ناگوار گزرا، کیوں کہ راجہ کرن کے خاندان سے اس کی پشتینی عداوت چلی آ رہی تھی، اس نے اکبر کو کہلا بھیجا کہ وہ بکتر میرے بزرگوں کی یادگار ہے اور بڑا مبارک ہے، اس لیے مجھ کو واپس کر دیا جائے (اکبر معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا اور روپ سے کے پاس کہلا بھیجا کہ خاصہ کی زرہ اور بھی مبارک ہے لیکن راجہ روپ سی کا غصہ فرو نہ ہوا اور اس نے اشتعال میں اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دیے اور کہا کہ میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا، اکبر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنی زرہ بھی اتارنے کا ارادہ کر لیا کہ جب

---

[1] بدایونی کا بیان ہے راجہ بھگوان داس (بھگونت داس) کا لڑکا بھوپت رائے تھا، جلد ۳ ص ۴۳

[2] فرشتہ جلد ا ص ۲۵۹

میرے لشکری برہنہ ہو کر لڑیں گے تو میں کیوں کر چھپ کر میدان جنگ میں جا سکتا ہوں، راجہ بھگوان داس کو اس کی خبر ملی تو فوراً گھوڑا بڑھا کر جے مل اور روپ سی کے پاس پہنچا اور دونوں کو سمجھا کر ہتھیار رکھوا کر اکبر کے پاس لایا اور عرض کیا کہ روپ سی نے آج بھنگ زیادہ پی لی تھی، اسی کی لہر کی ترنگ میں تھا یہ سن کر اکبر کا تردد جاتا رہا۔[1]

اکبر کی دلداری اور خاطر داری کے سبب سے راجہ مان سنگھ اور اس کے لڑکے راجہ ہمت سنگھ اور راجہ جگت سنگھ نے جو جنگی کارنامے انجام دیے ہیں، وہ تیموریوں کی تاریخ کی نمایاں چیز ہے، راجہ مان سنگھ کو اکبر غایت محبت میں مرزا راجہ کہا کرتا تھا، اسی کی نگرانی میں شاہی فوج راجپوتانہ میں رانا پرتاب کے اور بہار میں پورن مل اور راجہ سنگرام اور اڑیسہ میں پوری کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی پھر کابل، زابلستان، بہار اور مشرقی بنگال میں جا کر اکبری اقبال کا پرچم لہرایا، اکبر نے جب اس کو ہفت ہزاری منصب دار کا اعزاز عطا کیا ہے تو اس وقت تک یہ اعزاز کسی مسلمان منصب دار کو بھی نہیں ملا تھا۔[2] راجہ مان سنگھ سے پہلے بھی کوئی فوج کسی ہندو فوجی سردار کی نگرانی میں کہیں نہیں بھیجی گئی تھی اور نہ کسی ہندو فوجی سردار نے مسلمانوں کے خلاف اپنی رہنمائی میں لشکر کشی کی تھی، لیکن اکبر نے مان سنگھ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر مسلمانوں کا سارا رعب ہندوؤں کے دلوں سے نکال دیا۔

اکبر کے طلسم محبت میں گرفتار ہونے والوں میں جودھپور کے راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹہ راجہ کا نام بھی نمایاں ہے، اس نے اپنی لڑکی مان متی عرف جگت گسائیں کا بیاہ شہزادہ سلیم سے کر کے اکبر سے قلبی محبت کا اظہار کیا، یہ راجپوت شہزادی جودھا بائی کے نام سے تاریخوں میں مشہور ہے، اس قرابت کے بعد اودے سنگھ نے اکبر کی بہت سی مہموں میں فوجوں کی رہنمائی کی، سندیلہ کے راجہ مدھکر اور سروہی کے راجہ کی تادیب بھی اسی کی نگرانی میں کی گئی۔[3]

اکبر کے جان نثاروں میں رائے رائے سنگھ بیکانیری بھی تھا، اس نے بھی اپنی ایک لڑکی شہزادی سلیم کے عقد میں دی اور تمام عمر اکبر کی خدمت میں گذاری، ۱۹ جلوس میں مالدیو کے راجہ کی سرکوبی کے لیے مامور ہوا، جالور اور سروہی کے راجہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا، ۲۸

[1] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۱۱۱ [2] ایضاً ص ۱۷۰-۱۶۰

[3] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۱۷۰-۱۶۰

جلوس میں رانا پرتاب کے خلاف مہم بھیجی گئی اس میں بھی رانا کے خلاف رائے سنگھ کے تلوار نیام سے باہر ہوئی تھی، اکبر نے اس کو چار ہزاری کا اعزاز بخشا تھا اور جہانگیر نے منصب پنج ہزاری پر سربلند کیا ۔[1]

راجہ ٹوڈرمل بھی اکبر کا بڑا خیر خواہ تھا، گو تاریخوں میں اس کا نام ایک ماہر مالیات کی حیثیت سے ہے، لیکن اس نے میدان جنگ میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔

۹۸۲ھ میں اکبری فوج بنگال کے داؤد خاں کے خلاف صف آرا ہوئی تو جرانغار پر راجہ ٹوڈرمل بھی دوسرے فوجی سرداروں کے ساتھ تھے، جب لڑائی زوروں سے ہو رہی تھی، تو داؤد خاں کے لشکر کے مقابلہ میں شاہی فوج کے قلب اور برانغار کمزور پڑ گئے اور پسپائی کے آثار ظاہر ہونے لگے، کچھ لشکریوں نے یہ خبر راجہ ٹوڈرمل کے بازو تک پہنچائی، ٹوڈرمل نے بڑھ کر اپنے لشکریوں کو للکارا۔

"شہنشاہ کے اقبال کا سایہ ہمارے بہادر لشکریوں کی پیشانی پر پڑ رہا ہے، اگر کسی کا قدم ڈگمگا گیا ہے تو سلطنت کے دوسرے بہادروں کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے، لغویات سننے اور کہنے کا یہ موقع نہیں، ہماری فتح لکھی ہوئی ہے اور کامرانی کے آثار سامنے ہیں"

یہ کہہ کر خود میدان کارزار میں کود پڑا اور اس کے پیچھے دوسرے بہادر سردار اور لشکری بھی بڑھے اور جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا اور اکبری فوج اپنے دشمن پر غالب رہی، اس جنگ میں بابائے کلابی، منصور علی، میر یوسف آب بارانی، حسین بیگ گرد جیسے فوجی سرداروں نے ٹوڈرمل کی سرداری اور قیادت قبول کرنے میں مطلق تامل نہیں کیا ۔[2] گجرات، بہار اور بنگال میں کئی لڑائیاں اسی نگرانی میں لڑی گئیں، وہ اکبر کے چہار ہزاری منصب داروں میں تھا۔

میواڑ کے رانا پرتاب سنگھ نے اکبر کی سلطنت کو اکھاڑ پھینکنے میں جو کوشش کی وہ ایک افسانہ بن گیا ہے، پھر کرنل جیمس ٹاڈ نے اپنی مشہور و معروف تاریخ Annals and antiquities of Rajastkan میں اس کی حب الوطنی، قومی غیرت اور مسلم دشمنی کا جو راگ الاپا ہے اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں محض افتراق اور نفاق پیدا کرنا ہے

[1] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۱۵۳۔۱۳۸ [2] اکبر نامہ جلد ۳ ص ۱۲۵

، ٹاڈ کا بیان ہے کہ رانا پرتاب کو انتہائی دکھ تھا کہ راجستھان میں ترکوں کے قوانین رائج ہو گئے ہیں،
وہ راجپوتوں کی حمیت ابھار کر پیروان اسلام سے ہندوستان کی حکومت چھیننا چاہتا تھا، وہ راجہ مان
سنگھ سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ اس نے ایک ترک کو اپنی بہن دی اور ایک ترک کے ساتھ کھانا
کھایا، اودے ساگر میں راجہ مان سنگھ نے رانا پرتاب سے ملنے کی کوشش کی تھی، لیکن رانا اس سے
نہیں ملا اور جب راجہ مان سنگھ چلا گیا تو اس زمین کو گنگا جل سے دھو کر پوتر کیا گیا اور وہاں کے
لوگوں نے اشنان کر کے اپنے کو پاک کیا اور یہ اس لیے کہ راجہ مان سنگھ ترکوں کا دوست تھا، ٹاڈ
کی سن گھڑت داستانوں نے رانا پرتاب کے کیریکٹر میں ایک فسانوی ورومانی رنگ ضرور پیدا کر دیا
ہے، لیکن اس کو حقیقت سے بہت کم علاقہ ہے اور اگر ٹاڈ کے بیانات کو صحیح مان لیا جائے تو یہ ماننا
پڑے گا کہ رانا پرتاب نے گو راجپوتوں کو اکبر کے خلاف ابھارنے کی پوری کوشش کی مگر اکبر کی
رواداری، ہردل عزیزی، صلح جوئی، محبت اور اخلاص کے مقابلہ میں وہ اپنے مشن میں ناکام رہا، خود
ٹاڈ کا بیان ہے کہ مرواڑ، امبر، بیکانیر، بندی کے راجپوت راجاؤں اور خود رانا پرتاب کے بھائی
ساگر جی نے اس کو چھوڑ کر اکبر کا ساتھ دیا، اور جب ہلدی گھاٹ میں رانا پرتاب اور اکبر کی
فوجوں میں تصادم ہوا، تو اکبر کی فوج کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، ٹاڈ نے اس جنگ کا
ذکر بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر کیا ہے حالاں کہ تیموری دور کے مورخین نے اس جنگ کو زیادہ
اہمیت نہیں دی ہے، پھر ٹاڈ نے اس لڑائی کی تفصیل لکھنے میں بہت سی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے،
وہ لکھتا ہے کہ اکبری فوج کی رہنمائی شہزادہ سلیم نے کی، حالاں کہ اس مہم کے وقت اس کی عمر کل
سات سال کی تھی، وہ ۹۷۷ھ میں پیدا ہوا اور یہ لڑائی ۱۵۷۶ء ۹۸۴ھ میں ہوئی اور جب شہزادہ
سلیم کی شرکت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، تو پھر ٹاڈ کا یہ لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ رانا پرتاب سلیم
کے ہاتھی کی طرف برچھا لے کر بڑھا اور قریب تھا کہ اکبر کو اس کے وارث سے محروم کرے کہ شہزادہ
کا ہاتھی سراسیمہ ہو کر بھاگا، جس کے بعد اکبری فوج نے شہزادہ کو بچانے میں پوری جنگ کی ٹاڈ کا
بیان ہے کہ رانا پرتاب کے جسم پر سات زخم لگے اور اس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر اپنے گھوڑے چتو

۱،۲ ٹاڈ جلد ا ص ۲۵۸ ۳ ٹاڈ جلد ا ۲۶۱ ۴ ٹاڈ جلد ا ص ۲۵۷

۵ اکبر نامہ جلد ۳ ص ۱۷۵ ۔ ۱۷۴

پر بھاگا، اکبر کے بعض سواروں نے اس کا پیچھا کیا، جس میں اس کا بھائی سکت بھی تھا، مگر سکت نے جب بھائی کو اس طرح جان بچا کر بھاگتے دیکھا، تو اس کی برادرانہ محبت جوش میں آ گئی، اس لیے اپنے ہمراہی سواروں کو راستہ میں برچھے سے ہلاک کر دیا اور بھائی کے گلے سے جا کر لپٹ گیا لیکن وہ شہزادہ سلیم کی رکاب میں تھا، اس لیے بھائی کو چھوڑ کر پھر سلیم کے پاس چلا آیا اور غلط بیانی سے کام لے کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہا، سلیم نے اس کو معاف کر دیا مگر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا مگر جب شہزادہ سلیم جنگ میں شریک ہی نہیں ہوا تو یہ ساری داستان من گھڑت ہی ہے جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ٹاڈ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رانا پرتاب کے ساتھ ۲۲ ہزار راجپوت تھے، جو دشوار گزار پہاڑی وادیوں اور دروں میں چھپ چھپ کر آگرہ کی فوج کا مقابلہ کرنے آتے تھے جو تعداد میں بہت کم تھی لیکن اس جنگ میں چودہ ہزار راجپوت مارے گئے اور صرف رانا پرتاب اپنے وفادار گھوڑے چیتک کی تیز گامی کے بدولت بچ نکلا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس جنگ میں اکبری فوج کے کل ۱۵۰ آدمی مارے گئے جن میں انتہائی بہادری سے لڑ کر جان دینے والوں میں راجہ رام ساہ، سال بہان، بھان سنگھ اور پرتاب سنگھ بھی تھے اس جنگ میں کنور مان سنگھ نے جو جوہر دکھائے، ابوالفضل نے خاص طور پر اس کی تعریف کی ہے، مان سنگھ کے علاوہ اس لڑائی میں اکبری فوج کے دوسرے راجپوت سرداروں کے نام یہ تھے، رائے لون کرن، جگن ناتھ، مادھو سنگھ ۱

رانا پرتاب کی موت اس ذہنی خلیجان میں ہوئی کہ وہ اکبر سے انتقام لے کر اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا نہ کر سکا لیکن اکبر اطمینان اور سکون کی موت مرا کہ اس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کے دلوں کو موہ کر اپنی حکومت کے ذریعہ ہندوستان کو ایک مرکزیت دی بکھرے ہوئے جغرافیائی علاقوں کو متحد کیا اور ایک مرکزی نظام کی یکسانیت عطا کی، ہندو اور خصوصاً راجپوت اس کو اپنے قلوب کا فاتح اور اس کی سلطنت کو اپنی ہی سلطنت سمجھتے رہے، ۹۸۲ھ میں راجہ ٹوڈرمل جب داؤد خاں کے خلاف میدان جنگ میں لڑ رہا تھا تو اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر ابھارتا تھا کہ سلطنت ہماری ہے اس کی فتح ہماری فتح ہے ۲

۱ اکبر نامہ جلد ۳ ص ۶۷۴ ۲ آئین اکبری انگریزی ترجمہ ص ۳۷۶

اکبر نے راجپوتوں کے لیے فراخ حوصلگی اور دل داری کی جو روایت قائم کی، اس کو اس کے جانشینوں نے بھی برابر برقرار رکھنے کی کوشش کی، جہانگیر کی رگوں میں تو راجپوت کا خون آ ہی چکا تھا، اس لیے راجپوتوں کی خاطر داری میں اکبر سے بھی کچھ آگے بڑھا ہوا تھا اور اس کے سارے لشکریوں میں بھی راجپوتوں سے دوستی اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور جب کبھی ان کی دل شکنی ہوتی تو تمام ارباب حل وعقد ان کے قلوب کی تالیف میں پوری ہوش مندی اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے، جہانگیر کے اٹھارہویں سنہ جلوس میں شاہی فوج مہابت خان کی کمان میں دکن میں مقیم تھی، سادات بارہہ میں سے سید کبیر کے ایک بھائی نے اپنی تلوار ایک صیقل کرنے کو دی، صیقل گر کی دوکان لشکر کے ایک دوسرے فوجی سردار رکھوا ہا کی قیام گاہ کے پاس تھی، صیقل کی اجرت میں صیقل گر اور سید کبیر کے بھائی میں جھگڑا ہونے لگا، سید کے ملازموں نے غصہ میں آ کر صیقل کو دو تین لکڑیاں ماردیں، راجہ گردھر کے راجپوت سپاہیوں نے صیقل گر کی حمایت کی اور سید کے نوکروں کو زدوکوب کیا اور یہاں تک بات بڑھ گئی کہ فریقین میں تلواریں چلنے لگیں، سید کبیر کو معلوم ہوا تو کچھ سواروں کا دستہ لے کر پہنچ گئے، اور راجہ گردھر کی قیام گاہ کو گھیر لیا اور غصہ میں اندر گھس کر تلوار چلانے لگے، راجہ گردھر نے بھی اپنی تلوار سونت لی، لیکن وہ چھبیس راجپوتوں کے ساتھ ہلاک ہوا، سید کبیر کی طرف بھی چار سید مارے گئے، یہ خبر پھیلی تو لشکر کے راجپوت ایک طرف جمع ہو گئے اور دوسری طرف سادات بارہہ اکٹھا ہوئے اور قریب تھا کہ دونوں میں کشت وخون ہو جائے کہ مہابت خان کو خبر ہو گئی، وہ موقع واردات پر پہنچا اور اپنی حکمت عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرو کیا، پھر راجہ گردھر کی قیام گاہ پر جا کر اس کے لڑکوں سے تعزیت کی، بعد میں سید کبیر گرفتار ہوئے اور محض راجہ گردھر کے لڑکوں اور راجپوتوں کی تسلی کی خاطر سید کبیر قصاص میں قتل کر دیے گئے۔[1]

سادات بارہہ فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ان کے بہادرانہ کارناموں سے تیموریوں کی پوری تاریخ معمور ہے لیکن راجپوتوں کی خاطر سادات بارہہ کی خفگی کا خیال مطلق نہیں کیا گیا اور ان کے ایک بہادر فرد کو محض راجپوتوں کی دل جوئی کے لیے تہ تیغ کر دیا گیا۔

اکبر اور جہانگیر کی رواداری، فراخ حوصلگی اور ہندو نوازی اور راجپوتوں کی دوستی،

---

[1] تزک جہانگیری ص ۳۸۳

وفاداری اور یگانگت سے ہندوستان میں جو ایک سیکولر حکومت قائم ہوگئی تھی، اس کے خلاف رانا پرتاپ کے خاندان والوں نے اپنی معاندانہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں برابر جاری رکھیں، جہانگیر نے بھی ان کی سرکوبی کے لیے سیکولر طریقے اختیار کیے، چناں چہ اپنی جانشینی کے پہلے سال رانا امر سنگھ کے خلاف جو لشکر بھیجا، اس کے فوجی سرداروں میں راجہ بہار امل کا لڑکا پنج ہزاری منصب دار، راجہ جگن ناتھ، خود راجہ امر سنگھ کا چچا رانا ساگر[۱] راجہ مان سنگھ کا بھتیجا مادھو سنگھ، اور اس کا پوتا مہا سنگھ اور راجہ منوہر سنگھ کچھواہا بھی تھے، اس مہم میں بیس ہزار سوار تھے، راجپوت سرداروں کی نگرانی میں زیادہ تر راجپوت سوار تھے، رانا امر سنگھ اس لشکر جرار کی تاب نہ لا سکا تو اپنے لڑکے باگھ سنگھ کو صلح کے لیے بھیجا، لیکن یہ صلح رانا امر سنگھ کے معاندانہ رویے کی وجہ سے زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور جہانگیر کو اپنے تیسرے سال جلوس میں مہابت خاں کی نگرانی میں پھر ایک فوج بھیجنا پڑی، جس میں توپچیوں، ہاتھیوں، احدیوں کے علاوہ بیس ہزار مسلح سوار بھی تھے، جن راجپوت سرداروں نے راجپوت فوجیوں کے ساتھ اس مہم میں شرکت کی، ان کے نام یہ ہیں: راجہ نر سنگھ دیو، نرائن داس کچھواہا اور راجہ کشن سنگھ راٹھور، موخر الذکر نے اس معرکہ میں اپنی شجاعت اور بہادری کے اعلیٰ جوہر دکھائے، وہ دلیرانہ طور پر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا اور مردانہ وار لڑ کر رانا کے بتیس سرداروں کو تہ تیغ کیا اور تین ہزار راجپوت سواروں اور سرداروں کو قید کر کے لایا، جہانگیر نے اس کی بہادری سے خوش ہو کر اس کو منصب دو ہزاری ذات ہزار سوار عطا کیا[۲] اور رفتہ رفتہ وہ منصب سہ ہزاری ذات ہزار و پانصد سوار تک ترقی کرتا گیا، رانا امر سنگھ اپنے باپ رانا پرتاپ سنگھ کی طرح پہاڑی دروں اور وادیوں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کا مقابلہ کرتا رہا، اس لیے جب مہابت خاں کو اس کے لشکر کی سرکوبی میں تاخیر ہوئی تو جہانگیر نے اس کو واپس بلوا کر اپنے ایک دوسرے جری اور بہادر سوار عبداللہ خاں کو وہاں بھیجا[۳]، عبداللہ نے اس مہم میں اپنی بہادری کا ایسا سکہ جمایا کہ جہانگیر نے اس کو پنج ہزاری منصب کے علاوہ فیروز جنگ کا خطاب دیا، عبداللہ خاں نے رانا امر سنگھ کا عرصہ

۱۔ تزکِ جہانگیری ص ۸ پر رانا ساگر کے بجائے رانا شنکر لکھا ہے اور اس کو رانا امر سنگھ کا چچا زاد بھائی بتایا ہے لیکن موجودہ تحقیق سے اُس کو امر سنگھ کا چچا رانا ساگر ہی کہا گیا ہے۔

۲۔ ایضاً ص ۷۳۔۷۱ ۳۔ تزکِ جہانگیری ص ۷۶

حیات تنگ کر دیا اور اس کے اکثر و بیشتر نامی راجپوت سردار عبداللہ خاں کی یورش سے مارے گئے جن میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں ترائن داس، سورج مل سسودیہ، ہری داس راٹھور، بھوپت جھالا، کبیر داس کچھواہا، کیشو داس چوہان وغیرہ عبداللہ رانا کی مہم کو ابھی ختم نہ کر سکا تھا کہ وہ گجرات بھیج دیا گیا، اس کے بعد مہم کی کمان راجہ باسو کو دی گئی، لیکن رانا امر سنگھ کی پسپائی شہزادہ خرم کے ہاتھوں لکھی تھی، جہانگیری فوج کی پیہم اور متواتر یلغار و یورش کی وہ تاب نہ لا سکا اور آٹھ نو سال کی تخریبی سرگرمیوں کے بعد سپر ڈال دی اور جہانگیر کے اقتدار اعلیٰ کو قبول کر کے اس کا باج گزار بن گیا اس کی پسپائی کی خوش خبری دو پیام بروں نے جہانگیر تک پہنچائی، ان میں ایک سندر داس بھی تھا لے جو بعد میں رائے رایان کے خطاب سے سرفراز ہوا، رانا امر سنگھ پہلے تو شہزادہ خرم سے آ کر ملا اور سر تسلیم خم کر کے درباری آداب کے مطابق سجدہ بجا لایا پھر اپنے لڑکے رانا کرن سنگھ کو جہانگیر کے پاس اجمیر بھیجا، رانا کرن سنگھ دربار میں آتے ہی سجدہ بجا لایا اور جہانگیر کے اشارہ سے دست راست کے امراء کی صف میں کھڑا ہوا، جہانگیر کا دل راجپوتوں کی محبت و الفت میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا، اس لیے رانا کے خاندان والوں نے اس کی حکومت کے خلاف مخاصمت اور دشمنی کی جو آگ ایک عرصہ تک بھڑکا رکھی تھی اس کو بالکل بھول گیا اور رانا کرن کی دل داری اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا خود لکھتا ہے،

" کرن کی طبیعت میں وحشت تھی مجلسوں کا عادی نہ تھا، پہاڑوں میں زندگی بسر ہوئی، اس کو رام کرنے کے لیے میں روزانہ نئی نئی عنایتوں سے نوازا، دوسرے دن خنجر مرصع تیسرے دن زین مرصع کے ساتھ عراقی گھوڑا اپنی طرف سے بھیجا اور پھر دربار جا کر نور جہاں بیگم کی طرف سے خلعت فاخرہ، شمشیر مرصع، اسپ با زین اور ہاتھی مرحمت کیا، اس کے بعد نہایت قیمتی مرواریدکی تسبیح عطا کی، اس کے دوسرے دن ایک ہاتھی بھیجا میرے دل میں یہ بات تھی کہ اس کو ہر قسم کی چیزیں دی جائیں اس لیے تین باز، تین جرے، ایک قبضہ شمشیر، ایک بکتر، ایک جوشن اور دو انگوٹھیاں بھی بھیجیں، جن میں سے ایک میں لعل کا اور دوسری میں زمرد کا نگینہ تھا، بر آخر مہینہ میں ہر قسم کے کپڑے، ہر قسم کی خوشبوئیں، طرح طرح کے طلائی ظروف سوخوانوں میں چن کر احدیوں کے

لے تزک جہانگیری ص ۱۳۵

کندھوں پر دیوان خاص و عام میں منگوائے اور سب کرن کو عطا کیے [1]۔۔۔"

ان ہی الطاف و اکرام کی بنا پر تمام راجپوت سردار تیموری سلاطین کے طلسم محبت میں گرفتار ہو کر ان کے جان نثار بن گئے تھے اور ان کی خاطر سر بکف ہو کر میدان جنگ میں لڑتے تھے۔

شاہجہاں نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ اکبر و جہانگیر ہی کی روایت کے مطابق تھا اس نے راجپوتوں سے رشتے تو قائم نہیں کیے، لیکن ان کی دل جوئی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، اس کے دربار اور فوج میں حسب ذیل بڑے ہندو سردار اور امراء تھے:

(۱) راجہ جسونت سنگھ پنج ہزاری ہزار سوار دو ہزار و پانصد سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۲) راجہ جے سنگھ پنج ہزاری سوار دو ہزار سوار سہ اسپہ (۳) راجہ گج سنگھ پنج ہزاری پنج ہزار سوار (۴) راجہ جگت سنگھ پنج ہزار سوار (۵) راجہ بیٹھل داس کو پنج ہزاری پنج ہزار سوار (۶) مالوجی دکنی پنج ہزاری پنج ہزار سوار (۷) راو امر سنگھ چار ہزار سہ ہزاری سوار (۸) راجہ رائے سنگھ سیسودیہ چار ہزاری دو ہزار سوار (۹) راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ سہ ہزاری سہ ہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ اسپہ (۱۰) راو سترسال ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۱) مادھو سنگھ ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۲) مہیش داس راٹھور سہ ہزاری دو ہزار سوار و پانصد سوار (۱۳) نظر بہادر خویشگی سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار (۱۴) راجہ جگت سنگھ سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۵) اودا جی رام دکنی سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۶) پرسو جی بقو نسلہ سہ ہزاری و پانصد سوار (۱۷) جادون رائے دکنی سہ ہزری دو ہزار و پانصد سوار (۱۸) سنگو جی بنالکر سہ ہزاری ہزار و پانصد سوار (۱۹) راجہ دیبی سنگھ بندیلہ دو ہزار و پانصدی (۲۰) راجہ راج روپ دو ہزاری دو ہزار سوار (۲۱) روپ سنگھ راٹھور (۲۲) رام سنگھ راٹھور (۲۳) سبل سنگھ دو ہزاری ہزار و پانصد سوار (۲۴) رائے ٹوڈرمل ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار (۲۵) رتن راٹھور ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار وغیرہ وغیرہ [2]۔

یہ راجپوت فوجی سردار اپنے منصب کے مطابق راجپوت سوار فراہم کرتے، جو ہر چھوٹی بڑی لڑائی میں بڑے فخر و غرور کے ساتھ شریک ہوتے، بلخ، بدخشاں اور ایران جو فوجیں بھیجی گئیں، ان میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ راجپوت سردار مثلاً راجہ جسونت سنگھ، راجہ دیبی سنگھ، راجہ

[1] تزک جہانگیری ص ۱۳۷ [2] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۵۲ ۷۔ ۷۱۷

جے سنگھ، راجہ راج روپ، راجہ پہاڑ سنگھ، وٹھل داس، راؤ ستر سال ہاڑا وغیرہ تھے، پورا لشکر سیکولر طریقہ پر مرتب کیا گیا تھا، جہاں مسلمان فوجی امراء اپنے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ کوچ کر کے آگے بڑھتے تھے، وہاں راجپوت سردار اپنے راجپوت سواروں اور لشکریوں کو لے کر ہندوستانی پرچم لہراتے، گھوڑوں کو بل کھلاتے اور اینڈتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش دشوار گزار راستے طے کرتے چلے جاتے تھے ایسا بھی ہوتا ہے مسلمان فوجی امراء کی نگرانی میں راجپوت سوار ہوتے اور راجپوت سرداروں کی نگہبانی میں مسلمان سوار ہوتے اور یہ مغل سلاطین کے عمل تسخیر کا نتیجہ تھا:

راجپوتوں کی پوری تاریخ ان کے باہمی جنگ وجدل سے بھری ہوئی ہے، ایک راجپوت راجہ دوسرے راجپوت راجہ کی نگرانی یا قیادت میں لڑنا کسرِ شان سمجھتا تھا، چناں چہ بندی کے راجہ نے اکبر کے سامنے ہتھیار ڈالا تو اکبر سے اس کی منجملہ درخواستوں میں ایک یہ بھی تھی کہ کسی ہندو راجہ کی رہنمائی میں اس سے کوئی فوجی خدمت نہ لی جائے، لیکن مغل حکمرانوں نے اپنی رواداری، دوستی اور مآل اندیشی سے راجپوتوں کا بکھرا ہوا شیرازہ جوڑا اور ان میں یکجہتی، یکسانیت اور یگانگت پیدا کی اور جب ان کو متحد کر کے اپنی فوج کا ضروری حصہ بنالیا، تو ان راجپوتوں نے بھی ان کی فوج کی ترتیب وتنظیم کو بڑی رغبت سے اختیار کیا، خود جدوناتھ سرکار کا بیان ہے کہ ہندوؤں کو جنگ میں ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، لیکن مسلمانوں نے سواروں کے دستے کے طریقۂ جنگ کو ہندوستان میں بڑی ترقی دی [1]۔ راجپوت سواروں نے اس ترقی سے پورا فائدہ اٹھایا اور وہ رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں کے لشکر اور دربار میں اس قدر چھاگئے کہ شاہجہان کے آخری دور میں ان ہی کا غلبہ اور استیلا نظر آتا تھا۔

اورنگ زیب اور راجپوت سوار:

شاہجہانی دربار میں راجپوتوں اور ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہجہاں کا بڑا لڑکا دارا شکوہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور مراسم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس کی تفصیل ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، دارا اپنے مذہبی عقائد ورجحانات کی بنا پر

[1] اسلام ان انڈیا از جدوناتھ سرکار

ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں میں بہت مقبول ہوگیا اور جب تخت و تاج کے لیے شاہجہاں کے لڑکوں میں جنگ شروع ہوئی، تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت فوجی سردار دارا کی حمایت میں امنڈ پڑے، دھرماوت میں راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو آگرہ کی طرف بڑھنے سے روکا، راجہ کے ساتھ بے شمار راجپوت سردار تھے، اورنگ زیب نے راجہ کو رقعہ بھی لکھا کہ بھائیوں کا خانگی معاملہ ہے، وہ بیچ میں نہ پڑے اور جنگ سے علحدہ ہو کر جودھپور جاکر آرام کرے، لیکن جسونت سنگھ کو اپنے خواب رنگیں کو حقیقت بنانا تھا، اس لیے وہ نہ مانا اور دھرماوت کے میدان میں لڑائی شروع کردی، اس نے اپنے ہراول میں دس ہزار سوار رکھے، جس میں زیادہ تر راجپوت تھے، ان کی نگرانی کنند سنگھ ہاڈا، راجہ سبھا ن بندیلہ، امر سنگھ چندراوت، رتن راٹھور، ارجن گور، دیال داس جھالا، موہن سنگھ ہاڈا اور دوسرے نامی سرداروں کی ذمہ تھی، التمش میں مہیش داس گوردھن راٹھور اور دوسرے جانباز راجپوت تھے، قول میں خود راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راجپوت سواروں اور بھیم داس ولد راجہ بیٹھل داس گور اور دوسرے سرداروں کے ساتھ تھا، میمنہ قول پر راجہ جے سنگھ سیسودیہ اپنے بہادر راجپوت سواروں کے ہمراہ تھا۔

لشکر کا کیمپ مالوجی، پرسوجی اور راجہ دیبی سنگھ کی نگرانی میں تھا[1] کچھ مسلمان فوجی سردار بھی ضرور تھے، لیکن وہ انگشت بدنداں تھے کہ یہ دارا اور اورنگ زیب کی جنگ نہ تھی، بلکہ راجپوتوں اور اورنگ زیب کے اقتدار کی لڑائی تھی جنگ شروع ہوئی، لیکن اورنگ زیب کی سپاہانہ ہوش مندی اور جنگی بصیرت کے سامنے راجہ جسونت سنگھ طفل مکتب ثابت ہوا، راجہ جسونت کے ہراول کے راجپوت سوار اورنگ زیب کے لشکر پر یلغار کرنے کا تہیہ کر ہی رہے تھے کہ اورنگ زیب کے برق اندازوں اور تیر اندازوں نے گولوں اور تیروں کی اتنی بارش کی کہ راجپوت سوار بے لڑے گھوڑوں کی پیٹھ پر سے گرنے لگے، راجپوتوں نے یہ صورت دیکھی تو ان کے بہادر سرداروں میں کنند سنگھ ہاڈا، رتن راٹھور، دیال داس جھالا، ارجن گور، سبھان سنگھ سیسودیہ وغیرہ ''رام'' ''رام'' کے نعرے لگاتے ہوئے اورنگ زیب کے توپ خانے کی طرف بڑھے، اورنگ زیب کو راجپوت سواروں کی اس قومی خصوصیت کا احساس پوری طرح تھا کہ وہ مرنا جانتے تھے، لیکن لڑنا نہیں

[1] عالمگیر نامہ ص ۶۶ـ۶۱

جانتے، اس لیے ان سواروں کو اپنی توپوں کی طرف بڑھنے کا موقع دے دیا، اورنگ زیب کے توپچیوں نے ان کی یورش کو پہلے مضبوطی سے نہیں روکا اور راجپوت سواروں کا دل بادل اور بھی آگے بڑھتا چلا آیا اور جب ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں رہ گئی، اس وقت توپچیوں نے ان پر ضربیں لگانی شروع کیں اور وہ کٹ کٹ کر گرنے لگے، لیکن بہادری کے جوش میں اورنگ زیب کے ہراول تک پہنچ گئے، اورنگ زیب کے سارے لشکری پوری تنظیم اور ترتیب کے ساتھ تھے، راجپوت سوار جب بہت آگے بڑھ گئے تو اورنگ زیب نے اپنے لشکر کو ایک دستہ بھیج کر ان کو ان کی فوجوں کے بقیہ حصے سے بالکل منقطع کر دیا، راجہ جسونت نے ان کی مدد کو کمک بھیجنا چاہا، لیکن راستہ مسدود تھا، اورنگ زیب نے قول سے بڑھ کر اپنی فوج کی ایک اور دیوار حائل کر دی، پھر قول کے میمنہ اور میسرہ کی فوج نے بھی پیش قدمی کر کے راجپوت سواروں کو گھیر لیا جواب موت کے منہ میں جا پڑے تھے اور ان کے لیے ہلاکت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا، ان کے خون سے ساری سرزمین لالہ زار ہو گئی، مکند سنگھ ہاڈا اور اس کے ہمراہی سردار ایک ایک کر کے ہلاک ہو گئے اور جسونت سنگھ ان کی مدد کو کوئی کمک نہ بھیج سکا، راجپوتوں کو اس طرح لقمۂ اجل بنتا دیکھ کر دوسرے راجپوت سردار مثلاً رائے سنگھ سیسودیہ، سجان سنگھ بندیلہ اور امر سنگھ چندراوت وغیرہ پر سراسیمگی طاری ہوئی اور انھوں نے میدان جنگ چھوڑ کر اپنے وطن کا رخ کیا، مگر قول میں راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راٹھور راجپوتوں کے ساتھ برابر لڑ رہا تھا، لیکن مراد بخش نے اپنی سپہ گری سے پہلے تو دیوی سنگھ بندیلہ کو پسپا کر دیا، پھر راجہ جسونت سنگھ کے قول کے بائیں بازو پر حملہ کر کے اس کے سواروں کو منتشر کر دیا، اس اثناء میں اورنگ زیب نے سامنے سے، مراد نے بائیں طرف سے اور صف شکن نے دائیں جانب سے بڑھ کر راجہ جسونت سنگھ کے راٹھور سواروں کو اپنے حلقہ میں لے لیا، لیکن اس کے ہمراہی سرداروں میں اسکرن، مہیش داس گور اور گوردھن نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کو میدان جنگ سے باہر کر دیا اور اس نے بہادر راجپوتوں کی لاشوں کا ایک انبار چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کی راہ لی۔[1]

راجپوتوں کے تمام جانباز اور بہادر سردار دارا کی محبت میں ہلاک ہوئے، اس کی تحت

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۷۵-۶۶، منتخب اللباب جلد ۲ ص ۱۸-۱۷-۱۶

نشینی میں راجپوتوں نے خواب کا ایک قلعہ تیار کرلیا تھا، لیکن دھرماوت۔ کے میدان میں یہ خواب خواب ہی رہا، جس سے تمام راجپوتوں کو انتہائی اذیت پہنچی، راجہ جسونت سنگھ جب اپنے وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس دکھ اور غم میں کہ وہ ایک لڑائی ہار کر آیا ہے، اس کا منہ دیکھنا پسند نہ کیا۔

اس کے بعد سموگڈھ کے میدان میں دارا نے اورنگ زیب۔ کے مقابلہ میں پھر ایک بار قسمت آزمائی کی اور راجپوتوں نے دارا کو تخت پر بٹھا کر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی پھر کوشش کی، چنانچہ ان کے جتنے آزمودہ کار اور نامور فوجی سردار تھے مثلاً چھترسال ہاڈا، راجہ روپ سنگھ، بیرم دیو سیسودیہ، گردھر (راجہ بیٹھلداس کا بھائی) بھیم (راجہ بیٹھل اس کا لڑکا) راجہ شیورام گور، رام سنگھ راٹھور، راجہ کشن سنگھ، پرتھی راج، مہا سنگھ بھدوریہ، رام سنگھ اور کیرت سنگھ وغیرہ ل سب اکٹھے ہوئے، ان میں چھترسال ہاڈا اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی میں تمام راجپوتوں میں ضرب المثل تھا، وہ پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑ چکا تھا، اس کو اپنی اور اپنے سواروں کی جنگی کارگذاریوں پر بڑا ناز تھا، چنانچہ جنگ شروع ہوئی تو ہراول سے چھترسال ہاڈا اپنے سواروں کو لے کر صفوں کو چیرتا پھاڑتا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچا، ان راجپوتوں میں راجہ رام سنگھ راٹھور کو اپنی نبرد آزمائی کا بڑا پندار تھا، وہ زعفرانی رنگ کا لباس اور مروارید کا ہار پہن کر اس نشہ میں مست آیا تھا کہ مراد اور اورنگ زیب کو شکست دے کر راجپوتوں کی شجاعت کا سکہ جمائے گا، چنانچہ غیظ وغضب میں آگے بڑھتا ہوا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچ گیا اور چلایا کہ تو دارا کے مقابلہ میں بادشاہی کی ہوس رکھتا ہے اور مراد پر برچھے کا وار کر کے مہاوت سے ہاتھی بٹھانے کو کہا، لیکن مراد پر کسی قسم کا ہراس طاری نہ ہوا اور راجہ رام سنگھ پر ایسا تیر مارا کہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا، راجپوت سواروں نے اپنے ایک نامی سردار کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھ کر پورا جنگی زور صرف کردیا، لیکن مراد ان سب پر غالب آیا اور حملہ میں اتنے راجپوت کام آئے کہ ساری زمین رنگین ہوگئی، اورنگ زیب قول سے مراد کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا کہ تمام راجپوت اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور انھوں نے اورنگ زیب کو ہلاک کرنے میں طیش، تہور اور غیض وغضب کا اظہار کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ میں یاد رہے گا، راجپوتوں نے پوری قوت کے ساتھ اورنگ زیب پر حملہ

ل عالمگیر نامہ ص ۹۶۔۹۵

کیا، راجہ روپ سنگھ تو جوش غضب میں گھوڑے کی پیٹھ سے اتر پڑا اور اورنگ زیب کے ہاتھی کے پاس پہنچ کر ہودج کی ڈوری کاٹ کر اورنگ زیب کو زمین پر گرانا چاہا، جوہر شناس اورنگ زیب اس کی اس جرأت اور جلادت سے بہت متاثر ہوا اور اپنے سپاہیوں کو اس کو زندہ گرفتار کرنے کی ہدایت کی، لیکن اس کی قضا آچکی تھی، اس لیے اورنگ زیب کا ایک ہم رکاب نے اس کو لقمۂ اجل بنا دیا، اس کے بعد راجہ ستر سال ہاڈا آگے بڑھا، لیکن اورنگ زیب کی جرأت اور پامردی کے سامنے اس کی بہادری بھی بے کار ثابت ہوئی اور راجپوتوں کے تمام نامور سردار مثلاً ستر سال ہاڈا، بھرت سنگھ، موکم سنگھ، رام سنگھ راٹھور، بھیم سنگھ گور، شیورام گور وغیرہ ایک ایک کر کے مارے گئے[1]۔

دھرمادت اور سموگڈھ کی لڑائیوں میں راجپوت جس طرح اورنگ زیب کی جان کے گاہک بن کر لڑے، اس کی بنا پر راجپوتوں کے خلاف اورنگ زیب کے دل میں جتنا بھی میل بیٹھتا کم تھا، لیکن اورنگ زیب کو ہندوستان جیسے بڑے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں پر حکومت کرنی تھی، اس لیے اس نے راجپوتوں سے اپنا دل صاف کرنے کی عملی کوشش کی، سموگڈھ کی لڑائی کے بعد راجہ جسونت سنگھ، راجہ جے سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اس کو جو کل تک اس کا سب سے بڑا دشمن تھا، معاف کر کے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اسی زمانہ میں شہزادہ شجاع بنگال سے اپنی فوج لے کر آگرہ کی طرف کوچ کر رہا تھا، اورنگ زیب نے اپنے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کو ایک لشکر کے ساتھ شجاع کے مقابلہ کے لیے بھیجا، وہ کوڑا جہان آباد میں مقیم تھا کہ اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو راجپوتوں کے ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کی مدد کے لیے روانہ کیا، اس کے بعد خود بھی پہنچا اور جب کھجوہ میں جنگ شروع ہوئی، تو اورنگ زیب کے پاس نوے ہزار

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۳ پر ہے "راؤ ستر سال و دیگر عمدہ ہائے اجھوتان کہ در رتکاپ این فتنه و پیکار اعتضاد استظہار شان بانہا بود و بااعتماد شہامت و پایداری آن بلادت کیشان جہالت منش طریق فسادی راہ اعتناد می پیمود ..... نیز دیکھو منتخب اللباب جلد ۲ ص ۲۹۔۳۶

سوار تھے[1] راجہ جسونت سنگھ کو دس ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ برانغار میں متعین کیا گیا، دوسرے راجپوت سرداروں کے نام جو اس جنگ میں مختلف بازووں پر تھا، یہ ہیں:

مہیش داس راٹھور، بلوے چوہان، رام سنگھ، ہر رام راٹھور، کشور سنگھ ہاڈا، سجان سنگھ، راجہ رائے سنگھ سیسودیہ، سبل سنگھ سیسودیہ، سندر داس سیسودیہ، راجہ چتر من جادون، کنور رام سنگھ ہاڈا، امر سنگھ ہاڈا، چندر راوت، جگت سنگھ ہاڈا، سورج مل کور، فتح سنگھ کچھواہہ، راجہ اندرمن دھندیر، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ پرم داس سیسودیہ، چتر بھیج، اندرمن بندیلہ، کشن سنگھ، چندراوت، بھگوت سنگھ ہاڈا، بھدوریہ، روپ سنگھ راٹھور، کیسری سنگھ بھوریہ، رائے سنگھ راٹھور، رگھوناتھ سنگھ، سوبھکرن بندیلہ وغیرہ[2]۔

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ کے دل سے دھرمادت اور سموگڈھ کی لڑائیوں کا اثر اور راجپوتوں سے غصہ اور عناد ول سے بالکل نکل گیا تھا اور اس نے ان کو اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھ کر اور ان پر پورا بھروسہ کر کے لڑائی میں شریک کر لیا، کھجوہ کے میدان میں ایک رات پہلے فوجوں کی صف آرائی ہو گئی تھی اور سواروں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی مقررہ جگہوں سے نہ ہٹیں، اگر آرام کرنے کے لیے اپنے گھوڑوں سے اتریں بھی تو مسلح رہیں، تمام فوجی سرداروں صفوں کی ترتیب اور اس کا نظام درست کرنے میں رات بھر ادھر ادھر گشت کرتے رہے، اورنگ زیب ضروری ہدایتیں دے کر تہجد پڑھ رہا تھا کہ کیمپ میں یکایک شور ہوا اور فوج میں انتشار پھیل

---

[1] عالمگیر نامہ میں ان سواروں کا ذکر اس طرح ہے: "درآں روز از کثرت سپاه وجوش لشکر آثار شور محشر ہویدا بود و از غبار سم ستور و وفور مواکب منصور چهرۂ آسمان و روے زمیں ناپیدا لشکری آراستہ و رنگین چوں خیل سبزہ رہا توگفتی از زمین می جوشید و جیشے پر قہر و طیش مانند امواج بحر مواج از شورش کیں می خروشید زمیں باہمہ تحمل و سخت جانی از حمل گرانی آن خیل انبوہ ستودہ بود..... جلد ا ص ۲۵۰

[2] عالمگیر نامہ جلد ا ص ۲۴۸ ـ ۲۴۹

گیا، لشکروں کو خیال ہوا کہ غنیم گھس آیا، لیکن پتہ چلا کہ جسونت سنگھ نے غداری کی اور فوج میں انتشار پھیل گیا، لشکریوں کو خیال ہوا کہ غنیم گھس آیا، لیکن پتہ چلا کہ جسونت سنگھ نے غداری کی اور شجاع سے مل کر اپنے تمام راجپوت سواروں کے ساتھ شہزادہ سلطان کے کیمپ کو لوٹ رہا ہے، اس غارت گری اور لوٹ مار میں جو بھی حائل ہوا، راجپوتوں نے اس کو تہ تیغ کر دیا اور کیمپ کا سارا ساز و سامان، مال و اسباب اور مویشیوں کو لوٹ کر بالکل جھاڑ و پھیر دی اور کیمپ کے ایک اہم حصہ کو تباہ و برباد کر کے اپنے گھوڑوں کی باگ اپنے اپنے گھروں کی طرف موڑ دی، راجپوتوں کو یقین تھا کہ اس کے بعد اورنگ زیب کا شکست کھانا لازمی ہے، لیکن اورنگ زیب کا صبر و تحمل اور جنگی تدبر کام آیا، جسونت سنگھ کی غداری کی خبر اس کو مصلے پر ملی تھی، تہجد کی نماز اطمینان سے ختم کرنے کے بعد لشکر میں آ کر لشکریوں کو ڈھارس دلائی کہ الحمد للہ اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہو گئی اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں اور واقعی تائید ایزدی اس کے ساتھ تھی، کیوں کہ اس جنگ میں بھی وہ فاتح اور کامران رہا[1] راجہ جسونت سنگھ کو اورنگ زیب کے کیمپ کی لوٹ میں جو دولت ملی، اس سے راجپوتوں کی فوج تیار کر کے دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی، دوبارہ شکست کھا کر ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا، اس کو یاس و نا امیدی کے اس بادل میں جسونت سنگھ کی دعوت میں امید کی کرن نظر آئی اور وہ ۲۲ ہزار سوار لے کر جسونت سنگھ کے پاس روانہ ہوا، اب اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کی مفسدانہ کارروائیوں کے خلاف سخت اقدام کرنا پڑا، اس نے محمد امیر خان کی نگرانی میں دس ہزار کا ایک لشکر مرواڑ بھیجا، جب یہ لشکر مرواڑ کی سرحد میں پہنچا تو جسونت سنگھ منڈور سے بھاگ کر سیوانہ کے پہاڑی قلعہ میں چھپ گیا، اس وقت راجہ مان سنگھ کے پرپوتے مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ نے اس کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ راجپوتوں کا خون بہانے سے کیا فائدہ، تم خود بھی برباد ہو جاؤ گے اور ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی رہے گی، اگر اب بھی تم اپنی روش سے باز آ جاؤ تو اورنگ زیب سے تمہاری خطائیں معاف کرائی جا سکتی ہیں[2] جسونت سنگھ کی عقل میں بھی بات آ گئی، اس لیے وہ دارا شکوہ کی مدد سے باز آ گیا، اس سلسلہ میں جدوناتھ سرکار نے راجہ جسونت سنگھ کے بارہ میں لکھا ہے کہ ایک اعلیٰ منصب اور اعلیٰ شہرت کے راجپوت نے اپنے وعدے کا ایفا نہیں کیا، اس جنگ نشینی

1. عالمگیر نامہ ص ۵۶-۲۵۵- خافی خان جلد ۲ ص ۵۳ 2. عالمگیر نامہ ص ۳۱۰

میں شریک ہونے والے تمام افراد میں جسونت سنگھ کی شہرت بہت ہی بری رہی ہے، وہ ایسی لڑائی میں میدان چھوڑ کر بھاگا جب وہ سردار تھا اور غداری کر کے ایک دوست کے کیمپ پر حملہ کیا اور پھر اپنے حلیف کو چھوڑ کر اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا، خصوصاً جب اس کو خطرے میں لے آیا تھا، وہ آدمی بہت ہی بدنصیب تھا، جس نے مرواڑ کے راجہ اور راٹھور راجپوتوں کے سردار مہاراجہ جسونت سنگھ پر بھروسہ کیا[1]۔

لیکن اورنگ زیب آخر آخر وقت تک راجہ جسونت سنگھ پر اعتماد کرتا رہا، دارا کی موت کے بعد جسونت سنگھ کو اس کے ضمیر نے کوئی ملامت نہیں کی اور وہ بلا تکلف اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوگیا اور اورنگ زیب نے بھی اس کی تمام خطاؤں سے چشم پوشی کی اور اس کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن جسونت سنگھ کے دل میں اپنے فراخ دل آقا کے لیے کبھی کوئی نرمی اور محبت پیدا نہیں ہوئی، اس لیے جب ۶ جلوس سیواجی کے خلاف ایک مہم پر بھیجا گیا تو پھر غداری کا ثبوت دیا، اورنگ زیب نے آزردہ ہو کر اس کی جگہ راجہ جے سنگھ کو مامور کیا، اس مہم میں راجہ جسونت سنگھ کا سالا راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا بھی اس کے ساتھ تھا جسونت سنگھ نے اس کو بھی اورنگ زیب کے خلاف سازش میں شریک کرنا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا، تو جسونت سنگھ نے اپنی بیوی (یعنی راؤ بھاؤ سنگھ کی بہن) کو ملا کر اس پر دباؤ ڈالنا چاہا، لیکن راؤ بھاؤ سنگھ نے اپنے دامن پر نمک حرامی کا داغ لگنے نہ دیا[2]۔

مگر اس کے بعد بھی جسونت سنگھ اورنگ زیب کی نظروں سے نہیں گرا، ۹ جلوس میں شاہزادہ معظم کے ساتھ کابل بھیجا اور ۱۰ جلوس میں دکن کی مہم میں تعینات کیا گیا اور ۱۴ جلوس میں جمرود (مضافات کابل) کی حکومت پر سرفراز کیا گیا اور یہیں وہ مرا[3]۔

راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مخالفانہ روش کی جو آنکھ مچولی کھیلی اور اورنگ زیب نے رواداری اور عفو و درگذر کا جو نمونہ پیش کیا اس کی مثال کم ملے گی، لیکن جسونت سنگھ کی روح موت کے بعد بھی اورنگ زیب کے سر پر منڈلاتی رہی، اس نے کوئی

---

[1] اورنگ زیب از جدو ناتھ سرکار جلد ۲ ص ۱۷۰ [2] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۳۰۶

[3] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۶۰۳

اولاد نہیں چھوڑی تھی، اس لیے اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کے بھتیجے راجہ اندر سنگھ کو مرواڑ کا رانا بنایا، لیکن جیسا کہ ایسر داس نے فتوحات عالمگیری میں لکھا ہے کہ مرواڑ کے راجپوت فساد برپا کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے، اس لیے راجہ جسونت سنگھ کی موت کے بعد راٹھور راجپوتوں نے خبر دی کہ راجہ کی دو رانیاں حاملہ ہیں، پھر دو بچوں کی ولادت کا بھی اعلان کیا، اورنگ زیب جانتا تھا کہ یہ بچے فرضی ہیں [۱] پھر بھی ان کو اپنی تولیت میں لینا چاہتا تھا، لیکن راٹھور راجپوت راضی نہ ہوئے اور اودے پور کے مہارانا نے بھی ان کی حمایت میں باغیانہ فضا پیدا کر دی، اس لیے اورنگ زیب کو مجبوراً ان کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑی، اس فوج کشی میں شہزادہ اکبر کے ساتھ ہاڈا راجپوت سرداروں کے علاوہ خود راٹھور راجپوت سردار بھی شریک تھے، جس کو جدو ناتھ سرکار نے بھی تسلیم کیا ہے [۲] اس مہم میں راجپوتوں نے شہزادہ اکبر کو سبز باغ دکھا کر اورنگ زیب سے توڑ لیا، لیکن اورنگ زیب کا تدبر اس موقع پر بھی کام آیا اور راجپوتوں کو پسپا ہونا پڑا، بیکانیر کے راجہ شیام سنگھ نے بیچ بچاؤ کیا اور اودے پور کے رانا جے سنگھ کو شہزادہ محمد اعظم کی خدمت میں لا کر حاضر کیا، جب شہزادہ رانا کو لے کر اورنگ زیب کے پاس پہنچا تو اورنگ زیب نے اس کو امتیازی جگہ پر بٹھایا اور خلعت، شمشیر مرصع، جمدھر، پھول کٹارہ، گھوڑا مع ساز طلاء، ہاتھی مع ساز نقرہ عطا کر کے پنج ہزاری سوار کے اعزاز سے نوازا اور اس کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز کیا [۳]۔

مہارانا جے سنگھ کے دو بھائی راجہ بھیم سنگھ اور راجہ اندر سنگھ بھی اورنگ زیب کے دامن دولت سے آخر آخر وقت تک وابستہ رہے، ۳۸ سال جلوس میں بھیم سنگھ پنج ہزاری منصب پر پہنچ کر مرا، اندر سنگھ ۴۸ سال جلوس میں سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا۔

جودھپور اور جے پور کے راجپوتوں نے جسونت سنگھ کے فرضی لڑکے اجیت سنگھ کے لیے تو شورش برپا کی، لیکن جب اودے پور کے رانا نے اورنگ زیب سے صلح کر لی تو پھر اس کو جنگلوں اور پہاڑوں میں آوارہ گرد ہونے کے لیے چھوڑ دیا، وہ ایک عرصہ دراز تک غارت گری اور خون

---

[۱] جدو ناتھ سرکار نے ان بچوں کے فرضی ہونے اور نہ ہونے پر اپنی کتاب اورنگ زیب جلد ۳ ص ۳۵۱ پر بحث بھی کی ہے۔

[۲] اورنگ زیب جلد ۳ از جدو ناتھ سرکار ص ۳۴۱ [۳] مآثر عالمگیری ص ۲۰۸

ریزی کرتا رہا، عالمگیر کے بعد جب وہ بہادر شاہ کے دربار میں نادم ہو کر پہنچا، تو بہادر شاہ نے اس کو سہ ہزاری منصب سے نوازا، لیکن وہ اپنی مفسدانہ سرشت سے باز نہیں آیا اور ایک لا ابالی زندگی بسر کرنے کے بعد فرخ سیر کے عہد میں اپنی لڑکی کا ڈولا اس کے پاس بھیج کر پھر شاہی نوازشوں کا خواستگار رہا، ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ کو نہایت دھوم دھام سے یہ شادی انجام پائی، یہ آخری راجپوت لڑکی تھی جو مغل حرم میں داخل ہوئی، یہ لکھ کر صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ راجپوتوں کے تعلقات مغل دربار سے آخر آخر وقت تک بہت زیادہ کشیدہ نہ رہے تھے، جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے راجپوتوں کو اپنی روش سے حکومت سے بالکل دور کر دیا تھا، یہ اور دوسری مثالوں سے بھی ثابت ہوگا۔

اجیت سنگھ کی جانشینی کا فتنہ و فساد برپا کرنے میں درگا داس راٹھور کا بڑا حصہ رہا، وہ راجہ جسونت سنگھ کے وزیر اسکرن کا لڑکا تھا، اسی نے سازش کر کے شہزادہ اکبر کو اورنگ زیب سے توڑا، اور شہزادہ اکبر کے نوزائیدہ بچے بلند اختر کو ایک عرصہ تک اپنے قبضہ میں کیے رہا، تاکہ اورنگ زیب سے بڑی سے بڑی رعایتیں حاصل کرے، وہ ۴۳ سال جلوس میں نادم ہو کر شجاعت خان ناظم احمد آباد کے توسل سے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوا، یہ گویا اس کا اعتراف جرم تھا لیکن اورنگ زیب سے اس کی یہ اہانت دیکھی نہ گئی اور اس نے اس کے ہاتھ کھلوا دیے اور خلعت اور جمدھر مرصع عطا کر کے منصب سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار سے بھی نوازا۔[1]

راٹھور راجپوتوں کے لیے اورنگ زیب کا دل بڑا ہی نرم اور گداز تھا، راجہ سنگھ کا خسر پرم دیو سسودیہ سموگڈھ کی لڑائی میں اورنگ زیب کے خلاف تھا، لیکن جب اورنگ زیب سے آکر ملا تو اس نے اس کا پورا اعزاز و اکرام بدستور سابق قائم رکھا اور برابر خلعت فاخرہ اور شاہی الطاف سے نوازتا رہا، وہ دکن میں متعین تھا، پھر راجہ رام سنگھ کچھواہہ کے ساتھ آسام کی مہم پر بھیجا گیا ۱۲۰ سال جلوس میں متھرا کا فوجدار مقرر ہوا اور یہیں انتقال کیا۔[2]

بیان کیا جا چکا ہے کہ سموگڈھ میں راجہ روپ سنگھ راٹھور نے اپنی جان کی بازی لگا کر

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۹۵

[2] عالمگیر نامہ ص ۲۱۳ ـ ۲۲۵ ـ ۲۳۷ ـ ۲۶۲ ـ ۱۰۰۰ ـ ۱۰۳۶ و مآثر عالمگیری ص ۸۳

اورنگ زیب کی جان لینے کی کوشش کی تھی، گو وہ ہلاک ہوا، مگر اورنگ زیب کو افسوس رہا کہ ایسا پُر جوش اور جری راجپوت سردار مارا گیا، لیکن جب اس کا لڑکا مان سنگھ عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو اس کو بے شمار شاہی عنایتوں سے نوازا اور ہزار و پانصدی و ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا[۱]۔ اور پھر ترقی کر کے سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا، راجہ روپ سنگھ، مہاراجہ جسونت سنگھ کا چچازاد بھائی تھا، یہ خاندان عالمگیر سے اور زیادہ قریب تر ہو گیا، جب چوتھے سال جلوس میں راجہ روپ سنگھ کی ایک لڑکی شہزادہ محمد معظم سے بیاہی گئی اور یہ شادی نہایت تزک و احتشام اور دھوم دھام سے انجام پائی، جس کی پوری تفصیل عالمگیر نامہ (ص ۳۴ـ۶۳۹) میں درج ہے، شہزادہ محمد کام بخش کی شادی بھی ایک راجپوت خاندان میں ہوئی، یہ شہزادی منوہر پور کے راجہ امر چند کی بیٹی اور جگت سنگھ کی بہن تھی، یہ شادی عالمگیر کے چوبیسویں سال جلوس میں ہوئی[۲]۔

یہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ راجہ چھتر سال ہاڈا داراشکوہ کی معیت میں سوگڈھ کی لڑائی میں اس جذبہ کے ساتھ شریک ہوا تھا کہ اس کے نیزہ کی انی پر اورنگ زیب کا سر ہوگا، لیکن وہ خود مارا گیا اور جب اس کا لڑکا بھاؤ سنگھ ہاڈا اورنگ زیب کے پہلے سال جلوس میں دربار میں حاضر ہوا، تو اورنگ زیب نے اس کو علم و نقارہ اور خطاب راؤ کے ساتھ سہ ہزاری ذات دو ہزاری سوار کا منصب عطا کیا اور علاقہ بوندی جاگیر میں دیا، وہ اورنگ زیب کے ساتھ شجاع کی لڑائی میں شریک رہا، پھر دکن میں متعین ہوا، ۳ جلوس میں چاکنہ کی مہم میں جانبازی سے لڑا، راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ شیواجی کے خلاف بھی معرکہ آرا ہوا، ۹ میں چاندہ کے زمینداری کی تادیب کے لیے بھی گیا، اس کے بعد اورنگ زیب آباد میں مامور ہوا اور یہیں اورنگ زیب نے اکیسویں سال جلوس میں وفات پائی[۳]۔

مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ بھی شروع میں داراشکوہ کا حلیف رہا، لیکن جب اورنگ زیب سے آ کر ملا تو اس نے بڑے احترام سے اس کا خیر مقدم کیا اور ایک کروڑ دام کی مالگذاری کا محال عطا کیا، سنہ ۷ جلوس میں سیواجی کے خلاف مہم پر بھیجا گیا، تو چودہ ہزار سوار اس کے ساتھ گئے اور

[۱] مآثر عالمگیری ص ۸۴ [۲] مآثر عالمگیری ص ۲۱۰

[۳] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۷ـ ۳۰۵

دوسرے فوجی سردار دلیر خاں، داؤد خاں، احتشام خاں اور زبردست خاں اس کے ماتحت بنائے گئے، راجہ جے سنگھ کے ساتھ اور بھی راجپوت سوار تھے، ان میں سے بعض کے نام ہیں، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، راجہ رائے سنگھ سسودیہ، پورن مل، کیرت سنگھ لے اس مہم میں راجہ جے سنگھ نے جو خدمت انجام دی اس کے صلہ میں اس کو اس کے منصب میں دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کی ترقی دے کر منصب ہفت ہزاری ذات ہفت ہزار سوار دو اسپہ پر مامور کیا گیا ۲ ۹ جلوس میں راجہ بیجا پور کی مہم میں روانہ کیا گیا اور واپسی میں اورنگ آباد پہنچ کر ۱۰۷۷ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، اورنگ زیب کو اس کی موت کی خبر ملی تو اس کو بڑا رنج ہوا، وہ اس کے حسن تدبیر، سنجیدگی فکر، سپہ گری اور فوجی قیادت کا بڑا مداح تھا، مسلمان مورخین نے بھی اس کے اوصاف کی تعریف کی ہے، مآثر الامراء میں ہے کہ:

"بامزاج زمانہ شناسا وباندیشہ و وقت آشنا فراہم داشت، ازیں جاست کہ از ابتدایے دولت تا انتہایے زندگی بآبرو بسر بردہ۔" (ج ۳ ص ۵۷۷)

اس کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اس کے بیٹے کنور رام سنگھ کو راجہ کے خطاب اور دوسری شاہانہ عنایتوں سے نوازا، گو یہ بھی سموگڈھ میں دارا شکوہ کے ساتھ تھا، لیکن جب باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا تو خلعت وانعام سے سرفراز کیا گیا، راجہ جے سنگھ جب سیواجی کو عالمگیر کے دربار میں لایا تو اس کی قیام گاہ کی نگرانی رام سنگھ ہی کے ذمہ کی گئی، لیکن اس کی چشم پوشی کی وجہ سے شیواجی آگرہ سے فرار ہو گیا، جس سے اورنگ زیب کو بڑا دکھ پہنچا اور اس کو منصب سے معطل کر کے دربار میں آنے کی ممانعت کر دی، لیکن راجہ جے سنگھ کی موت پر اورنگ زیب نے رام سنگھ کا قصور معاف کر دیا اور دربار میں بلا کر اس کو راجہ کا خطاب عطا کرتے وقت خلعت مع جمدھر مرصع، شمشیر مع ساز مرصع اسپ عربی مع ساز طلا فیل مع جل زربفت وساز نقرہ مرحمت کیا اور چہار ہزاری ذات چہار ہزار سوار کے منصب سے سرفراز کیا اور اس کے باپ کی کل جاگیر بھی دے دی،

لے منتخب اللباب حصہ دوم ص ۱۷۸ ۲ مآثر عالمگیری ص ۵۱

وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے پنج ہزاری ذات پنج ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ تک پہنچا[۱]۔ راجہ جے سنگھ کا چھوٹا بیٹا کیرت سنگھ بھی اورنگ زیب کے ساتھ اپنی زندگی کے آخر تک وابستہ رہا، وہ سہ ہزاری ذات دو ہزار پانصد سوار کے منصب تک پہنچ کر ۱۰۸۳ھ میں دکن میں مرگیا۔

جے سنگھ کے پر پوتے بجے سنگھ کو ترقی و عروج کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اورنگ زیب ہی کا ہاتھ ہے، وہ راجہ بشن کا بیٹا تھا، ۴۴ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اس کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور ہزار پانصد ذات ہزار سوار کا منصب دے کر راجہ سنگھ کے خطاب سے نوازا اور وہ دھیراج راجہ سنگھ سوائی کے لقب سے تیموری بادشاہوں کے آخری دور میں نہایت ممتاز اور اہم ارکان سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا، ۴۵ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اس کو عمدۃ الملک اسد خاں کے ساتھ قلعہ کھیلنا کی تسخیر کے لیے بھیجا، تو اس نے اورنگ زیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی نوجوانی میں بڑی جانبازی اور دلیری کا ثبوت دیا اور قلعہ فتح ہونے کے بعد اورنگزیب نے اس کی کارگذاری کے صلہ میں اس کے منصب میں اضافہ کیا اور پھر وہ برابر ترقی کرتا گیا[۲]۔

عالمگیر کے چھوٹے چھوٹے راجپوت فوجی منصب داروں کی بڑی لمبی فہرست ہے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

راجہ اودت سنگھ (زمیندار اوندچھ، دو ہزاری پانصدی ہزار پانصد سوار) راجہ دیبی سنگھ بندیلہ (دو ہزار پانصدی و پانصد سوار) بکرم سنگھ گوالیاری (دو ہزاری پانصد سوار) رام چندر سنگھ (سہ ہزاری) پاسدیو سنگھ (جندن کراکا زمیندار، سہ ہزاری) سو بھکرن بندیلہ دو ہزاری ہزار صد سوار بشن سنگھ (ہزاری و چار صد سوار) سروپ سنگھ (یک ہزاری) رگھناتھ سنگھ راٹھور (ہزار و پانصدی شش صد سوار) راجہ کلیان سنگھ (بھدا ور کا زمیندار ہفت صدی) وغیرہ[۳]۔

اورنگ زیب راجپوتوں کو ہمیشہ حکومت اور فوج کا ضروری جزو سمجھتا رہا اور اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں راجپوت سرداروں کی نگرانی میں لشکر بھیجنے میں بالکل تامل نہ کرتا تھا،

---

۱ مآثر الامراء جلد ۲ ص ۳۔۳۰۱ ۲ مآثر الامراء ص ۸۱۔ خافی خان ص ۴۹۹

۳ عالمگیر نامہ کے شروع میں جو انڈکس ہے اس سے بھی عالمگیر کے راجپوت وابستگان دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مآثر عالمگیری میں ہے:

"عادل خاں بیجاپوری پیش کش ادا کرنے میں سستی سے کام لیتا تھا اور سیواجی کو مدد دینے میں کوشش کرتا تھا، ایک فرمان راجہ جے سنگھ کے نام صادر ہوا کہ سیوا کے مقبوضات اور قلعوں کا بخوبی انتظام کر کے فوراً بیجاپور پر دھاوا کرو، قلعہ کے محاصرہ میں ایام گزاری سے پرہیز کر کے جلد از جلد لشکر مخالف کو تباہ اور برباد کر دو۔[1]"

اور خود راجپوتوں کو بھی اورنگ زیب کی حمایت میں ہندوؤں کے خلاف معرکہ آراء ہونے میں کوئی تامل نہ تھا، آسام والوں نے ۱۰ سال جلوس میں بغاوت کی، تو اس کی سرکوبی کے لیے راجہ رام سنگھ کو بھیجا گیا اور اس کے ساتھ دوسرے راجپوت سردار کبیر سنگھ بھورتیہ، رگھناتھ سنگھ اور بیرم دیو سنگھ سسودیہ بھی تھے، جن کے ماتحت راجپوت اور مسلمان سوار دونوں تھے اور یہ بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ راجپوت اپنی کارگذاری کے صلہ میں عالمگیر کے آخر وقت تک شاہی انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہے، چناں چہ ۳۸ سال جلوس کے ذکر میں مآثر عالمگیری میں ہے:

"اودے سنگھ قلعہ دار سنگر لناسہ ہزاری دو صد سوار کا امیر تھا، اسے اضافہ مشروط و بلا شرط پانصدی سی صد سوار عطا ہوا۔"

درگا داس راٹھور کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ عالمگیر کی شاہی ملازمت چھوڑ کر علحدہ ہو گیا تھا، لیکن ۳۹ سال جلوس میں اس کے دربار میں آیا تو اس کو پھر سہ ہزاری دو ہزار سوار کا نصب عطا کیا گیا۔

۴۹ سال جلوس میں اورنگ زیب کی فوج نے جنجی کے مرہٹہ راجہ رام کے خلاف فوج کشی کی تو اس مہم میں راجپوت سردار بھی سرفروشی اور جانبازی سے لڑے، راؤ دلپت رائے بندیلہ ایک لشکر جرار کے ساتھ اس معرکہ میں شریک تھا، مآثر عالمگیری میں ہے کہ اس معرکہ میں راؤ دلپت رائے بندیلہ کے اکثر ہمراہیوں نے بہادرانہ جنگ کے بعد اپنی جان دی اور زخمی ہوئے، پھر اسی معرکہ میں رام سنگھ ہاڈا راج گڈھ کے قلعہ کے اوپر جس جرأت کے ساتھ چڑھا ہے، وہ ایک اہم

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۱

کارنامہ ہے، فتح کے بعد اورنگ زیب نے راؤ دلپت رائے بندیلہ اور رام سنگھ بندیلہ دونوں کو بطور انعام مناصب عطا کیے ۱۔

راجپوتوں نے مرہٹوں کے خلاف بھی اورنگ زیب کی حمایت میں جنگ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ سیواجی کے خلاف راجہ جے سنگھ نے راجپوت سرداروں اور سواروں کے ساتھ قیادت کی تھی، خود مرہٹے بھی اورنگ زیب کی حکومت اور فوج کے معزز سردار رہے، سیواجی کا داماد اچلاجی سیواجی سے ٹوٹ کر اورنگ زیب کا حامی اور طرف دار بن گیا تھا، وہ ۲۹ سال جلوس میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا، سیواجی کے لڑکے سنبھاجی کا نوکر ماکوجی بھی اورنگ زیب سے مل گیا تھا اور ۳۱ سال جلوس میں منصب دو ہزاری سے سرفراز کیا گیا، سیواجی کا بھتیجا ارجوجی بھی اورنگ زیب کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا اور کانھوجی سرکیے تو اورنگ زیب کے آخری سال حکومت میں شش ہزاری منصب دار ہو کر اس کے دربار کا معزز امیر اور فوجی سردار ہوا۔

یہ مضمون طویل ہو رہا ہے، اس لیے مرہٹے سواروں نے اورنگ زیب کی فوج میں جو قابلِ قدر خدمت انجام دی، اس کو سر دست قلم انداز کیا جاتا ہے، لیکن اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ سواروں کے لیے جو گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے، ان کی افزائشِ نسل اور دیکھ بھال کے لیے کیا کیا اہتمام ہوتا تھا۔

عام طور سے چھ قسم کے گھوڑے فوج میں استعمال کیے جاتے (۱) عراقی (۲) ترکی (۳) یابو (۴) تازی (۵) جنگلہ (۶) مجنس ان میں یابو کابل سے آتے تھے، تازی اور جنگلہ ہندوستانی نسل کے گھوڑے تھے، مجنس شاید ایرانی نسل کے گھوڑے ہوتے تھے، اکبر نے عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں بڑھانے کے لیے پوری کوشش کی اور جہانگیر کے بیان کے مطابق اس کو اس میں کامیابی ہوئی اور عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں خاطر خواہ طریقہ پر بڑھی ۲۔

ہر منصب دار کو اپنے منصب کے لحاظ سے ہر قسم کے گھوڑوں کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی، مثلاً ہزاری منصب دار کو کم از کم ۶۸ عراقی، ۶۸۰ مجنس، ۱۳۶۰ ترکی، ۱۳۶۰ یابو اور ۱۳۶

۱۔ مآثر عالمگیری ص ۵۰۵ ۲۔ تزک جہانگیری ص ۳۰۱

جنگ رکھنا پڑتا تھا، اس طرح دو بیستی کو ایک عراقی، دو مجنس، دو ترکی، ایک تازی اور ایک یابو رکھنا ہوتا تھا۔[۱]

جنگی گھوڑے پورے اہتمام کے ساتھ آراستہ پیراستہ کیے جاتے، ان کے مختلف ساز و سامان کے نام یہ ہیں: زین، ازتنگ، ارتک، گجم، مجمعہ بند و پایے بند، اورنگ جیت پنبہ، پال پوش، جل، رومال چشمین، بگس ران، پشت تنگ، خرخرہ، قیزہ، تکہ، قشقہ، گردنی، نسل وغیرہ[۲]۔

گھوڑے کی خوراک کے لیے ذیل ظروف تھے:

توبرہ، سبد، کراہ، مسین، سطل[۳]۔ ان سب کی تصویریں آئین اکبری میں دی ہوئی ہیں، جن کو دیکھ کر ان کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے۔

گھوڑوں کی تربیت، نگہداشت اور خدمت کے لیے مختلف ملازم مقرر تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) آختہ بیگی: گھوڑوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اس عہدہ پر کوئی ممتاز منصب دار مقرر کیا جاتا تھا، وہ گھوڑوں اور اون سے متعلق تمام ملازمین کی عام دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

(۲) داروغہ: شاہی اصطبل کا نگراں ہوتا تھا، پنج ہزاری منصب تک کے امراء اس عہدہ پر فائز کیے جاتے۔

(۳) مشرف: گھوڑوں کے اعداد و شمار، خرید و فروخت اور ان سے متعلق تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا، یہ عہدہ بھی کسی معزز امیر ہی کو دیا جاتا تھا۔

(۴) دیدہ ور: شاہی معائنہ سے قبل گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اس کی تفصیل مشرف کو قلم بند کراتا۔

(۵) آختچی: سفر میں گھوڑوں کا محافظ ہوتا اور ان کو وہی آراستہ پیراستہ کرتا تھا۔

(۶) چابک سوار: گھوڑوں کی تیز رفتاری کا اندازہ لگانے والا ہوتا تھا۔

(۷) ہاڈا: گھوڑے کو شاید پھیرتا تھا اور ان کو کچھ طور طریقے بتاتا تھا، اس کام کے لیے عموماً

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھو آئین اکبری ص ۱۳۱-۱۴۴

۲ آئین اکبری ص ۲-۷-۹۱۶ ۳ آئین اکبری ص ۹۷

راجپوت ہی مقرر کیے جاتے تھے۔

(۸) میر دہہ: دس سائیسوں کا سردار ہوتا تھا۔

(۹) بیطار: یہ گھوڑوں کے امراض کا معالج ہوتا تھا۔

(۱۰) نقیب: ہر طویلہ کی کیفیت داروغہ اور مشرف کے پاس پہنچاتا تھا۔

(۱۱) زین دار: یہ شاید گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے۔

(۱۲) آب کش: چالیس گھوڑوں کے لیے تین آب کش اور بیس کے لیے دو آب کش ہوا کرتے تھے۔

(۱۳) سائیس: دو گھوڑوں کی خدمت کے لیے ایک سائیس مقرر کیا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ فراس، اسپند سوز، خاکروب اور نعل بند ہوا کرتے تھے۔

(اگست تا نومبر ۱۹۵۵ء)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی قیام گاہوں کے ساز و سامان

ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کے زمانہ میں شاہی فوج جب میدان جنگ میں جاتی تھی، تو بہت آراستہ و پیراستہ ہو کر ان کی حکومت اس سرزمین میں جتنی زیادہ مستحکم ہوتی گئی، اتنی ہی ان کی فوج کی شان و شوکت میں اضافہ ہوتا گیا، تیموری عہد سے پہلے کے مورخوں نے تو اپنے عہد کی فوجی شان و شوکت کی تفصیل بیان کرنے میں بخل سے کام لیا ہے، لیکن اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس دور کے لشکریوں کی کارکردگی اور نبرد آزمائی تیموری عہد کی فوج سے کسی لحاظ سے بھی فروتر نہیں تھی، اگر اس دور میں بھی کوئی ابوالفضل یا عبدالحمید لاہوری یا کاظم شیرازی ہوتا تو اس زمانہ کے فوجی کارنامے بھی تیموری عہد ہی کی طرح پرشکوہ معلوم ہوتے، لیکن اس دور کے مورخوں کی خاموشی کے باوجود سلاطین دہلی کے فوجی دبدبے کا جو غلغلہ بیرونی ممالک میں بلند ہوتا رہا، اس کو وہاں کے بعض اہل قلم نے بڑے ولولہ انگیز طریقے پر لکھا ہے چناں چہ صبح الاعشٰی کے مصنف کا بیان ہے کہ سلطان محمد تغلق جب کسی فوجی مہم پر روانہ ہوتا تھا تو بڑے تزک و احتشام سے روانہ ہوتا تھا ایک سوار تاج شاہی پر چتر لگائے رہتا تھا، سلاح دار زرق برق لباس میں ملبوس چمکیلے ہتھیار سنبھالے ہوئے سواروں کے پیچھے ہوتے تھے، تقریباً بارہ ہزار خدام پا پیادہ رہتے تھے سواری کے آگے طبل بجایا جاتا تھا، طبل میں ۲۰۰ نقارے، ۴۰ کوس، ۲۰ بوق اور ۱۰ چنگ ہوتے تھے، سلطان کے ساتھ دوسرے اعیانِ سلطنت اپنے اپنے امتیازی جھنڈوں کے ساتھ ہم رکاب ہوتے تھے بعض خوانین کو سات سات جھنڈے رکھنے کی اجازت ہوتی تھی، اعیانِ حکومت کے چند دوسرے امتیازات خصوصی بھی ہوتے تھے، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل گھوڑے اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے اور امراء کو ۳۰ کوتل گھوڑوں کی اجازت ہوتی تھی۔

لشکر کوچ کرتا تو ہاتھیوں، سواروں، اونٹوں، پیادوں، باربرداری کے جانوروں، بیل

داروں، نجاروں اور لوہاروں اور بنجاروں وغیرہ کی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں اور خاص فوجی تنظیم کے ساتھ آگے بڑھتی تھیں، پڑاؤ کے لیے بڑے خیمے ساتھ ہوتے، ابن بطوطہ نے تغلق کے عہد کے خیموں کے دو نام لکھے ہیں۔ اسراچہ اور صیوان شاہی سراچہ کا رنگ سرخ اور امراء کے سراچہ کا رنگ سفید ہوتا تھا، جس پر نیلے رنگ کا نقش بھی ہوتا۔ صیوان سراچہ کے اندر سایہ کے لیے لگایا جاتا تھا جو دو بڑے بانسوں پر کھڑا رہتا تھا۔۲ فیروز شاہ کے خاص خاص خیموں کے نام یہ تھے، دلیز، بارگاہ، خوابگاہ، فیروز شاہ کی ایک ایجاد گنبد سفید بھی تھا، جو بارگاہ کے ساتھ نصب کیا جاتا تھا، جس کے نیچے وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔۳

جب خیمے پڑاؤ پر نصب کیے جاتے تو ان کی ترتیب میدان جنگ ہی کی طرح دی جاتی تھی، یعنی آگے تو مختلف قسم کی فوجوں کے خیمے ہوتے اور بیچ میں بادشاہ، فوج کے اعلیٰ عہدیداروں اور حرم کی عورتوں کے خیمے ہوتے ان کے پیچھے اسلحہ خانہ، بار برداری کے جانور اور فوج کے دوسرے متعلقات ہوتے، اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا، کہ فوج کی پشت پر حفاظت کے لیے یا تو پہاڑی ہو یا ندی اور اگر اس قسم کی حفاظت کا فطری سامان نہ ہوتا، تو خندقیں کھودوی جاتیں، یا خاردار شاخوں کی باڑ لگا دی جاتی۔

تیموری دور کے فوجی کیمپ کے ساز و سامان کی بہت واضح تفصیلات ملتی ہیں، اکبر کے زمانہ میں وہ دستور تھا کہ فوج کے ٹھہرنے کی جگہ میزان منزل منتخب کرتا، یہ جگہ ۱۵۳۰ گز لمبی ہوتی، اس کے اگلے حصہ میں قول کی فوج ٹھہرتی اور دائیں بائیں بازو میں جرانغار اور برانغار کا لشکر ہوتا، قول کے پیچھے اکبر کے محل کی بوڑھی عورتوں (مثلاً مریم مکانی، گلبدن بیگم وغیرہ) کی قیام گاہ ہوتی، اس کے بعد قنات کا ایک حصار بنایا جاتا، اس کا گلال بار کہا جاتا تھا، جو سو گز مربع ہوتا تھا، اس حصار کے اندر شرقی جانب داخل ہونے کے لیے دو خیمے ہوتے، جو سر غہ کہلاتے تھے، ان میں ۵۴ خانے ہوتے تھے، ان دو خیموں کے بعد ایک بڑی چوبین راوٹی ہوتی تھی، جس کے گرد سرپردہ ہوتا، اس کے چوبین راوٹی سے متصل ایک دو منزلہ خیمہ کھڑا کیا جاتا، جہاں بادشاہ عبادت کرتا اور صبح کو

---

۱ صبح الاعشیٰ ترجمہ معارف نمبر ۶ جلد ۲۶ ص ۳۲۳

۲ سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۲۳ ۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰

امراء کا مجرا قبول کرتا، اس چوبین رماوٹی کے بعد چوبیس راوٹیاں اور کھڑی کی جاتیں، ان میں سے ہر ایک دس گز لمبی اور چھ گز چوڑی ہوتی، یہ بیگمات کے لیے مخصوص ہوتیں۔ یہ حصہ شبستانِ اقبال کہلاتا تھا، اس کی بعض راوٹیاں زربفت اور مخمل سے تیار کی جاتی تھیں، اسی سے متصل کنیزوں اور دوسری عورتوں کے لیے بھی راوٹیاں ہوتیں، شبستان اقبال کے باہر ایک چوڑا صحن چھوڑ دیا جاتا، جو مہتابی کہلاتا، اس صحن کے وسط میں ایک چبوترہ بنایا جاتا، جس پر ایک شگیرہ سایہ فگن رہتا، شام کے وقت بادشاہ اپنے مخصوص امراء کے ساتھ یہاں بیٹھتا، اس کے بعد دولت خانہ خاص کا خیمہ ہوتا جو بارگاہ کہلاتا، اس کو ہزار فراش ایستادہ کرتے تھے، اس میں بہتر کمرے ہوتے اور اس کے گرد پچاس شامیانے کھڑے کیے جاتے تھے، اس حصہ کو مختلف رنگ کے قالینوں سے ایسا سجایا جاتا کہ ایک کھلا ہوا چمنستان معلوم ہوتا، یہ دیوان خاص کہلاتا، جہاں امراء مشورے کے لیے بلائے جاتے، اس سے ساڑھے تین سو گز کے فاصلہ پر ایک دوسرا خیمہ ہوتا، جو دیوان عام کہلاتا تھا، اسی کے سامنے اس اکاس دیا روشن رہتا۔

پھاٹک پر نقارہ خانہ ہوتا، اس کے داہنے اور بائیں جانب زین خانہ اور دفتر خانہ رہتا تھا، زین خانہ کے سامنے اصطبل، داروغہ، سپاہ اور مشرف اصطبل و فیل خانہ کی جگہ ہوتی، اسی طرح دفتر خانہ کے سامنے سکھ پال، توپ خانہ کے لیے جگہیں مخصوص ہوتیں، حصار کے بیرونی حصہ کے داہنے اور بائیں جانب اور پشت پر تین تین سو گز کے قطعے چھوڑ دیے جاتے تھے، جن میں شہزادوں کے خیمے نصب کیے جاتے تھے شاہی خیمہ کی پشت پر قورخانہ اور محافظوں کا دستہ تعینات رہتا اور اس سے متصل اکبر کے محل کی بوڑھی عورتیں مثلاً مریم مکانی اور گلبدن بیگم وغیرہ کے خیمے لگائے جاتے، جس کے آگے قول کی فوج ہوتی، حصار کے بیرونی حصہ کے داہنے جانب یعنی شہزادوں اور امراء کے خیموں سے متصل روزانہ کی ضروریات کے سامان مثلاً مشعل خانہ، چراغ خانہ، توشک خانہ، خوشبو خانہ، آفتاب بچی خانہ وغیرہ کے علحدہ علحدہ چھوٹے چھوٹے خیمے ہوتے، اسی کے بغل میں جرانغار کی فوج ہوتی، اسی طرح حصار کے بیرونی حصے کے بائیں جانب آبدار خانہ، شراب خانہ، حصول خانہ، میوہ خانہ، رکاب خانہ، مطبخ، حوائج خانہ وغیرہ وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے خیمے ہوتے اور اسی کے بغل میں جرانغار کی فوج ہوتی، حصار کے چھ گوشوں پر پہرہ دار تعینات رہتے اور حصار کے

تیس گز کے فاصلے پر چاروں کونے پر بازار لگائے جاتے، بازار کے چاروں طرف اراکین دربار اپنے اپنے عہدوں کے مطابق قیام پذیر ہوتے تھے۔[1]

کیمپ کے ساز وسامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں سو ہاتھیوں، پانچ سو اونٹوں، چار سو عرابے (گاڑیاں) اور ایک سو کہاروں کی ضرورت ہوتی تھی، پانچ سو منصب دار اور احدی ان کے جلو میں رہتے تے، ان کے علاوہ ایک ہزار ایرانی، تورانی اور ہندی فراش، پانچ سو بیلدار، سو سقے، پچاس بڑھئی، خیمہ دوز مشعلچی، تیس سوز چی اور ڈیڑھ سو خاکروب بھی ساتھ ہوتے تھے۔[2] ضرورت کے مطابق ان کی تعداد بڑھتی بھی رہتی تھی۔

اورنگ زیب کے ایک ہم عصر فرانسیسی مورخ نے اس کی ایک فوج کے کوچ کرتے وقت کے ساز وسامان کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

> بڑی بڑی توپیں پہلے بھیجی گئیں، یہ گویا ہراول کا دستہ تھا، اس کے پیچھے ساز و سامان ترتیب کے ساتھ روانہ کیا گیا، پہلے اونٹوں کی قطار تھی جن پر شاہی خزانہ لدا تھا، سو اونٹوں کے پیچھے شکاری کتے تھے، یہ ہرنوں اور چیتوں کے شکار کے لیے ساتھ رکھے گئے تھے، ان کے بعد اسی اونٹوں، تیس ہاتھیوں اور بیس گاڑیوں پر سرکاری کاغذات بار تھے، مغل بادشاہوں کا دستور تھا کہ وہ ضروری کاغذات کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، ٹھیک اس قطار کے بعد پچاس اونٹوں پر بادشاہ اور شہزادوں کے پینے کے لیے پانی تھا، ان اونٹوں کے پیچھے اونٹوں پر شاہی مطبخ کا سامان تھا، دودھ کے لیے پچاس گائیں بھی ساتھ تھیں، کیوں کہ اورنگ زیب زیادہ تر دودھ ہی استعمال کرتا تھا، ایک سو باورچی پیچھے پیچھے گھوڑوں پر سوار تھے، ہر باورچی

---

[1] تفصیل کے لیے تصویر آئین اکبری، متعلقہ ص ۲۷ نولکشور پریس ایڈیشن و آئین ص ۱۶۔۱۷

[2] ایضاً ص ۱۳

علیحدہ قسم کا کھانا پکاتا تھا، اس کے بعد بادشاہ اور حرم کی بیگمات کے لباس و پوشاک کا ساز وسامان تھا جو پچاس اونٹوں اور ایک سو گاڑیوں پر بار تھا، تیس ہاتھیوں پر بیگمات کے جواہرات، خنجر اور شمشیریں تھیں، یہ خنجر اور شمشیر بادشاہ اپنے فوجی افسروں کو تحفہ دیا کرتا تھا، توپوں کے آگے آگے دو سو بیلدار راستوں کو ہموار کرنے کے لیے تھے، اونٹوں اور ہاتھیوں کے چلنے سے راستے میں جو ناہمواری پیدا ہو جاتی تھی، اس کے لیے ایک ہزار علاحدہ تھے، ساز وسامان کے پیچھے سواروں کا دستہ تھا، سواروں کے بعد بادشاہ کی سواری تھی، جو زیادہ تر ہاتھی پر سفر کرتا تھا، ہاتھی کے ہودج پر ایک کمرہ بنا تھا، جس میں شیشہ کی کھڑکیاں تھیں ورآرام کرنے کے لیے ایک پلنگ بھی تھا، ہاتھی کے ساتھ ساتھ پالکیاں بھی تھیں، تاکہ جب بادشاہ کا دل چاہے ان پر بھی سفر کر سکے، ہاتھی کے پیچھے بادشاہ کی سواری کے لیے کچھ گھوڑے بھی ساتھ ساتھ تھے، کیوں کہ اورنگ زیب شہسواری کا بہت شائق تھا، اور بوڑھاپے میں بھی ان سلطنت کا سب سے بہتر شہسوار سمجھا جاتا تھا، بادشاہ کے ہاتھی کے آگے کچھ اونٹ تھے، جن پر انگیٹھیاں رکھی تھیں، ان میں خوشبودار مسالے جلا کر فضا معطر کی جاتی تھی، تاکہ بادشاہ کے سفر کا راستہ معطر رہے، اس کی سواری کے دونوں بازوؤں پر شاہی محافظوں کے دستے تھے، شاہی سواری کے پیچھے حرم کی بیگمات تھیں، ہاتھی پر ان کے ہودج ایسے باریک ململ سے ڈھکے تھے کہ وہ باہر کی سب چیزیں دیکھ سکتی تھیں لیکن ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی تھی، حرم کی برقعہ پوش خادمائیں گھوڑوں پر پیچھے پیچھے تھیں، عقب میں بکثرت آدمی تھے، ان میں

کچھ تو ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں سے متعلق خدمت گذار، کچھ خیمہ بردار، کچھ فوج عہدیداروں کے غلام و چاکر تھے، لیکن یہ بھی فوجی تنظیم کے ساتھ قطاروں میں آگے بڑھتے تھے۔“[۱]

رسد کی فراہمی:

اگر فوج دارالسلطنت سے قریب ہی کسی مہم پر ہوتی، تو لشکریوں کے خورد و نوش کا سامان دارالسلطنت سے بھیجا جاتا تھا، اور اگر دور دراز مقام پر ہوتی، تو لشکر کے قریب بنجارے اور سوداگر چلتے جن کے لیے ضیاء الدین برنی نے ”کاروانیاں“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔[۲] یہ سوداگر غلے وغیرہ کی دوکانیں فوجی کیمپ کے اردگرد لگاتے تھے۔ کبھی آس پاس کے علاقے کے مقطع یا جاگیردار رعایا تیں بھی فوجی رسد ارزاں قیمت پر فراہم کیا کرتی تھیں۔[۳] کبھی مفتوحہ علاقہ سے مال غنیمت کے طور پر غلہ حاصل ہو جاتا تھا، جو پورے لشکر میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

علاؤ الدین نے اپنے سپاہیوں کو ارزاں قیمت پر اجناس فراہم کرنے کے لیے باضابطہ قوانین جاری کیے تھے اور اس کے عہد میں ہر جگہ فوجیوں کو سستی چیزیں مل جاتی تھیں، مثلاً ایک لشکری ساڑھے سات جیتل میں ایک من گیہوں چار جیتل میں ایک من جو پانچ جیتل میں ایک من چنا اور پانچ جیتل میں ایک من ماش خرید سکتا تھا۔[۴]

تیمور جب اپنی فوج لے کر ہندوستان آیا تھا، تو پہلے آس پاس کے علاقے سے غلہ کا ذخیرہ جمع کر لیتا تب لڑائی چھیڑتا یا کسی قلعہ کا محاصرہ کرتا۔[۵] تو جب تیموریوں کی باضابطہ سلطنت قائم ہو گئی، تو ان کے فوجی کیمپ کے ساتھ سفری بازار ہوتا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اس بازار میں بنیے اپنی دوکانیں لگاتے اور بنجارے باہر سے غلہ لاتے۔[۶] کبھی دارالسلطنت سے غلہ بھیجا جاتا ہے، کبھی

۱۔ آرمی دی انڈین مغلس از ولیم اروِن ص ۵-۲۰۳ ۲۔ برنی ص ۲۰۲-۵۷

۳۔ برنی ص ۳۲۸ ۴۔ برنی ص ۳۰۵ ۵۔ ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۳۳

۶۔ اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۳۹ و اقبال نامہ جہانگیری (اردو ص ۱۱۱) ۷۔ بدایونی جلد دوم ص ۳۲۹-۳۲۷

خورد و نوش کا سامان لشکریوں کے ساتھ ہوتا ہر سپاہی چار روز کا آذوقہ ساتھ رکھتا تھا۔[۱] کبھی اردگرد کے علاقے سے بھی فراہم کر لیا جاتا اور فوج کی روانگی کے وقت اس کا ضرور لحاظ رکھا جاتا کہ آس پاس کے علاقے سے غلہ آسانی سے فراہم ہو جائے گا، ورنہ مہم ملتوی رہتی ہے۔[۲]

اگر رسد کی فراہمی کا معقول انتظام نہ ہوتا تو فوج ہلاکت و مصیبت میں مبتلا ہو جاتی، بختیار خلجی جب لکھنوتی سے تبت کی مہم پر روانہ ہوا اور راہ کی دشواری کی وجہ سے اس کو لوٹنا پڑا، تو واپسی میں دشمنوں نے راستے کے تمام علاقے کو اس طرح جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا کہ اس کے لشکریوں اور گھوڑوں کو کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں مل سکی، اس لیے مجبوراً لشکریوں نے گھوڑوں کو ذبح کر کے کھانا شروع کیا۔[۴] فیروز شاہ تغلق ٹھٹھ کی پہلی مہم میں محض اس لیے ناکام رہا تھا، کہ اس کی فوج میں غلہ کی کمی ہو گئی اور اس کا نرخ ایک تنکہ یا دو تنکہ فی سیر ہو گیا تھا اور لشکری مردار جانوروں کا گوشت کھانے اور کچے چمڑے کو پانی میں جوش دے کر شکم پری کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے، اس پر بھی لشکر کے زیادہ تر سپاہیوں کی جانیں فاقے سے تلف ہو گئیں، خود شاہی خاندان کے افراد نے کھچڑی کھا کر جان بچائی۔[۵]

ہمایوں اور سلطان بہادر گجراتی سے جب مانڈو میں جنگ ہوئی، تو سلطان بہادر توپوں کا ایک مستحکم مورچہ بنا کر ہمایوں سے دو مہینے تک لڑتا رہا، مگر آخر میں ہمایوں نے سلطان بہادر کی فوج کے رسد پہنچنے کے تمام راستوں کی اس طرح ناکہ بندی کر دی کہ سپاہیوں کے غلہ ایندھن اور جانوروں کے لیے چارہ پہنچنا مشکل ہو گیا، جس سے سلطان بہادر کی فوج میں قحط کے ساتھ وبا بھی پھیل گئی اور بے شمار لشکریوں اور جانوروں کی جانیں تلف ہونے لگیں، یہاں تک کہ سلطان بہادر لشکر کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔[۶]

اکبر کے ۳۷ ویں سال جلوس میں شاہی فوج جانی بیگ کے خلاف ٹھٹھ گئی، تو رسد کی بڑی کمی ہو گئی، جس سے ساری فوج کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی اور شاہی فوج کے دستے ادھر ادھر جا

---

۱ بدایونی جلد دوم ص ۱۲۸ — ۲ سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۷۵

۳ بادشاہ نامہ جلد ا ص ۲۷۱، جلد ۲ ص ۱۲۵ — ۴ طبقات ناصری ص ۱۵۳

۵ تاریخ فیروز ص ۶۰ — ۶ طبقات اکبری ص ۳۲-۳۳

کر باضابطہ جنگ کرتے تو کھانے پینے کی چیزیں مل جاتیں۔[۱]

۴۵ ویں سال جلوس میں اکبری فوج نے جب قلعہ اسیر کا محاصرہ کیا، تو محصورین کے لیے غلہ آنے جانے کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاقہ اور وبا سے چالیس ہزار محصورین موت کے گھاٹ اتر گئے۔[۲] شاہجہاں کے زمانہ میں جب اورنگ زیب بلخ کی مہم پر گیا، تو اثنائے جنگ میں غذا کی ایسی قلت ہو گئی کہ ایک ایک روٹی دو دو روپے میں بکنے لگی تھی، اس پر بھی کسی کو ملتی اور کسی کو نہیں ملتی مگر اورنگ زیب نے اپنی غیر معمولی مستقل مزاجی، ہمت اور بردوت سے کام لے کر فوج کو ہمت ہارنے سے بچائے رکھا۔[۳]

سفری اسپتال:

ہر لشکر کے ساتھ زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لیے ضروری سامان بھی ہوتا اور اس کا اہتمام ہر دور میں رہا، غیاث الدین تغلق جب اپنے حریف اور تخت دہلی کے دعویدار خسرو خان پر غالب آیا، تو موخر الذکر کے بہت سے سپاہی اور سردار میدان جنگ میں اس کے سامنے پیش کیے گئے، ان کے ساتھ وہ بہت لطف و کرم سے پیش آیا، زخمیوں کی مزاج پرسی کر کے ان کی ہمت بڑھائی، ان کے علاج معالجہ کا انتظام کیا اور بعض سرداروں کی خود تیمارداری کی ان ہی میں ایک سردار تمر تھا، جس کو غیاث الدین تغلق کے سپاہی قتل کر دینا چاہتے تھے، لیکن خود غیاث الدین تغلق نے اس کو بچا لیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے زخموں میں ٹانکے دیے، دوا لگائی اور اس کی برابر خبر گیری کرتا رہا، چناں چہ امیر خسرو تغلق نامہ میں فرماتے ہیں۔

بدست خود جراحت ہاش می بست
دواہا بہر راحت ہاش می بست
بتکیہ پیش خویشش داشت معذور
دمے از تکیہ گاہ او نہ شد دور

---

۱ اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۰۸ ۲ ایضاً ص ۸۲۔۸۱
۳ خافی خان جلد اول ص ۶۶۹۔۶۶۶

دلش داد و بجان بخشیش جان داد
ازیں بہ بخششے خود چون توان داد
بریشان دیگران را نیز بسیار
نوازش کرد بیش از قدر و مقدار
چو ہر مجروح را مرہم رسانید
دواے جان ہر درہم رسانید[1]

اکبر عہد میں منعم خان خانخانان شاہی لشکر لے کر داؤد خان کے خلاف سرکوبی کے لیے اڑیسہ گیا، تو بجورا میں ایک بڑا معرکہ ہوا اور شاہی لشکر کے سپاہی زخمی ہوئے، تو ان کے علاج معالجہ کے لیے خانخانان کو وہاں کچھ دنوں ٹھہرنا پڑا، منتخب التواریخ میں ہے۔

"خانخانان دران منزل چند روزے توقف نمودہ بمداواے جراحت خود و سائر مجرد حان پر داخت۔" (جلد دوم، ص ۱۹۶)

سموگڑھ کی لڑائی میں شہزادہ مراد دارا کے خلاف بڑی دلیری اور پامردی سے لڑا تھا، اس کے جسم اور چہرہ پر بہت سے کاری زخم لگے تھے، لڑائی ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب اس کے پاس گیا اور بڑی شفقت سے پیش آیا، میدانِ جنگ میں فوراً ماہر جراحوں کو طلب کر کے علاج معالجہ کا سامان کیا، منتخب اللباب میں ہے۔

"چون بریدان و چرہ محمد مراد بخش زخمہائے تیر بسیار رسیدہ بود بمرہم لطف و دلداری ظاہراو کوشیدہ جراحان چابکدست راحاضرساختہ، سراوبرزانوے شفقت خود گذاشتہ بعلاج زخمہا پر داختند۔" (جلد دوم، ص ۲۹)

اگست ۱۹۵۱ء

[1] تغلق نامہ مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۰۲

ہندوستان کے اسلامی عہد میں فوجوں کی تنخواہ

فوجوں میں تنخواہ کا رواج اسلامی عہد سے شروع ہوا۔ رومن امپائر میں فوج کا انتظام فیوڈل سسٹم (نظامِ جاگیری) پر تھا، اس کا طریقہ یہ تھا کہ ملک کے مقتدر اور بااثر لوگوں کو بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں اور ان سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ جنگی مہمات میں وہ فوجی خدمات انجام دیں گے، ان کے ساتھ خاص خاص تعداد کی فوجیں ہوتی تھیں، یہ فوجی افسر بیرن کہلاتے تھے۔ اسی اصول پر یہ بیرن اپنے نیچے جاگیردار اور علاقہ دار رکھتے تھے، جس سے سلسلہ بہ سلسلہ بہت سے طبقے قائم ہو گئے تھے، ان فوجوں کا واسطہ سلطنت سے مطلق نہ ہوتا، ان کا لگاؤ براہِ راست اپنے علاقہ داروں سے ہوتا، اس لیے جب ملک میں بغاوت ہوتی، تو ہر علاقہ دار کی فوجیں علیحدہ علیحدہ صفوں میں کھڑی ہوتیں [1]۔ ایران میں بھی یہی دستور تھا، مرزبان اور دہقان اسی قسم کے جاگیردار اور زمیندار تھے [2]، یورپ میں یہ طریقہ آٹھویں عیسوی تک جاری رہا۔

لیکن اسلام میں عہدِ آغاز ہی سے فوجوں کو وظیفے اور تنخواہیں ملا کرتی تھیں، ابتدا میں مفتوحہ ممالک کی اراضی مالِ غنیمت کے طور پر فوج میں تقسیم کر دی جاتی تھی، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں یہ روش پسند نہیں فرمائی اور بعض بڑے صحابہ کی مخالفت کے باوجود فوج کے درمیان تقسیمِ اراضی کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا اور فوجی خدمت کے معاوضہ میں بیت المال سے وظیفے اور تنخواہیں مقرر ہوئیں اور اس طرح فوج کی تنخواہ کے جاری ہونے کا رواج ہو گیا، اس پر اس قدر سختی سے عمل کیا گیا کہ اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جاتا، تو اس کی اراضی اس سے علیحدہ کر کے کسی دوسرے ذمی کے سپرد کی جاتی اور اس کو فوج میں باتنخواہ ملازم رکھ لیا جاتا [3]۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ص ۳۰۰ جلد یازدہم
[2] الفاروق حصہ دوم از علامہ شبلی نعمانی ص ۵۸
[3] کتاب الخراج امام یوسف طبع مصر ص ۱۴-۱۵

بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں فوجوں کو نقد تنخواہ دینے کا رواج ضرور رہا، تاہم ان دوروں میں فوج کے درمیان اراضی تقسیم کرنے کا پھر رواج ہو گیا، قائد-ین لشکر کو بڑے بڑے علاقے دیے جاتے تھے، اس میں وہ کسانوں سے پیداوار کچھ خود لیتے اور کچھ حکومت کو ادا کرتے اور ضرورت کے وقت وہی کسان اپنے علاقہ کے زمین دار کی سرکردگی میں میدان جنگ میں فوجی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اس کے بعد کسی حکومت نے فوجی خدمات کے معاوضہ میں جاگیر دینے کے طریقے کو زیادہ رواج دیا اور کسی نے زیادہ حصہ تنخواہ کا رکھا، فوج کے معاوضہ کی یہی ملی جلی ہوئی شکلیں ہندوستان میں مسلمان فرماں رواؤں کے ساتھ آ گئیں۔

محمود غزنوی کے فوجی نظام کی تفصیل ہمیں نہیں معلوم ہو سکی، مگر قیاس کہتا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کو تنخواہ دیا کرتا تھا، اراضی نہیں تقسیم کرتا تھا، میرے پاس اس کے قیاس پر کئی دلیلیں ہیں- اوّل یہ کہ سامانیوں نے اپنی حکومت میں جاگیر دینا قطعی طور پر بند کر دیا تھا، کیوں کہ وہ اس کو حکومت کی بنیاد کے کمزور ہونے کا ذریعہ سمجھتے تھے- غزنویوں کا تعلق سامانیوں سے براہ راست تھا، اس لیے انھوں نے بھی وہی طرز اختیار کیا ہوگا، جو سامانیوں نے اپنی حکومت میں اختیار کیا تھا- دوم یہ کہ محمود غزنوی ایک کثیر التعداد فوج کا مالک تھا، جن کو جاگیریں دینا ممکن نہ تھا- سوم یہ کہ اس کی فوج میں دور دراز مقامات مثلاً ترکستان، خراسان، ماوراالنہر اور ہندوستان سے لوگ آ کر بھرتی ہوتے تھے، جو یقیناً نقد رقم ہی تنخواہ میں لینا پسند کرتے ہوں گے اور آخری بات یہ ہے کہ محمود کی تاریخ میں ممالک مفتوحہ کو امراء پر تقسیم کرنے اور فوجوں کو اراضی دے کر کام لینے کا ذکر ہی نہیں ملتا، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ محمود کی فوج میں کچھ ایسے دستے بھی ہوتے تھے، جو بلا تنخواہ صرف اسلام کی فتح و نصرت کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے پیش پیش ہوتے- قنوج کی مہم میں اس قسم کے بیس ہزار سپاہی شریک تھے، جو ترکستان، ماوراالنہر اور خراسان وغیرہ سے جہاد کرنے کے لیے آئے تھے [۱] پھر سومنات کی مہم میں محمود کی معیت میں رضا کاروں کی تعداد تیس ہزار تھی، جو زیادہ تر ترکستان سے آئے تھے [۲] - جنگ کے بعد ان کو صرف مال غنیمت

---

۱ فرشتہ جلد اول ص ۲۹- نولکشور ۲ ایضاً ص ۳۲

میں سے حصہ ملتا تھا۔

عہدِ غلامان میں جاگیروں ہی کا رواج تھا۔ شمس الدین التمش نے دو ہزار سواروں کو دوآبہ کی زمین تنخواہ کے بدلے دے دی تھی۔ ان سواروں نے ان جاگیروں کو موروثی بنالیا تھا۔ ان میں سے بعض تو مر گئے تھے اور بعض جنگی خدمات انجام دینے کے لائق مطلق نہ رہے تھے، پھر بھی جاگیروں پر وہ یا ان کی اولاد قابض تھی۔ غیاث الدین بلبن نے ان بااعتدالیوں کو پسند نہیں کیا، اس نے ان اقطاع دارانِ شمسی کی تین قسمیں مقرر کیں، اوّل جو پیرانہ سالی کے سبب کسی کام کے نہیں رہے تھے، ان کی تنخواہ چالیس یا پچاس تنکہ مقرر کی اور ان کی جاگیروں کو خالصہ میں داخل کر لیا، دوم جو اقطاع دار جوان اور ادھیڑ تھے، ان کی تنخواہ بحسبِ استعداد مقرر ہوئی، مگر جاگیران سے واپس نہیں لی گئی، تنخواہ ادا کرنے کے بعد جو آمدنی پس انداز ہوتی، وہ شاہی اہلکاروں کے سپرد ہوتی تھی، قسم سوم یتیم اور بیواؤں کی تھی، جو اپنے غلاموں کو گھوڑوں اور جنگی ہتھیاروں کے ساتھ جنگی خدمت کے لیے بھیجا کرتے تھے، ان سے جاگیر واپس لے لی گئی اور بیواؤں اور یتیموں کی تنخواہ مقرر ہوئی، اس حکم کا جاری ہونا تھا کہ شمسی اقطاع داروں میں کھلبلی پڑ گئی، اونھوں نے ہر ممکن صورت سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور آخرکار ملک الامراء فخر الدین کوتوال کی وساطت سے بادشاہ سے یہ حکم منسوخ کرایا۔[۱]

علاؤ الدین کے زمانے میں فوجی تنظیم بہت باضابطہ تھی، مغلوں کے متواتر حملوں سے ہندوستان کی سلطنت معرضِ خطر میں تھی، ان بیرونی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے علاء الدین نے اپنی فوج کی از سرِ نو تنظیم کی، پایۂ تخت اور دیگر مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کیے، چار لاکھ پچھتر ہزار سواروں کی ایک جرار فوج مرتب کی، ان سواروں کے لیے کثیر مصارف کی ضرورت تھی، اس لیے خاص طور پر یہ انتظام کیا کہ فوج والوں کو جو تنخواہ دی جائے، اس میں وہ آسانی سے گزارہ کر سکیں۔ چناں چہ کھانے پینے اور تمام ضروریات کی چیزوں کے سرکاری نرخ مقرر کیے گئے، نرخوں کے اس تعیین سے فوج والے اپنے قلیل تنخواہ میں بھی آسانی سے زندگی بسر

۱۔ تاریخِ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی۔ ص ۶۱

کر لیتے تھے، عام طور سے درجہ اوّل کے سواروں کو ۲۳۴ ٹنکے درجہ دوم کو ۱۵۶ ٹنکے اور درجہ سوم کو ۷۸ ٹنکے سالانہ ملا کرتے تھے، جو سوار ایک سے زیادہ گھوڑا رکھتا تھا۔ اس کو کچھ ٹنکے زیادہ سالانہ ملا کرتے تھے مثلاً ۲۳۴ ٹنکے پانے والوں کو ۳۱۲ ٹنکے ملا کرتے تھے[۱]، علاء الدین فوجی سپاہیوں اور فوجی امراء کو جاگیریں نہیں دیا کرتا تھا، وہ جاگیر کو بغاوت اور سرکشی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔[۲]

لیکن سلطان محمد تغلق کے عہد میں خان ملوک اور سپہ سالار کو بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں۔ لشکر کا سب سے بڑا عہدہ دار خان، پھر امیر، اس کے بعد سپہ سالار ہوتا تھا۔ مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے کہ ان افسروں کو عراق جیسی ایک بڑی جاگیر دے دی جاتی تھی۔ ہر خان کو دو لاکھ ٹنکے کی جاگیر ہر ملک کے لیے پچاس ہزار سے لے کر ساٹھ ہزار ٹنکے کی جاگیر مقرر تھی، ہر امیر کے لیے تیس ہزار سے لے کر چالیس ہزار تک کی جاگیر اور ہر سپہ سالار کے لیے بیس ہزار یا اس سے کچھ کم ٹنکے کی رقم مقرر تھی اور ہر سپاہی کو ایک ہزار ٹنکے سے لے کر دس ہزار ٹنکے تک دیے جاتے تھے، اس کے علاوہ سلطان کی طرف سے ہر ملک کو کھانا کپڑا اور گھوڑوں کے ساز و سامان کے ساتھ ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار ٹنکے ملتے تھے۔[۳]

فیروز شاہ کے عہد میں جاگیر اور تنخواہ دونوں کا رواج تھا[۴]، چناں چہ خان جہاں کو جو

---

۱ برنی ص ۳۱۹۔ نیز فرشتہ ص ۱۱۵

۲ شمس سراج عفیف لکھتا ہے: "بدین مورخ ضعیف شمس سراج عفیف به روایات لطیف گفتند که سلطان علاء الدین بارہا درین کردار باگفتے و جوہر بدگمانی در قسم جہانبانی سنتے که دیہ دروجه بازنباید داد، زیرا چه دریک موضع دیه البته دویست دسی صد نفر مرد ساکن می باشند وایں تمام نفر زیریک وجه دارند۔ اگر ایں به جنس چند نفروجه دار، از آثار غرور بسیار و اسرار فجور بے شمار جمع آیند و متفق شوند و اندیشه فساد اور قسم سالکی کنند عجب نبود بدین سبب سلطان علاء الدین ہیچ کس رادیه در وجه تداد حشم رابر سال سال از خزانه دادی "۔ (عفیف، ص ۹۵)

۳ مسالک الابصار

۴ شمس سراج عفیف لکھتا ہے: "سلطان فیروز شاہ خلق رانا نہایے بے قیاس کردہ و برائے ایں کار دست احسان برآوردہ جہانی بطمع آن سرود آوردہ بعضے راده ہزار تنکه نان برداخت تعیں کردہ، بعضے راپنج ہزار و بعضے رادو ہزار، بر اندازه ہریکے و تمام حشم وجه دار ...... جمله قریات خطط و قصبات تحشم قسمت کردہ داد۔ تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف " ص ۹۶-۹۵

اقطاع اور پرگنے ملے تھے، اون کی آمدنی تیرہ لاکھ ٹنکے تھی، اس کے علاوہ اوس کی فوج اور اولاد کی تنخواہیں اور وظیفے الگ مقرر رہتے تھے- امراء ملوک خوانین کو ان کی لیاقت کے موافق مشاہرہ ملتا تھا، کسی کو آٹھ لاکھ کسی کو چھ لاکھ کسی کو چار لاکھ، وجہ دار لشکر کو اتنی زمین دی جاتی تھی کہ اس کی آمدنی سے وہ فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے- غیر وجہ دار سپاہیوں کو خزانہ شاہی سے نقد تنخواہ ملتی تھی اور جن سپاہیوں کو اس طرح مشاہرہ ملتا تھا، ان کا مشاہرہ اقطاعات کی آمدنی پر مقرر کیا جاتا تھا، جب وجہ دار سپاہیوں کا اطلاق اقطاع پر ہوتا، تو وہ اقطاع دار سے زمین کی آمدنی کا نصف وصول کرتے- اس زمانہ میں بعض آدمی ان ''اطلاقات'' کو خرید لیتے تھے، وہ ایک تہائی سپاہیوں کو ادا کرتے اور بقیہ خود لے لیتے تھے، اس سے طرفین کو فائدہ ہوتا تھا، بہت سے خریدار اس طرح اطلاق کے خریدنے سے بڑے مال دار ہو گئے تھے اور یہ ایک پر منفعت تجارت ہو گئی تھی-[1]

لودھیوں کے عہد میں بھی فوجی امراء کو جاگیریں ملا کرتی تھیں، ان فوجی امراء کو حکم تھا کہ اپنے منصب کے مطابق سپاہی رکھیں اور ان میں کم وبیش نہ کریں، لیکن لودھی حکومت کے آخری عہد میں ان فوجی امراء نے حکومت کی کمزوری سے بے جا فائدہ اٹھانا شروع کیا تھا، اونھوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ جس وقت ان کا ماہانہ مقرر ہوتا تھا، تو وہ لشکر بہت دکھاتے تھے اور جب ان کو جاگیریں مل جاتی تھیں، تو اکثر سپاہیوں کو جدا کر دیتے تھے اور جن کو رکھتے بھی تھے، تو ان کی تنخواہیں ادا نہ کرتے تھے، جب بھی شاہی معائنہ ہوتا تھا، تو وہ ادھر اُدھر سے باہر کے آدمیوں کو جمع کر کے دکھا دیتے تھے، چناں چہ جب وہ اپنی اس غیر منظم فوج کو میدانِ کارزار میں لاتے تھے، تو بجائے مفید ثابت ہونے کے اس کو شکست فاش ہوتی تھی، مگر ہزیمت سے ان کو کوئی ذاتی نقصان نہ پہنچتا تھا، وہ فوج درست کر کے دوسرے کے جاگیردار بن جاتے تھے، اس لیے شاہی خاندان کے زوال سے ان کی مالی حالت پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا-[2]

اس قسم کی بدعنوانیاں شیر شاہ کے زمانہ حکومت میں بھی تھیں، لیکن شیر شاہ ایک تجربہ کار اور ہوش مند حکمراں تھا، وہ امراء اور سپاہیوں کے مکر و فریب سے اچھی طرح واقف تھا، اس لیے

[1] عفیف ص ۲۹۶، ۲۹۷ [2] الیٹ جلد چہارم، ص ۴۱۲

فوجی امراء کی ان چالاکیوں کو روکنے کے لیے اس نے داغ کا قانون وضع کیا، وہ گھوڑوں پر اپنے سامنے داغ لگواتا تھا اور داغ کے نشان کے بغیر کسی کو تنخواہ نہ دیتا تھا، یہاں تک کہ خاک روبوں اور محل کی ملازماؤں کو بھی یہ داغ لینا پڑتا تھا، اس طرح فوجی امراء کا اپنے منصب کے سپاہیوں میں غیر سپاہیوں کو داخل کرنا قطعی طور پر بند ہوگیا۔ شیر شاہ سپاہیوں اور گھوڑوں کا چہرہ (Descriptiuerolls) باضابطہ لکھواتا تھا اور اسی حساب سے تنخواہیں تقسیم کرتا تھا، سپاہیوں کی تنخواہ خود اپنی زبان سے مقرر کرتا تھا تاکہ سپاہی کے حق میں امراء دست اندازی نہ کرسکیں، اس کا معمول تھا کہ وہ روز نماز اشراق کے بعد لشکر کا معائنہ کرتا تھا، امراء اور سپاہیوں سے پوچھتا تھا کہ کوئی ان میں سے بغیر جاگیر کے تو نہیں ہے، اگر کوئی ہوتا تو مہم سے پہلے اس کو جاگیر مل جاتی تھی اور اگر کوئی مہم کے وقت جاگیر کے لیے عرض کرتا تو سزا پاتا تھا، پرانے سپاہیوں کے لشکر کی موجودات لیتا تھا اور نئے سپاہیوں سے باتیں کرتا تھا۔ افغانوں سے افغانی زبان میں گفتگو کرتا تھا، ان میں جو کوئی فصاحت سے گفتگو کرتا اور پھر اپنی کمان کھینچ کر تیر اندازی کی مہارت دکھاتا تھا، تو اور سپاہیوں سے اس کو تنخواہ زیادہ دیتا تھا۔[1]

فوجی امراء کی خیانت اور عیش پسندی کے سبب اکبر نے سابقہ فوجی نظام کا نقشہ بالکل بدل دیا اور نئے نئے آئین بنائے، جو رد و بدل ہوتے ہوتے اس کے عہد کا ایک خاص نظام ہوگیا تھا۔ اکبر نے اپنی فوج کو ۶۶ حصوں میں ترتیب دیا، جو دہ باشی سے دو ہزاری تک پہنچتے تھے، پانچ ہزاری کے اوپر کے مناصب شہزادوں کے لیے مخصوص تھے، باقی مناصب باستثنائے یوز باشی تین درجوں میں تقسیم تھے۔ اول، دوم اور سوم منصب کے درجے سواروں کے شمار سے ظاہر ہوتے تھے اگر سواروں کا شمار منصب کے اعداد کے برابر ہوتا، تو منصب اول درجہ کا ہوتا اور اگر سواروں کا شمار منصب کے اعداد کا نصف یا نصف سے زیادہ ہوتا، تو منصب درجہ دوم ورنہ درجۂ سوم سمجھا جاتا مثلاً پنج ہزاری پنج ہزار سوار، پنج ہزاری چار ہزار سوار، پنج ہزاری دو ہزار سوار اور ان میں پنج ہزاری ہر جگہ منصب ہے، لیکن تینوں تین درجے کے منصب ہیں، جو منصب دار اپنی فوج آپ بہم پہنچاتا تھا

[1] تاریخ شیر شاہی از عباس خاں بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۳

واقعی منصب دار تھا، لیکن کسی اور منصب دار کی مرتب فوج کے کسی حصّہ پر سردار مقرر کر دیا جاتا، تو وہ منصب دار داخلی کہلاتا، اس ترتیب سے اپنی فوجوں کو تقسیم کرنے کے بعد اکبر نے ہر منصب دار کے افسروں کی تنخواہ مقرر کی اور اس کا نام تنخواہ ذات رکھا۔

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ہر فوجی عہدہ دار کا ماہانہ لکھا ہے، جو حسبِ ذیل ہے۔

مناصب	ماہانہ		
	اوّل	دوم	سوم
دو ہزاری	۶۰۰۰۰	•	•
ہشت ہزاری	۵۰۰۰۰	•	•
ہفت ہزاری	۴۵۰۰۰		
پنج ہزاری	۳۰۰۰۰	۲۹۰۰۰	۲۸۰۰۰
چہار ہزاری و نہ صدی	۲۷۶۰۰	۲۷۴۰۰	۲۷۳۰۰
" ہشت صدی	۲۷۶۰۰	۲۷۴۰۰	۲۷۳۰۰
چہار ہزاری و ہفت صدی	۲۶۸۰۰	۲۶۶۰۰	۲۶۵۰۰
" شش صدی	۲۶۱۰۰	۲۶۲۰۰	۲۶۱۰۰
" پان صدی	۲۶۰۰۰	۲۵۸۰۰	۲۵۷۰۰
" چہار صدی	۲۵۲۰۰	۲۵۰۰۰	۲۴۸۰۰
" سہ صدی	۲۴۴۰۰	۲۴۲۰۰	۲۴۰۰۰
" دو صدی	۲۳۶۰۰	۲۴۴۰۰	۲۳۲۰۰
" یک صدی	۲۲۸۰۰	۲۲۴۰۰	۲۳۳۰۰
چہار ہزاری	۲۲۰۰۰	۲۱۸۰۰	۲۱۶۰۰
سہ ہزار و نہ صدی	۲۱۳۰۰	۲۱۲۰۰	۲۱۱۰۰
" ہشت صدی	۲۰۸۰۰	۲۰۶۰۰	۲۰۵۰۰
" ہفت صدی	۲۰۲۰۰	۲۰۰۰۰	۱۹۹۰۰

" ششصدی	۱۹۶۰۰	۱۹۴۰۰	۱۹۳۰۰
" پان صدی	۱۹۰۰۰	۱۸۸۰۰	۱۸۷۰۰
" چہارصدی	۱۸۳۰۰	۱۸۰۱۴	۱۸۰۰۳
" سہ صدی	۱۸۲۰۰	۱۸۰۰۰	۱۷۶۰۰
" یک صدی	۱۷۸۰۰	۱۷۶۰۰	۱۷۵۰۰
سہ ہزاری	۱۷۴۰۰	۱۷۲۰۰	۱۷۱۰۰
دو ہزار و نہ صدی	۱۶۴۰۰	۱۶۲۰۰	۱۶۱۰۰
" ہشت صدی	۱۵۸۰۰	۱۵۶۰۰	۱۵۵۰۰
" ہفت صدی	۱۵۲۰۰	۱۵۰۰۰	۱۴۹۰۰
" ششصدی	۱۴۶۰۰	۱۴۴۰۰	۱۴۳۰۰
" پانصدی	۱۴۰۰۰	۱۳۸۰۰	۱۳۷۰۰
" چہارصدی	۱۳۶۰۰	۱۳۴۰۰	۱۳۳۰۰
" سہ صدی	۱۳۲۰۰	۱۳۰۰۰	۱۲۹۰۰
" دو صدی	۱۲۸۰۰	۱۲۶۰۰	۱۲۵۰۰
" یک صدی	۱۲۴۰۰	۱۲۲۰۰	۱۲۱۰۰
دو ہزاری	۱۲۰۰۰	۱۱۹۰۰	۱۱۸۰۰
ہزار و نہ صدی	۱۱۹۵۰	۱۱۳۵۰	۱۱۳۵۰
" ہشت صدی	۱۱۶۵۰	۱۱۴۰۰	۱۱۳۰۰
" ہفت صدی	۱۱۲۳۵	۱۱۰۰۰	۱۰۸۰۰
" ششصدی	۱۰۶۰۰	۱۰۴۰۰	۱۰۲۰۰
" پانصدی	۱۰۰۰۰	۹۸۰۰	۹۷۰۰
" چہارصدی	۹۶۰۰	۹۴۰۰	۹۳۰۰

" سہ صدی	۹۲۰۰	۹۱۰۰	۹۰۵۰
" ہزار و دو صدی	۹۰۰۰	۸۹۰۰	۸۸۰۰
" یک صدی	۸۷۰۰	۸۵۰۰	۸۳۰۰
ہزاری	۸۲۰۰	۸۱۰۰	۸۰۰۰
نہ صدی	۷۷۰۰	۷۳۰۰	۷۱۰۰
ہشت صدی	۵۰۰۰	۴۷۰۰	۴۳۰۰
ہفت صدی	۴۴۰۰	۴۰۰۰	۳۸۰۰
شش صدی	۳۵۰۰	۳۲۰۰	۳۰۰۰
پانصدی	۲۵۰۰	۲۳۰۰	۲۱۰۰
چہار صدی	۲۰۰۰	۱۷۵۱	۱۵۰۰
سہ صدی و پنجاہی	۱۳۵۰	۱۳۰۵	۳۵۰
سہ صدی	۱۴۰۰	۱۲۵۰	۱۲۰۰
دو صد و پنجاہی	۱۱۵۰	۱۱۰۰	۱۰۰۰
دو صدی	۹۷۵	۹۵۰	۹۰۰
یک صد و پنجاہی	۸۷۵	۸۵۰	۸۰۰
صد و بست و پنج	۷۸۰	۷۶۰	۷۵۰
یوزباشی	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰
چہار بستی	۴۱۰	۳۸۰	۳۵۰
سہ بستی	۳۰۰	۲۸۵	۲۷۰
پنجاہی	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰
ترکش بند	۱۷۵	۱۶۵	۱۵۵
بستی	۱۳۵	۱۲۵	۱۱۵
دہ باشی	۱۰۰	۸۲	۷۵

ان منصب داروں کے علاوہ فوج کے مختلف آدمیوں کی مختلف تنخواہیں تھی، جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

تابنیان:

تابنیان منصب داروں کے سوار ہوتے، پانچ سواروں کو چالیس ہزار دام سالانہ ملا کرتے تھے یعنی ایک سوار کو ۸۰۰ دام ماہانہ ملتے، چالیس دام ایک روپیہ کے برابر ہوتا، اس لحاظ سے ایک سوار کی تنخواہ ۲۰۰ روپیہ سالانہ یعنی سولہ روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ماہانہ ہوتی، ایک سوار جو ایک سے زیادہ گھوڑا رکھتا کچھ تنخواہ زیادہ پاتا، دو یا تین گھوڑوں والے سوار کو ۱۱۰۰۰ دام یعنی ۲۷۵ روپیہ سالانہ (۲۲ روپیہ ۱۴ آنہ ۸ پائی ماہانہ) ملتے، تابنیان کو منصب داروں سے تنخواہ ملتی تھی، جو اپنے لیے ان تنخواہوں میں سے پانچ فی صدی وضع کر لیا کرتے تھے، تنخواہ عموماً چھ، پانچ اور چار ماہ پر ملتی تھی۔

پیادگان:

ان کے چار حصے تھے، اول، دوم، سوم، چہارم، اول درجہ کے پیادگان کو پانچ سو دام (۱۲ روپیہ ۸ آنے) دوم کو چار سو دام (دس روپیہ) سوم کو تین سو دام (سات روپیہ آٹھ آنے) چہارم کو دو سو چالیس دام (چھ روپیہ) ملتے تھے [۱]

احدی:

احدیوں کا معمولی سپاہیوں سے کچھ زیادہ درجہ رہتا، ان کی تنخواہیں مختلف ہوتیں، چالیس روپیہ سے پانچ سو ماہانہ تک زیادہ ہوتیں [۲]

بندوقچی:

بندوقچیوں کے سرداروں کی چار قسمیں تھی۔ اول کو تین سو دام (۷ روپیہ ۸ آنے) دوم

---

۱ آئین اکبری ص ۱۳۲ ۲ ایضاً

کو دو سو اسی دام (۷ روپیہ) سوم کو ۲۷۰ دام (۵ روپیہ ۱۲ آنے) چہارم کو ۲۶۰ دام (۵ روپیہ ۸ آنے) ماہانہ ملا کرتے تھے، بندوقچی پانچ حصوں میں تقسیم تھے اور ہر حصہ کی تین قسمیں تھیں۔ اول کو دو سو پچاس دام (چھ روپیہ چار آنے) دو سو چالیس دام (چھ روپیہ) دو سو تیس دام (پانچ روپیہ بارہ آنے) ملتے تھے، دوم کو دو سو بیس دام (پانچ روپیہ آٹھ آنے) دو سو دس دام (پانچ روپیہ چار آنے) اور دو سو دام (پانچ روپیہ) ملا کرتے تھے۔ سوم کو ۱۹۰ دام (چار روپیہ ۱۲ آنے) ۱۸۰ دام (چار روپیہ آٹھ آنے) ۱۷۰ دام (چار روپیہ چار آنے) ملا کرتے تھے، چہارم کو ۱۶۰ دام (چار روپیہ) ایک سو پچاس دام (تین روپیہ بارہ آنے) ایک سو چالیس دام (تین روپیہ آٹھ آنے) پنجم کو ۱۳۰ دام (تین روپیہ چار آنے) ایک سو بیس دام (تین روپیہ) ایک سو دس دام (دو روپیہ بارہ آنے)۔

مناصب کی ماہانہ رقموں کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ تنخواہ ذات اور دواب شاہی کے مصارف کا مجموعہ ہیں، آئین اکبری میں جدول مناصب میں ہر ہر منصب کے ساتھ کچھ تعداد گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں، بیلوں، خچروں اور چھکڑوں کی بھی مندرج ہے۔ یہ منصب داروں کے خاصہ ولوازمہ نہ ہوتے تھے، بلکہ یہ شاہی چیزیں ہوتی تھیں، جو دواب شاہی کہلاتی تھیں۔ ابوالفضل نے ان کی خوراک کی رقم کو بھی تنخواہ ذات کے ساتھ شامل کر دیا ہے، اس مصرف کی شمولیت کی وجہ سے منصب داروں کی تنخواہیں بہت بڑی معلوم ہوتی ہیں، حالاں کہ وہ محض مناصب یا ارباب مناصب کی ماہانہ تنخواہ نہیں۔ آئین اکبری میں ہے۔

"بھریکے از امراء حلقہ با سپردو دیدبانی فرمود کہ
خورش از سرکار والا تنخواہ شد"۔

ایک دوسری جگہ ہے:

چنانکہ ہر حلقہ بدیدبانی کے از امراء باز گرد وہماں طور
ہر فیل خاصہ بہ نیا قداری اسپے نامزد۔

شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب دہلوی نے تحقیق کے بعد منصب داروں کی تنخواہ

کا ایک اصول وضع کیا ہے، جو یہ ہے -منصب x ۲ + سوار x ۲ + رقم خوراک دواب = ماہانہ منصب، وہ لکھتے ہیں-

"یہ فارمولہ میری گھڑت نہیں، اگر چہ ایسی گھڑت میں بھی کوئی عیب نہیں ہے، جو میزانِ امتحان میں پوری اتر جائے ،مگر یہ ضابطہ خود ابوالفضل نے آئینِ منصب میں بیان کیا ہے-وہ لکھتا ہے،یوز باشی یازدہ گونہ باشد نخست آن کہ بادے صد سوار بودہ شد،ماہوارہ ہفصد روپیہ یازدہم آن کہ بادے سوارے نبود،پانصدروپیہ ونہ میانی رادر ہردہ سواربست روپیہ افزودہ گردد"-

عبدالرحمٰن صاحب پھر لکھتے ہیں:-

"جب یوز باشی با صد سوار ۷۰۰ پاتا تھا اور یوز باشی داخلی کے سوار کو ۵۰۰ ملتے تھے،تو نتیجہ یہ ہے کہ سواروں پر دو سو روپے منصب دار کے حق ہوتے تھے یعنی فی سوار دو روپے یہی نتیجہ دس سواروں پر بیس روپے سے نکلتا ہے،رہا خرچ تو اب جب اس کو حساب کرکے نکالا تو ۲۰۳ روپے نکلا، اس اضافہ ۳ روپیہ کو ذرا حساب سے خارج کر دیجئے اور پھر دیکھ لیجئے کہ ہم نے جو ضابطہ بیان کیا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں (منصب x ۲ + صد سوار x ۲ خوراک دواب = ۷۰۰ یہی یوز باشی با صد سوار کا ماہوار ابوالفضل نے لکھا ہے) رہا تمن، تیرہ کا حذف، اس قسم کی بیشی تقریباً ہر منصب کے ماہوارہ میں پائی جاتی ہے- اس نے مجھے بہت دنوں پریشان کر رکھا اور آخر یہ معلوم ہوا کہ دواب کی خوراک کی رقم تحقیقی نہیں، بلکہ تقریبی ہوتی تھی، چناں چہ ضابطہ عالمگیری نام بیاض قلمی میں ہے-

"مبلغ کہ بنا ہر دواب بموجب حساب قرارمی باید، آں

را از تنخواہ و ہمہ طلب سراسری نمودہ، بموجب تنخواہ
در حصہ دواب می گیرند"

یہ سراسری وہی لفظ ہے، جسے ہم سرسری یا تقریبی کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں دواب کا خرچ ہر منصب کا تقریبی پاتے ہیں۔

رہا ضابطہ ماہانہ منصب وہ آئین کے مناصب کاملہ کے اعداد میں غور کرنے سے یہ نکلتا ہے کہ منصب x ۶ برابر ہے ماہانہ منصب کے اور ماہانہ منصب x ۱۲ اس کا سالانہ ہے، پھر اس میں سے تنخواہ ذات کے نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ منصب کی سالانہ رقم کو دو دفعہ ۱۰/۱۲ کیجیے منصب سالانہ تنخواہ ذات نکل آئے گی، یہ ۱۰/۱۲ کا قاعدہ بلا استثناء تمام مناصب کی تنخواہ ذات میں جاری ہوا ہے اور ہو سکتا ہے، اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ منصب x ۶ یعنی یہ چھ کہاں سے پیدا ہو گیا...... منصب وسوار کی ہر ہر اکائی پر دو دو روپیہ خود ابوالفضل بتاتا ہے، چار تو یہ ہو گئے، خوراک دواب جب مناصب کی نکالی تو ہر منصب کے دو چند سے زیادہ نکلی، اس زیادتی کے ساتھ ہم نے وہی عمل کیا، جو یوز باشی کی خوراک دواب کے ۳ روپوں کے ساتھ کیا تھا، اس لیے یہ دوان چاروں کے ساتھ مل کر چھ ہو گئے"۔[1]

تنخواہ دینے کے طریقے:

تنخواہ یا تو نقد یا جاگیر کی شکل میں ملتی تھی، سواروں کی تنخواہ منصب دار ادا کرتے تھے، پیادوں اور توپ چیوں کو تنخواہ نقد ملتی تھی یا اسی رقم کے برابر ان کو کچھ جاگیر دے دی جاتی تھی، منصب داروں کو عموماً جاگیریں ملتی تھیں، اس سے جانبین کو بھی سہولتیں ہوتی تھیں، حکومت کی تنظیم مرکزی ہونے کے سبب دور کے علاقوں کی نگہداشت اچھی طرح ہو نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ دور دور مقامات کی مال گذاری کی تحصیل جاگیرداروں کے حوالہ کر دی جاتی تھی، منصب دار بھی جاگیر کو نعمت سمجھتے تھے کیوں کہ اول تو وہ تنخواہ کے معاملہ میں شاہی دربار کی رضا و رغبت سے مستغنی رہتے تھے اور پھر جاگیر کے حسنِ انتظام سے کافی رقم پس ماندہ کر لیتے تھے، منصب داروں کو جاگیر عموماً

[1] روئداد ادارہ معارف اسلامیہ جلد اول۔ ص ۲۶۸-۲۷۱

دارالسلطنت سے دور مقامات پر دی جاتی تھی، اگر جاگیر وسعت اور رقبہ میں بڑی ہوتی تھی، تو جاگیردار خود انتظام کرتے تھے اور ان کا علاقہ نیم خود مختار ہوتا تھا، اگر جاگیر چھوٹی ہوتی تو جاگیردار فوج دار کے حوالے کر دیتے تھے، جو مال گذاری وصول کر کے ان کو ادا کرتے تھے۔

تنخواہ یا جاگیر حاصل کرنے کے طریقے:

ایک درخواست جو حقیقت کہلاتی تھی، اس میں درخواست دہندہ اپنا نام ملازمت، منذرہ، تاریخ اور دوسری تفصیل لکھتا، یہ درخواست "دیوان تن" کے پاس جاتی، جو اسے دیوان اعلیٰ کے پاس بھیجتا، یہ بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کرتا، جہاں سے رضامندی حاصل کرنے کے بعد وزیر تنخواہ یا جاگیر کا حکم صادر کرتا۔ یہ درخواست دیوان تن کے میر منشی کے پاس آتی، جو اس پر "سیاہ ودل" لکھ دیتا..... اس کے بعد واقعہ نویس کے پاس یہ کاغذ بھیج دیا جاتا، جو اسے "واقعہ" میں درج کر لیتا، وہ اس کاغذ کی یادداشت تیار کر کے "عرض مکرر" کے لیے دفتر میں بھیج دیتا یادداشت میں وہی باتیں ہوتیں، جو حقیقت اور دول میں رہتیں، اس یادداشت کو وزیر "واقعہ" سے تصدیق کرنے کا حکم جاری کرتا، یہ تصدیق ہو کر آتی، تو دفتر کے داروغہ کے پاس جاتی، جہاں سے منظوری صادر ہوتی۔

جرمانے:

فوجی تہذیب میں اگر کسی قسم کی بے اعتدالی ہوتی، تو جرمانے کیے جاتے۔ جرمانے تین چیزوں پر ضرور عائد کیے جاتے (۱) تفاوت اسپ (۲) تفاوت اسلحہ (۳) تفاوت تابنیان۔

۱۔ تفاوت اسپ، اگر داغ کے گھوڑوں کی نوعیت میں فرق ہوتا، تو ایک مقررہ رقم منصب داروں کی تنخواہ سے کم کر لی جاتی تھی مثلاً ایک ترکی گھوڑے کے بجائے عراقی دکھلایا جاتا، تو بارہ روپیہ ترکی کے بجائے "مجنس" تو چھ روپیہ، تازی کے بجائے ترکی تو آٹھ روپیہ، یابو کے بجائے ترکی، تو نو روپیہ کم کر لیے جاتے۔ اسی طرح ترکی، یابو، تازی کے بجائے جنگلی گھوڑے دکھائے جاتے۔ تو بارہ دس اور آٹھ روپیہ علی الترتیب کم کر لیے جاتے۔

۲۔ تفاوت اسلحہ، ملاحظہ کے وقت سواروں سپاہیوں، ہاتھیوں یا گھوڑوں کے ساز و سامان میں کسی قسم کی کمی ہوتی، تو جرمانے کیے جاتے تھے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

منصب	رقم جرمانہ مندرجہ ذیل سامان نہ ہونے کا سبب				
	خود	بکتر	پاکھر	رانک	ساپہ
	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی
۴۰۰	۲-۰-۰	۵-۰-۰	۴-۰-۰	۴-۰-۰	۱-۰-۰
۳۵۰	۲-۰-۰	۴-۰-۰	۳-۱۲-۰	۱-۱۲-۰	۰-۱۵-۰
۳۰۰	۱-۱۲-۰	۴-۰-۰	۳-۸-۰	۱-۸-۰	۰-۱۴-۰
۲۵۰	۱-۸-۰	۳-۸-۰	۳-۴-۰	۱-۴-۰	۰-۱۳-۰
۲۰۰	۱-۰-۰	۳-۰-۰	۳-۰-۰	۱-۰-۰	۰-۱۲-۰

۳۔ تفاوت تابنیاں:

اسی طرح ملاحظہ کے وقت مقررہ تعداد سے سوار کچھ کم رہتے، تو بھی جرمانے عائد کیے جاتے تھے۔ چار مہینے کی تنخواہ سے ڈھائی روپے، پانچ روپیہ کی تنخواہ سے تین روپے، چھ مہینے کی تنخواہ سے چار روپے، سات مہینے کی تنخواہ سے سات روپے اور آٹھ مہینے کی تنخواہ سے آٹھ روپیہ خدف کر لیے جاتے تھے۔

۴۔ توقف تصحیہ:

ایک مقررہ مدت کے درمیان شناخت (verification) نہ ہوتی، تو منصب داروں کی پوری اور احدیوں کی آدھی تنخواہ تخفیف کر لی جاتی۔

۵۔ گھوڑوں کی برطرفی اور ساقطی:

جب سواروں میں سے کسی کے گھوڑے مر جاتے یا بے کار ہو جاتے، تو ان کو اسپہ اور دو اسپہ کی شرح سے رقم ادا کی جاتی یعنی اگر ایک سوار کا ایک گھوڑا مر جاتا یا بے کار ہو جاتا، تو اس کو

۵۔ گھوڑوں کی برطرفی اور ساقطی:

جب سواروں میں سے کسی کے گھوڑے مرجاتے یا بے کار ہو جاتے، تو ان کو اسپہ اور دواسپہ کی شرح سے رقم ادا کی جاتی یعنی اگر ایک سوار کا ایک گھوڑا مرجاتا یا بے کار ہو جاتا، تو اس کو اسپہ کے حساب سے ادا کیا جاتا تھا اور اگر اس کے دونوں گھوڑے بے کار ہو جاتے یا مرجاتے تو اس کو ایک ماہ تک تنخواہ دی جاتی اور اس بعد وہ کوئی گھوڑا بہم نہ کرتا، تو اس کی تنخواہ روک دی جاتی تھی۔

اگر کسی احدی کا گھوڑا مرجاتا، تو بخشی ایک ساقط نامہ لکھ دیتا تھا، جس سے اس کی تنخواہ مل جاتی تھی اور اگر اس کا گھوڑا صدر مقام سے دور نہیں مرتا، تو مردہ گھوڑے کے داغ کا نشان اور دم صدر مقام بھیج دی جاتی۔

۶۔ غیر حاضری:

اگر کوئی سپاہی چوکی سے تین متواتر حاضریوں میں غائب رہتا، تو اس کی تنخواہ تخفیف کر دی جاتی اور اگر چوتھی بار وہ حاضر نہ ہوتا، تو وہ معزول کر دیا جاتا اور اس کی تنخواہیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ رات کی ڈیوٹی یا جائزہ میں سے کوئی غائب رہتا ہے، تو ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے اور اگر شاہی معائنہ یا عیدین کے روز وہ غائب ہوتا ہے، تو اس کی آدھے دن کی تنخواہ جاتی رہتی۔

۷۔ بیماری:

بیماری کے سبب چوکی سے تین بار غیر حاضری معاف کی جاتی تھی، لیکن اس کے بعد تنخواہ روک لی جاتی تھی اور ایک بیماری نامہ (میڈیکل سرٹیفکیٹ) طلب کیا جاتا تھا، جس کے بعد رخصت ادا کی جاتی تھی۔

۸۔ رخصت:

اگر کوئی اپنے کام سے رخصت لے کر جاتا، تو اس کو ایک مہینے کی رخصت نصف تنخواہ کے ساتھ دی جاتی تھی اور اگر وہ ایک مہینہ سے زیادہ دن رہتا، تو اس کو تنخواہ کا ۱/۵ یا ۱/۱۰ ادا کیا

جاتا تھا۔ تین مہینہ کی غیر حاضری کے بعد وہ مفرورین میں شامل کرلیا جاتا تھا۔ شادی یا غم کے موقع پر ایک سپاہی اپنی ڈیوٹی سے صرف ایک مرتبہ غیر حاضر ہوسکتا تھا اور اگر کچھ زیادہ دیر ہوجاتی، تو اس کی اس تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔

۹۔ فراری:

اگر کوئی لشکر سے تنخواہ لینے کے بعد فرار ہوجاتا، تو اتنی رقم اس کے قبض (تنخواہ کا بل) کے حاشیہ پر لکھ دی جاتی تھی اور اس کی ضمانت والی رقم سے وصول کرلی جاتی تھی، اگر ایک بندوقچی ایک افسر کی ملازمت چھوڑ کر دوسرے کے ماتحت چلا جاتا، تو اس کی نصف ماہ کی تنخواہ ضبط کرلی جاتی تھی اور اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ میر دیہہ یا ساد یوال نے اس کو ورغلا کر اپنے یہاں ملازم رکھ لیا ہے، تو پھر ایسے افسروں کو خود جرمانے ادا کرنے ہوتے تھے۔

۱۰۔ فوتی:

اس کے لیے مختلف قوانین مروج تھے، عموماً یہ ہوتا کہ اگر کوئی فطری موت مرتا، تو اس کے وارثوں کو ایک مہینے کی تنخواہ ادا کی جاتی اور اگر کوئی سرکاری خدمت انجام دیتے ہوئے مارا جاتا، تو اس کے وارثوں کو پورے مہینہ کی تنخواہ دی جاتی تھی، مگر اس کے لیے قاضی کے ہاں سے وارث نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا[1]۔

اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں منصب داروں اور فوجوں کی تنخواہوں کا معیار تھوڑی سی کمی و زیادتی کے ساتھ قریب قریب یہی رہا[2]۔

---

[1] یہ تمام تفصیلات آئینِ اکبری میں موجود ہیں اور نیز دیکھو Army of The Indian mughals -by Irvine

[2] تزکِ جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے: "بطریق عموم حکم کردم کہ مناصب و جاگیر ہائے نوکران پدر من برقرار باشد بعد از ان بقدر حالت ہر کس بر منصبہائے ایشان افزودہ دوازدہ کم نہ دادہ ہی و چہل اضافہ مقرر گشت و علوفہ جمیع احدیان را از فراز دہ پانزدہ و ماہیانہ کل شاگرد پیشہ دوازدہ فرموم ...... و مدد معاش اہالی ائمہ ممالک محروسہ را کہ لشکر دہ عہد یک قلم مطابق فرامین کردہ شد بر قرار و مسلم گذاشتم" (ص ۴ نولکشور)

عالمگیر کے زمانہ میں یورپین سیاح برابر آتے رہے، انھوں نے عالمگیری فوج پر وضاحت کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ منوچی نے فوجوں کی جو سالانہ تنخواہیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

	اول	دوم	سوم
پنج ہزاری	۲۰۵۰۰۰۰	۱۰۲۵۰۰۰	۶۸۰۶۳۰
چار ہزاری	۲۰۰۰۰۰	۱۰۰ ۰۰۰	۶۶۶۰۰
سہ ہزاری	۱۵۰۰۰۰	۷۵۰۰۰	۵۰۰۰۰
دو ہزاری	۱۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰	۳۳۳۳۳

	اول	دوم	سوم
یک ہزاری	۵۰۰۰۰	۲۵۰۰۰	۱۶۶۶۶
نہ صدی	۳۳۷۵۰	۱۶۸۷۵	۱۱۲۵۰
ہشت صدی	۳۰۰۰۰	۱۵۰۰۰	۱۰۰۰۰
ہفت صدی	۲۶۲۵۰	۱۳۱۲۵	۸۷۵۰
شش صدی	۲۲۵۰۰	۱۱۲۵۰	۷۵۰۰
پنج صدی	۱۸۷۵۰	۰	۶۲۵۰
چہار صدی	۱۵۰۰۰	۷۵۰۰	۵۰۰۰
سہ صدی	۱۱۲۵۰	۵۶۲۵	۳۷۵۰
دو صدی	۷۵۰۰	۳۷۵۰	۲۵۰۰
یک صدی	۳۷۵۰	۱۸۷۵	۱۲۵۰
چہار بستی	۳۰۰۰	۱۵۰۰	۱۰۰۰
سہ بستی	۲۲۵۰ -	۱۱۲۵	۷۵۰
دو بستی	۱۰۰۰	۷۵۰	۵۰۰

لیکن اردن نے دستور الانشا اور دستور العمل کے حوالہ سے اس عہد کی جو سالانہ تنخواہیں لکھی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

مناسب	اول	دوم	سوم
ہفت ہزاری	۳۵۰۰۰۰	+	+
شش ہزاری	۳۰۰۰۰۰	+	+
پنج ہزاری	۲۵۰۰۰۰	۲۴۲۵۰۰	۲۳۵۰۰۰
چہار ہزاری و پنج صدی	۲۷۵۰۰۰	۲۱۷۵۰۰	۲۱۰۰۰۰
چہار ہزاری	۲۰۰۰۰۰	۱۹۲۵۰۰	۱۸۵۰۰۰
ہزاری پنج صدی	۱۷۵۰۰۰	۱۶۷۵۰۰	۱۶۰۰۰۰
سہ ہزاری	۱۵۰۰۰۰	۱۴۲۵۰۰	۱۳۵۰۰۰
دو ہزاری پنج صدی	۱۲۵۰۰۰	۱۱۷۵۰۰	۱۱۰۰۰۰
دو ہزاری	۱۰۰۰۰۰	۹۲۵۰۰	۸۵۰۰۰
یک ہزاری و پنج صدی	۷۵۰۰۰	۶۷۵۰۰	۶۰۰۰۰
یک ہزاری	۵۰۰۰۰	۴۷۵۰۰	۴۵۰۰۰
نہ صدی	۳۷۵۰۰	۳۶۲۵۰	۳۵۰۰۰
ہشت صدی	۳۱۲۵۰	۳۰۰۰۰	۲۸۷۵۰
ہفت سدی	۲۷۵۰۰	۲۴۲۵۰	۲۵۰۰۰
شش صدی	۲۳۷۵۰	۲۲۵۰۰	۲۱۲۵۰
پنج صدی	۲۰۰۰۰	۱۸۷۵۰	۱۷۵۰۰
چہار صدی	۱۲۵۰۰	۱۲۰۰۰	۱۱۵۰۰

برنیر کا بیان ہے کہ عہد عالمگیری میں ایک اسپہ سوار کو پچیس روپیہ اور دو اسپہ سواروں کو نسبتۂ کچھ زیادہ تنخواہ ملتی تھی، لیکن سواروں کو کم یا زیادہ دینا بہت کچھ امیروں کی فیاضی پر موقوف

تھا، پیدل سپاہ کی تنخواہ میں پندرہ یا دس روپیہ ہوتی تھی، گولہ اندازوں کی تنخواہ بہت زیادہ ہوتی تھی، خصوصاً فرنگی گولہ انداز بہت زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔ جب مغل توپ چلانے کے فن سے بہت کم واقف تھے، تو اہل فرنگ کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار تھی، مگر جب مغلوں کو اس میں مہارت حاصل ہوگئی، تو عالمگیر ان فرنگیوں کو مشکل سے نوکر رکھتا تھا اور رکھتا بھی تو بیس روپیہ سے زیادہ تنخواہ نہیں دیتا تھا۔[1]

(جولائی ۱۹۳۷ء)

[1] سفرنامہ برنیر اردو ترجمہ۔ مطبع ابراہیم پریس۔ ص ۹۰-۲۸۹

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی عہدے، خطابات و امتیازات

اعلیٰ کمانڈار بادشاہ:

بادشاہ وقت خود فوج کا اعلیٰ سردار ہوتا تھا، حکومت کی تمام فوج اسی کے ماتحت ہوتی تھی، وہ دوسرے فوجی عہدیداروں کی طرح میدان جنگ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ غزنویوں کے عہد سے لے کر تیموریوں کے آخری دور تک کوئی حکمران ایسا نہیں گزرا، جس نے جنگ میں شرکت نہ کی ہو، شمس الدین التمش کا حریف یعنی سندھ کا آزاد حکمران ناصر الدین قباچہ، ابراہیم لودھی اور شیر شاہ سوری تو میدان جنگ میں ہی میں جاں بحق ہوئے۔

شہزادے:

اگر بادشاہ کسی سبب سے میدان جنگ میں شریک نہ ہوسکتا تھا تو شہزادے اس کی قائم مقامی کرتے، سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب فرزند شہزادہ محمد سلطان مغلوں سے لڑتا ہوا مارا گیا[۱]، سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے ارکلی خان نے ایک لشکر جرار کے ساتھ اودھ کے حاکم ملک چھجو کی بغاوت[۲] فرو کی، سلطان علاؤ الدین خلجی کے لڑکے خضر خان نے راجپوتانہ کی مہم کی رہنمائی[۳] کی، سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں شہزادہ جونا خان نے تلنگانہ اور ارنگل فتح کیے[۴]، سلطان محمد تغلق نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج تمام معزز افراد کے ساتھ قراجیل کی مہم پر روانہ کی۔[۵]

---

۱ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ص ۱۰۹۔
۲ ایضاً، ص ۱۸۲
۳ تاریخ مبارک شاہی از یحییٰ سرہندی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ص ۷۷
۴ ایضاً، ص ۹۲-۹۳ و برنی ص ۴۴۶
۵ تاریخ مبارک شاہی ص ۷۸

تیموری دور میں شہزادوں کو اس وقت تک کوئی منصب ہی نہیں ملتا تھا، جب تک وہ کسی مہم میں شریک نہ ہوتے تھے، شہزادہ سلیم اکبر کا بہت ہی چہیتا بیٹا تھا لیکن وہ بھی میواڑ کے رانا کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا، اکبر کا دوسرا لڑکا شہزادہ مراد تو دکن کے فوجی کیمپ ہی میں مرا، جہانگیر کے زمانہ میں شہزادہ خرم نے میواڑ اور دکن کی متواتر لڑائیوں میں جو نمایاں کام کیے، وہی اس کے تخت وتاج کے حاصل کرنے میں معاون ہوئے، شہزادہ پرویز، میواڑ، مانڈو، خاندیس اور برار کی مہموں پر بھیجا گیا، شاہجہاں کی حکومت میں دارا قندھار کی مہم پر ۱۰۷ منصب داروں کے ساتھ گیا[۱]، دکن کی تسخیر کے لیے شہزادہ شجاع بھی بھیجا گیا، اسی عہد میں بیجاپور گولکنڈہ بلخ اور قندھار کی مہموں میں شاہی فوج کی کمان شہزادہ اورنگ زیب کے ہاتھ میں تھی، شہزادہ مراد جب بلخ و بدخشاں کے لیے روانہ کیا گیا تو سلطنت کے ۲۲۰۸ فوجی سردار اس کے ساتھ تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں شہزادہ معظم نے ۱۶۶۳ء میں مرہٹوں اور بیجاپور کے خلاف فوج کشی کی، ۱۶۸۳ء میں شہزادہ اعظم پرتگالیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے گوا بھیجا گیا، ۱۷۰۲ء میں شہزادہ کام بخش دکن کی مہم پر روانہ کیا گیا۔

جانشینی کی جنگ میں شہزادے اپنی ہی کمان میں فوج کو لے کر میدان میں اترتے تھے، ان میں بہت سے لڑتے ہوئے مارے بھی گئے، شہزادہ ہندال ہمایوں کی حمایت میں قندھار کے محاصرہ میں جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ دارا میدان جنگ میں تو نہیں، لیکن جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اورنگ زیب کے لڑکوں میں اعظم شاہ اور کام بخش کی جانیں لڑائی ہی میں تلف ہوئیں، بہادر شاہ اول کے بعد شہزادہ عظیم الشان، رفیع الشان، جہان شاہ اور فرخندہ اختر جنگ ہی میں مارے گئے۔

معزز عہدیدار:

اس زمانہ میں سلطنت کا انتظامی اور فوجی نظام کچھ ایسا ملا جلا تھا کہ بعض اوقات فوجوں کی کمان ان معزز عہدیداروں کے بھی سپرد کر دی جاتی تھی جو سول یعنی انتظامی فرائض انجام دیتے تھے مثلاً سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں الغ خاں جب امیر حاجب تھا تو وہ ۱۶۴۳ء میں کوہ جود

---

[۱] عمل صالح از محمد صالح کنبوہ۔ جلد دوم ص ۳۶۳

اور تنتدنہ کی مہم میں شاہی لشکر کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر روانہ ہوا[۱] اور جب ناصر الدین محمود کا نائب مملکت ہو گیا، تو بھی اہم مہمات میں فوجیں اسی کی نگرانی میں بھیجی جاتی تھیں۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں نصرت خان وزیر تھا لیکن گجرات اور نہروالہ کی تسخیر اسی نے کی۔[۲]

انتظامی معاملات میں علاؤ الدین خلجی کا نائب ملک کافور تھا، لیکن جب دیوگیر شاہی فوج بھیجی گئی تو ملک کافور ہی اس کا سر لشکر تھا[۳]، قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے عہد میں ملک دینار ظفر خان گجرات کا والی مقرر ہوا، تو اسی کی فوجی رہنمائی میں گجرات کے سارے علاقے فتح کئے گئے[۴]، اسی کے عہد میں خسرو خان وزیر بھی تھا اور سر لشکر بھی، تمام ملکی معاملات اسی کے مشورے سے طے پاتے تھے اور فوجیں بھی اسی کے ماتحت تھیں اور بڑی بڑی مہموں پر اسی کی نگرانی میں لشکر روانہ کیا جاتا تھا[۵]، فیروز شاہ کے عہد میں خانجہاں تاتار خان، ملک نائب باربک ابراہیم خان، عماد الملک شبیر سلطانی رزم و بزم دونوں میں اپنے سپاہیانہ کمال اور دانشمندانہ تدبر کا جوہر دکھلاتے تھے[۶]، فیروز شاہ نے لکھنوتی میں جنگ کی، تو لڑائی کے میدان میں فیروز شاہ کا میر شکار ملک دیلان تیس ہزار سواروں کے ساتھ میمنہ کا سردار مقرر کیا گیا تھا۔[۷]

غرض انتظامی اور فوجی عہدیداروں کی خدمات ضرورت کے وقت بزم و رزم دونوں میں حاصل کی جاتی تھیں، ہر صوبہ کا گورنر جو اقطاع دار یا مقطع یا والی یا نائب وزیر کہلاتا تھا، اپنے علاقہ کا فوجی کمانڈر بھی ہوتا تھا۔

تیموری دور میں بھی انتظامی عہدیدار فوجی خدمات انجام دیتے رہے، ہمایوں اور اکبر کے عہد میں بیرم خان وکیل السلطنت[۸] یعنی وزیر اعظم کے عہدہ پر مامور تھا، لیکن میدان جنگ میں

---

۱ طبقات ناصری ص ۲۰۹

۲ برنی ص ۲۳۱-۲۳۹

۳ ایضاً ص ۳۲۶

۴ ایضاً ص ۳۸۸

۵ ایضاً ص ۳۹۱

۶ تاتار خان لکھنوتی کی جنگ میں تیس ہزار بہادر سواروں کے ساتھ قلب لشکر میں متعین تھا اور وہی سر لشکر تھا۔

۷ تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف تیسرا مقدمہ۔ ۸ مآثر الامراء، جلد اول ص ۳۷۵

اس کی تبرد آزمائی کی وجہ سے تیموری سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی، بیرم خان کے بعد خانخانان منعم خان وکیل السلطنت ہوا تو انتظامی امور کے ساتھ فوجی مہم میں بھی شریک ہوتا تھا، چنانچہ اکبر نے اپنے چھٹے سال جلوس میں جب مشرقی اضلاع پر لشکر کشی کی تو اس کے ساتھ منعم خان بھی تھا، شمس الدین محمد خان آتکہ وکیل السلطنت کے عہدہ پر فائز ہوا، تو ابوالفضل کا بیان ہے۔

"تنظیم معاقد مالی و ملکی و انصرام مہام سپاہی و رعیت برای آزین خود گرفتہ محفل آرائے عتبۂ اقبال شد۔" (اکبرنامہ جلد دوم ص ۱۳۹)

جہانگیر کے زمانہ میں شریف خان وکیل ہوا، تو اس کو امیر الامراء کا بھی خطاب ملا اور وہ دربار کا سب سے زیادہ جلیل القدر امیر سمجھا جاتا تھا، جہانگیر کے چوتھے سال جلوس میں شہزادہ پرویز دکن کی مہم پر ملک عنبر کے خلاف بھیجا گیا، تو اس کے ساتھ ملک الامراء وکیل السلطنت شریف خان بھی تھا۔[۲]

شاہجہانی عہد کے وکیل السلطنت آصف خان نے بیجاپور میں عادل شاہیوں کے خلاف شاہی فوج کی رہنمائی کی۔[۳]

صوبہ کا حاکم اعلیٰ سپہ سالار یا صوبہ دار یا ناظم کہلاتا تھا، اپنے صوبہ کا اعلیٰ فوجی کمانڈر بھی ہوتا تھا، سپہ سالار کے بہت سے فرائض کی تفصیل آئین اکبری میں ہے، ان فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ فوجوں کا نگہبان ہوتا تھا۔

"جانشین خدیو عالم است، سپاہ صوبہ و رعیت فرمان پذیر او۔" (آئین اکبری ص ۱۹۵)

جب بھی آس پاس کے علاقہ میں بغاوت ہو جاتی، تو اس کو وہی اپنی نگرانی میں فرو کرتا یا قرب وجوار میں کوئی فوجی مہم بھیجی جاتی، تو اسی کی رہنمائی میں بھیجی جاتی، ضرورت کے وقت

۱۔ اکبرنامہ جلد دوم ص ۱۴۷

۲۔ اقبال نامۂ جہانگیری ص ۳-۳۹

۳۔ بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ص ۱۲، ۲۱

مدد اور آزمودہ کار ناظم دارالسلطنت میں طلب کر لیے جاتے اور دور دراز علاقوں کی اہم فوجی مہم پر بھیجے جاتے۔

عارض:

بادشاہ اور شہزادوں کے بعد غزنوی دور میں اعلیٰ فوجی عہدہ دار صاحب دیوان عرض یا عارض کہلاتا تھا، وہ جنگی اور حربی امور میں بادشاہ کا خاص مشیر ہوتا تھا، اس کی حیثیت وزیر جنگ کی ہوتی، جس کا رتبہ وزیر اعظم سے کچھ ہی کم تھا، لشکر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسی پر ہوتی تھی، وہ ہر سال فوجی معائنہ کرتا تھا اور سلطنت کی تمام فوجیں آراستہ و مسلح ہو کر اس کے سامنے سے گذرتی تھیں، اس موقع پر اکثر سلطان بھی موجود رہتا تھا۔

عارض کے پاس ایک رجسٹر ہوتا تھا، جس میں فوج کی حاضری، بیماری اور موت کی تفصیل درج رہتی تھی، اس کی ایک نقل دیوانِ رسالت میں بھی حوالہ کے لیے رکھی جاتی تھی، سلطان جب کسی مہم پر جاتا تھا تو عارض فوجی کیمپ میں لشکریوں اور اُن کے جانوروں کے خورد ونوش کا سامان اور دوسری ضروریات بھی پوری کرتا تھا، نقل وحمل میں سہولتیں بہم پہنچانا بھی اس کے ذمہ ہوتا، جنگ کے بعد مالِ غنیمت کا بھی وہ محافظ ہوتا تھا جو سلطان کے سامنے حسب مراتب تمام لشکریوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

عارض کا مددگار نائب عرض ہوتا جو تنخواہیں تقسیم کیا کرتا تھا، ہر صوبہ کی فوج کے لیے ایک عارض اور ایک نائب عارض ہوتا، دونوں مرکزی حکومت کے عارض کے ماتحت ہوتے، احتیاطاً صوبہ کے عارض کا ایک لڑکا دارالسلطنت میں ضمانت کے طور پر روک لیا جاتا تھا۔[۱]

غلاموں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں عارض کا عہدہ تو قائم رہا، لیکن اس کی حیثیت کچھ بدل گئی، عارض جو کبھی عرض ممالک [۲] یا دیوان عرض [۳] یا سر لشکر ملک کہلاتا تھا، قریب قریب

[۱] بیہقی جلد اول، بحوالہ محمود آف غزنہ، مولفہ ڈاکٹر محمد ناظم، ص ۱۳۶، ۱۳۷

[۲] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی، ص ۲۴۳، ۲۴۸، ۱۹۷، ۱۷۳

[۳] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف، ص ۲۴۳، ۲۹۸، وبرنی، ص ۱۱۲، ۶۰، ۲۷۷، ۳۶۰

وہی فرائض انجام دیتا تھا جو غزنویوں کے عہد میں اس کے ذمے تھے، مگر وہ وزیر حرب نہ رہا، اگرچہ جنگ کے سلسلہ میں مجلس مشاورت میں ضرور شریک رہتا تھا، وہ خود کوئی حکم صادر نہ کرتا بلکہ بادشاہ کے احکام کو عمل میں لاتا تھا، وہ جب خود کسی کو مقرر یا برطرف کرنا چاہتا، تو بادشاہ کی اجازت کے بغیر نہ کرتا، کسی مہم کے لیے لشکر تو وہ تیار کرتا تھا مگر سر لشکر بادشاہ مقرر کرتا تھا، یہ عہدہ ہر زمانہ میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اور اس پر ہمیشہ بڑے معزز امراء مامور کیے جاتے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں اس عہدہ پر امیر خسرو کے نانا عماد الملک فائز تھے، ان کا لقب عرض ممالک کے بجائے راوت عرض تھا[1]، بلبن کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ فوج کے سلسلہ میں جو چاہتے تھے کرتے تھے، بلبن مداخلت نہ کرتا تھا[2]، لیکن خود عماد الملک کو اپنے عہدے کی ذمہ داری کا غیر معمولی احساس تھا، چنانچہ ایک موقع پر اپنے لشکریوں اور ماتحتوں کو مخاطب کر کے کہا۔

> ”میں بادشاہوں کی ملک داری کا نگہبان، معاون اور مددگار ہوں، کیوں کہ انھوں نے اپنی ساری فوج میرے ہاتھ میں دے دی ہے اور فوج کے تمام معاملات (حل و عقد، قبض و بسط) میرے سپرد ہیں، اگر میں لشکر کے کام میں غفلت کروں اور لشکریوں کی فراہمی کی شب و روز فکر میں نہ رہوں اور اُن کو اپنے بھائیوں اور لڑکوں سے بہتر نہ سمجھوں تو دنیا میں حرام خور کہلاؤں گا اور قیامت کے روز خداوند تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہوں گا“۔ (برنی ص ۱۱۶)

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں عارض کا لقب عماد الملک ہی ہو گیا تھا، اس عہدہ پر

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنی انگریزی کتاب لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو کے ص ۲۹ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مرہٹی اور گجراتی زبان میں راوت کے معنی ”سوار“ گھوڑا رکھنے والا ہے، راوت عرض غالباً اضافت مقلوبی کے ساتھ عرض راوت ہو، رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن (اکتوبر ۱۹۳۷ء) کے ایک مقالہ نگار کا خیال ہے کہ راوت ہندوؤں کی ایک قوم ہے، عماد الملک نسلی حیثیت سے راوت تھے، اس لیے راوت عرض کہلاتے لیکن یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

[2] بلبن عماد الملک کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ ”در دیوان عرض و مطلق العنان باشد“ (ص ۱۱۵)

سلطان کا ایک غلام شبیر مامور تھا، جس نے اپنے اعلیٰ کردار و اخلاقِ حسنہ کی وجہ سلطان کے مزاج میں بڑا درخور حاصل کر لیا تھا، اسی لیے اس عہدہ کا بڑا اعزاز اور وقار تھا، عماد الملک محل میں جہاں اور جب چاہتا آجا سکتا اور سلطان سے ہر قسم کی گفتگو کر سکتا تھا، جس کو چاہتا جاگیر دلواتا جس کو چاہتا معزول کرا دیتا، اس کے ساتھ پانچ ہزار سوار اور پہلوان برابر رہتے تھے اور وہ خود شاہی لشکر کی فلاح و بہبود میں برابر کوشاں رہتا، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے۔ (ص ۳۳۸)

"سرلشکر جیوش حضرت فیروز شاہ بود، برائے غم خوارگی زمرۂ حشم و فرقہ خدم کوشش بسیار می نمود در مدت چہل سال بر ہیچ یاری ذرّہ ظلم نہ کردہ"۔

عارض کا مددگار نائب عارض کہلاتا ہے[۱]۔

میر بخشی یا بخشی الممالک:

تیموری دور میں عارض کا عہدہ میر بخشی یا بخشی الممالک کہلاتا تھا، اس کے فرائض کی نوعیت عارض ہی جیسی تھی، لیکن یہ عہدہ عزت و وقار کے لحاظ سے بہت اہم ہوتا گیا، اس لیے فرائض میں بھی کچھ اضافہ ہوتا رہا۔

عارض کی طرح وہ لشکریوں کو بھرتی کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا، سپاہیوں کی حاضری، غیر حاضری، رخصت، تنخواہوں کی حقیقت یادداشت تعلیقہ، لشکریوں کی برطرفی، علالت اور موت احدیوں کی تصحیحہ، سواروں کی چہرہ نویسی[۲] وغیرہ کی ساری تفصیلات اسی کے دفتر میں جو توجیہ کہلاتا موجود رہتی تھیں، اہل کنک یعنی شاہی محل کے محافظوں کا بھی نگراں میر بخشی ہی ہوتا تھا[۳]۔

جب منصب داری نظام قائم ہوا تو تمام منصب داروں کی فہرست میر بخشی ہی کے پاس ہوتی، اسی کی وساطت سے ہر منصب دار بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا[۴]، اسی لیے وہ شاہی

۱۔ برنی، ص ۳۳۸ ۲۔ آئین اکبری جلد اول دفتر دوم آئین ۴-۵
۳۔ اکبر نامہ، جلد سوم ص ۸۳۱ ۴۔ دستور الانشاء منشی یار محمد، مطبوعہ کلکتہ، ص ۳۰۱

دربار میں بادشاہ کے تخت کے دائیں جانب کھڑا رہتا، کبھی کبھی وہ شاہی محل کے اندر بھی گفت وشنید کے لیے طلب کیا جاتا، فوجی خدمات کے سلسلہ میں جاگیریں دی جاتی تھیں، ان میں شاہی فرمان پر دیوان کے ساتھ بخشی کی مہریں بھی ثبت کی جاتیں، اسی طرح پر "داخچے اور "برأت" پر بھی اس کی مہریں ہوتی تھیں۔[۱]

ہر منصب دار کے لشکری اور گھوڑے، تصحیحہ، چہرہ نویسی اور داغ کے معائنہ کے لیے میر بخشی کی خدمت میں پیش کئے جاتے[۲]، ان کاموں کو انجام دینے کے لیے میر بخشی کے ماتحت بخشی، داروغہ، امین اور مشرف معاون ہوتے[۳]۔

جب کوئی لشکر میدانِ جنگ کو جاتا تو میر بخشی میدانِ جنگ کا نقشہ تیار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا اور لشکر کے ہر بازو پر منصب داروں کو وہیں متعین کر دیتا۔[۴]

فوجی کیمپ کے ساتھ بھی میر بخشی ہوتا، اراکین دربار اور منصب دار اسی کی اجازت سے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتے۔[۵]

کوچ کرتے وقت راستے کی ساری دقتیں میر بخشی کے ذریعہ سے دور کی جاتیں۔ جہانگیر جب احمد آباد سے آگرہ آ رہا تھا، تو دریاہی میں کشتیاں دست یاب نہ ہوسکیں، چناں چہ میر بخشی خواجہ ابوالحسن نے تین دن میں ایک پل بنوا دیا، جس کے ذریعہ لشکریوں نے دریا کو عبور کیا، جہانگیر اس پل کا ذکر کرتا ہے۔

"واز آنجا بمنزل پیش شتافتہ از پلے کہ بر بالاے می بستہ شدہ بودو عبور فرمودم با آنکہ درین دریا کشتی نبود کہ پل توان بست و آب بغایت عمیق و تندمی گذشت، بہ حسن اہتمام

---

[۱] آئین اکبری جلد اول، دفتر دوم آئین ۱۱-۱۲

[۲] آئین اکبری جلد اول، دفتر دوم آئین، ۷-۸

[۳] مرآۃ احمدی مطبوعہ بمبئی جلد دوم، ص ۱۱۸

[۴] دستور الانشاء ص ۳۰۱ [۵] آئین اکبری، آئین، دفتر اول، آئین ۱۷

خواجہ ابوالحسن میر بخشی پیش از دو سہ روز پلے در نہایت استحکام کہ طول پلک صدوچہل درعہ و عرض چہار درعہ است مرتب گشتہ بجہت امتحان فرمودم کہ فیل کن سند رخاص را کہ از فیلان کلان قوی ہیکل است با سہ مادہ فیل از روے پل گزرانیدند بنوعے مستحکم بستہ شدہ بود کہ قوایم او از بار فیل کوہ پیکر اصلاً متزلزل نہ گشت"۔ (تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور پریس، ص ۳۳۸)

کبھی میر بخشی فوجی مہم کی بھی رہنمائی کرتا مثلاً اکبر کے میر بخشی شہباز خان نے قلعۂ سوانہ (جودھپور) کی تسخیر کی پھر صوبہ بہار میں راجہ گج پتی کے خلاف لشکر کشی کی تو جگدیش پور اور شیر گڑھ کے قلعہ کو فتح کیا، اسی مہم میں قلعۂ رہتاس کو بھی زیر نگیں کیا، رانا پرتاپ کے خلاف بھی وہ جا کر لڑا[۱]۔ اکبر کے میر بخشی شیخ فرید نے تو اپنے ایک دلیرانہ کارنامہ سے تیموری سلطنت کے وارثوں کی قسمت ہی بدل دی، اکبر بستر مرگ پر تھا کہ میرزا عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ نے شہزادہ خسرو کی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہا لیکن شیخ فرید شہزادہ سلیم کی قیام گاہ پر پہنچا اور اس کو بادشاہ تسلیم کر کے مبارک باد پیش کی، تمام امراء نے شیخ فرید ہی کا اتباع کیا، شہزادہ سلیم سریر آرائے سلطنت ہوا، جہانگیر نے شیخ فرید کو صاحب السیف والقلم کا خطاب دے کر اس کو اپنی حکومت کا بھی میر بخشی بنایا اور اسی کی نگرانی میں شہزادہ خسرو کے تعاقب کے لیے شاہی فوج بھیجی[۲]۔

شاہجہاں نے بلخ کی تسخیر کے لیے شہزادہ مراد کو روانہ کیا، تو اس مہم میں میر بخشی اصالت خان شاہی فوج کے دست راست کے طرح کا نگران تھا[۳]، میدان جنگ میں لشکر کے ہر بازو میں ایک ایک بخشی بھی ہوتا تھا، میر بخشی کے مددگار و معاون مختلف بخشی ہوتے تھے جو بخشی دوم و بخشی سوم کہلاتے تھے، جن کے فرائض میر بخشی ہی کے حکم سے متعین ہوتے تھے، احدیوں کا ایک علحدہ بخشی ہوتا تھا[۴] جہانگیر کے زمانہ میں ایک عہدہ بخشی حضور کا بھی تھا، جو غالباً ہمیشہ بادشاہ کے ہم رکاب رہتا تھا،

[۱] ماثر الامراء جلد ۲ ص ۷۰۱ ۔ ۵۹۰ [۲] ماثر الامراء جلد دوم ص ۶۳۷، ۶۳۶

[۳] ایضاً جلد اول ص ۱۷۱ [۴] آئین اکبری جلد اول دفتر دوم آئین ۳

شاہی شاگرد پیشہ کے لیے بھی ایک بخشی ہوا کرتا تھا[۱] جس کے لیے کوئی معزز درباری منتخب کیا جاتا تھا۔

میر بخشی کا عہدہ وکیل السلطنت کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا، اس کی حیثیت دیوان سے کم نہ ہوتی تھی، عام طور سے کسی بڑے معزز منصب دار کو اس عہدہ پر مامور کیا جاتا تھا، جس کے بعد وہ کسی صوبہ کا ناظم یا سپہ سالار بنا دیا جاتا یا دیوان ہی مقرر ہو جاتا، وہ صاحب قلم اور صاحب سیف دونوں ہوتا، فرخ سیر کے زمانہ میں حسین علی خان میر بخشی کے عہدہ پر مامور ہوا، تو اس کے فوجی کارناموں کے صلہ میں اس کو امیر الامراء بہادر فیروز جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا اور وہ سلطنت کی انتظامی اور فوجی معاملات کے تمام جزو کل پر حاوی رہا۔[۲]

سپہ سالار:

غزنویوں کے دور میں عارض کے بعد دوسرا اعلیٰ فوجی عہدیدار سپہ سالار ہوتا تھا جو ہر صوبہ میں علٰحدہ علٰحدہ مقرر کیے جاتے تھے، محمود غزنوی کے زمانہ میں خراسان کی سپہ سالاری اس کے بھائی نصر اور پھر یوسف کے سپرد تھی، بقیہ ہر صوبہ میں ایک ترکمانی سپہ سالار مقرر ہوتا تھا۔

سپہ سالار کے ماتحت عہدے:

غزنویوں کے عہد میں سپہ سالار سے نیچے حاجب ہوتا تھا، اس کے ماتحت سرہنگ ہوتا تھا، جس کی نگرانی میں پانچ سو سوار ہوتے، اس کے بعد قائد کا عہدہ تھا جو ایک سو سوار کا سردار ہوتا تھا، اس کے نیچے خیل تاش ہوتے، جن کے ماتحت دس دس سوار رہتے تھے۔[۳]

عہد سلاطین دہلی کے دوسرے فوجی عہدے:

سلاطین دہلی کے زمانے میں سپہ سالار کا عہدہ اعلیٰ نہیں سمجھا جاتا تھا، دس سواروں کا

۱۔ مثال کے لیے دیکھو ماثر الامراء جلد اول ص ۵،۱۷، ص ۳۱۱

۲۔ ماثر الامراء جلد اول ص ۳۲۲

۳۔ بیہقی ص ۲۹۷، ۳۳۲، ۱۳۹، ۳۶۹، ۲۳، ۲۲، ۲۳ وغیرہ بحوالہ محمود آف غزنہ از ڈاکٹر محمد ناظم ص ۱۳۲۔

سردار سرخیل کہلاتا تھا، دس سرخیل ایک سپہ سالار کی نگرانی میں رہتے تھے، دس سپہ سالار ایک امیر کے ماتحت ہوتے تھے، دس امیر ایک ملک اور دس ملک ایک خان کی سرداری قبول کرتے تھے، ایک خان لاکھ سوار ایک ملک دس ہزار سوار ایک امیر ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار، ایک سو سوار اور ایک سرخیل دس سوار رکھتا تھا[1]، بادشاہ کی عدم موجودگی میں جو خان کسی مہم میں لشکر کی رہنمائی کرتا وہ سرلشکر کہلاتا تھا[2]۔ لڑائی کے موقع پر ہر صف کے لیے ایک علٰحدہ خان رہتا تھا، اگلی صف کا نگراں مقدم یا سرلشکر مقدمہ میمنہ اور میسرہ نگہبان علی الترتیب سرفوج میسرہ کہلاتے تھے[3]۔ قلب میں بادشاہ کے خاص محافظوں کی نگرانی سرجاندار کرتے تھے جو قلب کے دونوں بازوؤں پر ہوتے تھے، اس لیے سرجاندار میمنہ اور سرجاندار میسرہ کہلاتے تھے[4]۔ قلب میں خاصہ خیل یعنی لشکر کے شاہی غلاموں کے سردار میر غلاماں کے ماتحت ہوتے تھے[5]، قربیگ یعنی شاہی علم بردار بھی ایک ممتاز فوجی عہدہ دار تھا جو میمنہ اور میسرہ میں متعین کیا جاتا تھا[6]، سہم الحشم اور شحنۂ چشم غالباً پیادوں کے نگران ہوتے تھے[7]۔ ہر لشکر کے ساتھ ایک قاضی اور امیر داد یا دادبک بھی ہوتا قاضی نماز کی امامت کرتا اور امیر یا دادبک لشکریوں کے باہمی جھگڑے چکاتا[8]۔ ہر لشکر کے ساتھ ایک کیفیت نویس بھی ہوتا، جو فوج کی تمام کیفیات بادشاہ کو لکھ بھیجتا تھا[8]، غزنویوں کے زمانے میں اس کام کا انجام دینے والا صاحب برید کہلاتا تھا، میدانِ جنگ میں شاہی علم کے محافظ کو علم دار بھی کہتے تھے۔

شاہی اصطبل کا داروغہ میر اخور یا اخربک کے لقب سے ملقب ہوتا، وہ فوج کے گھوڑوں کا افسرِ اعلیٰ بھی سمجھا جاتا، اس عہدہ پر بہت ہی معزز ملک یا خان مقرر ہوتا تھا[9]، ہاتھیوں کے نگران کا خطاب شحنۂ پیل تھا[10] اور اونٹوں کے نگہبان کو شحنۂ شتر کہتے تھے[11]۔ آلاتِ حرب کے محافظ

---

1. تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ۱۴۵
2. ایضاً ۳۶۶، ۳۳۱
3. تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۲۶۰
4. تاریخ مبارک شاہی ص ۶۳
5. برنی ص ۳۰
6. تاریخ مبارک شاہی ص ۶۳
7. ایضاً ص ۶۳ و برنی ص ۳۰
8. برنی ص ۳۶۱-۳۵۸
9. جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھتیجے اور داماد الغ خان کو آخر بیگ بنایا (برنی ص ۱۷۷)
10. محمود غزنوی کے زمانے میں ہاتھیوں کے نگران کو مقدم پیلبانان کہتے تھے۔
11. تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۳۳۷-۳۴۰

کا لقب سر سلاحدار تھا، شاہی جھنڈوں کا نگراں توربیگ کہلاتا تھا، تیموریوں کی فوج کا نظم و نسق منصب داری نظام پر قائم تھا، لیکن عہدے تقریباً وہی رہے جو سلاطین دہلی کے عہد میں تھے، البتہ نام اور کام کی نوعیت میں کچھ تھوڑا تھوڑا سا فرق پیدا ہوتا گیا مثلاً اس دور میں شاہی اصطبل کے نگراں کو آختہ بیگی اور ہاتھیوں کے افسر اعلیٰ کو داروغہ فیل خانہ اور اونٹوں کے انچارج کو داروغہ شتر خانہ کہتے تھے، البتہ اس عہد میں توپ اور آتشیں اسلحہ کی کثرت ہوئی تو فوج میں اس کا علحدہ شعبہ قائم کیا گیا، جس کا افسر اعلیٰ میر آتش مقرر ہوا، جو داروغہ توپ خانہ بھی کہلاتا تھا۔

القاب و امتیازات:

غزنویوں کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ معزز لقب امیر کا تھا، غزنین کے فرماں روا امیر ہی کہلاتے تھے مثلاً امیر سبکتگین، امیر الپتگین، امیر بلکاتگین وغیرہ محمود نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب سلطان کا لقب اختیار کیا تو امیر کا خطاب اس کے لڑکوں کے لیے مخصوص ہوگیا، لیکن مسعود کے زمانہ میں امیر ارکانِ سلطنت اور فوجی سرداروں کا لقب ہوگیا، چنانچہ مسعود کا وزیر حسنک جس نے بہت سے معرکے سر کیے، امیر کے لقب سے ملقب تھا۔

غوریوں نے شروع میں اپنے نام کے ساتھ امیر ہی استعمال کیا مثلاً امیر فولاد غوری شنسی، امیر بنجی ابن بہاراں شنسی، امیر سوری بن محمد وغیرہ لیکن بعد میں ملک کا لقب اختیار کیا مثلاً ملک قطب الدین الحسن بن محمد بن عباس، ملک عزالدین الحسین بن الحسن، ابوالسلاطین، ملک ناصرالدین الحسین محمد المادینی۔ الخ

معزالدین سام المعروف بہ شہاب الدین غوری کے نام کے ساتھ ملک کا لقب استعمال نہیں ہوا، اس کے زمانہ میں ملک اور امیر عام طور سے اراکین سلطنت اور فوجی سرداروں کا لقب تھا اور ملک میں سب سے زیادہ معزز فوجی خطاب تھا اور امیر اس سے کچھ کم درجہ کا تھا۔

ایلتتمش کے بعد سے خان کا لقب سب سے زیادہ معزز سمجھا جانے لگا، بلبن سے لے کر شیر شاہ تک ہر فرماں روا کے لڑکوں کے نام کے ساتھ خان کا لقب استعمال ہوا، بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدہ داروں کو بھی اسی لقب سے ملقب کیا جاتا، فوجی سرداروں کے لیے خان سے پہلے کچھ

ایسے اسمائے صفت استعمال کئے جاتے تھے، جن سے اُن کی جنگی شوکت وعظمت اور فوجی دبدبہ کا اظہار ہوتا تھا مثلاً قتلغ خان، الغ خان، کزل خان، بغرا خان، طغرا خان، الپ خان، کت خان، ظفر خان، شیر خان، نصرت خان وغیرہ کبھی خان کو زیادہ معزز بنا کر خانخانان کر دیا جاتا مثلاً خانخانان اختیار الدین (جلال الدین خلجی کے لڑکے کا لقب تھا) خانخانان حسام الدین خسرو خان، ناصر الدین کے بھائی کا خطاب تھا، خانخانان بہلول لودھی سلطان کا تخت نشین ہونے سے پہلے کا خطاب تھا جو خاندانِ سادات کے بادشاہ محمد شاہ نے دیا تھا، خانخانان لوحانی اور خانخانان ہیبت خان یہ دونوں سلطان سکندر لودھی کے فوجی سردار تھے) کبھی خان کو خان اعظم یا خان معظم یا خان جہاں بنا کر بھی سوقر کیا جاتا تھا مثلاً خانِ اعظم الغ خان (سلطان بلبن کا بادشاہ ہونے سے پہلے کا لقب تھا) خانِ معظم تاتار خان اور خان جہاں دونوں فیروز شاہ تغلق کے معزز ارکان سلطنت اور فوجی سردار تھے۔

ملک خان سے اور امیر ملک سے نسبتہً کمتر درجہ کا لقب تھا، صبح الاعشیٰ کا مصنف محمد تغلق کی فوج کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لشکر کا اعلیٰ عہدیدار خاں ہوتا ہے، اس کے بعد ملک پھر امیر، پھر سپہ سالار، پھر عام لشکری مگر کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ فوج کا اعلیٰ عہدیدار خان کا لقب نہ رکھتا تھا، معزالدین بہرام شاہ کے زمانہ میں نظام الملک مغلوں کے خلاف فوج لے کر گیا، لیکن وہ خان کے لقب سے ملقب نہیں تھا، علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں ملک کافور بہت بڑا فوجی سردار تھا، لیکن اس کے نام کے ساتھ خان کا لقب کبھی استعمال نہیں ہوا، محمد تغلق کے دور میں فیروز کی سرداری میں بہت سے خطے تسخیر ہوئے، لیکن اس کا خطاب ملک باربک ہی رہا، مگر ایسی مثالیں کم ہیں، عام طور سے اعلیٰ فوجی عہدیدار خان کے لقب سے ضرور سرفراز کئے جاتے تھے۔

سادات، لودھیوں اور سوریوں کے زمانہ میں ملک اور امیر نظر نہیں آتے ہیں، اُن کے دور میں یہ القاب ختم کر دیئے گئے تھے اور ہر فوجی عہدہ دار خان ہی کے لقب سے ملقب ہوتا تھا۔

ہندو بھی خطابات سے سرفراز کئے جاتے تھے، ان کو رائے یا راؤ کا خطاب ملتا تھا، بلبن کے عہد میں کے ذکر میں مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ:

"درایان وراؤ دگان و مقدمان آمدہ درگاہ راخا کبوس کنانید ندی" (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۱) علاؤالدین خلجی نے دیوگیر کے مفتوح راجہ رام دیو کو رائے رایان کا خطاب دیا"۔ (تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۲۶)

بابر کے ساتھ جو فوجی سردار ہندوستان آئے، اُن کے نام کے ساتھ کوئی خاص لقب نہ تھا، اُس نے پانی پت اور کنواہا کی لڑائیوں میں فتح پانے کے بعد بھی اپنے فوجی سرداروں کو کسی خطاب اور لقب سے سرفراز نہیں کیا، لیکن ہندوستان کے بعض امراء کو خطابات دیے مثلاً جب ۱۵۲۴ء میں ہندوستان پر تیسری بار حملہ آور ہوا اور دہلی فتح کیے بغیر کابل واپس چلا گیا، تو دولت خان کے لڑکے دلاور خان کو اُس کی فوجی خدمات کے صلہ میں خانخانان کا خطاب دیا، اسی طرح فتح خان سروانی الخاطب بہ اعظم ہمایوں کو خانجہان کا لقب دیا، اس کو یہ پسند نہ تھا کہ ہمایوں کا نام اس کے لڑکے کے سوا کسی اور کا ہو، مگر بابر کے لیے خطابات کا عطا کرنا ایک عجیب بات تھی، وہ خود ہی لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں دستور ہے کہ جن امراء کا مرتبہ دربار شاہی میں بڑھایا جاتا ہے، اُن کو مقررہ خطاب بھی دیے جاتے ہیں، ان ہی خطابوں میں سے ایک خطاب اعظم ہمایوں ہے، ایک خانجہان ہے اور ایک خانخانان ہے، اس کے (یعنی خواجہ فتح خان سروانی) باپ کا خطاب اعظم ہمایوں تھا چوں کہ شہزادہ کا نام ہمایوں تھا، اس لیے اب خطاب کو میں نے موقوف کر دیا اور فتح خان سروانی کو خان جہان کا خطاب دیا گیا"

ہمایوں نے بھی ہندوستان کے پیش رو مسلمان فرماں رواؤں کی روایت کے مطابق یہاں کے امراء اور فوجی سرداروں کو خطاب دینے شروع کیے مثلاً اچہ کے ایک زمین دار کو اُس کی خدمات کے صلہ میں خان جہان کا خطاب دیا[1]، اس نے اپنے محبوب رفیق اور غم گسار بیرم بیگ کو خانخانان کے لقب سے سرفراز کیا، طبقات اکبری میں ہے:

---

[1] تذکرۃ الواقعات ہمایوں از جوہر انگریزی ترجمہ میجر چارلس اسٹورٹ ص ۱۴۱

"او (یعنی بیرم) در ملازمت حضرت آشیانی بمرتبہ خانخانانی وامیر الامرائی رسیدہ بمنصب اتالیقی شاہزادہ عالی مقدار اکبر شاہ امتیاز یافتہ بود"۔[۱]

ہمایوں کے ہندوستانی فوجی سردار بدستور سابق خان رہے اور اس کے باپ کے عہد کے بعض سرداروں کے نام کے آگے بھی خان کے لقب کا اضافہ ہوا، مثلاً عبداللہ خان[۲] اوزبک، شاہ ابوالمعالی علی قلی خان شنسانی[۳]، بہادر خان[۴]، حاجی محمد خان[۵]، تردی بیگ خان[۶]۔

اکبری دور کے بعد سے خان معزز اور خانخانان بہت ہی معزز لقب ہو گیا، ہر دور ایک خانخانان ہوتا تھا مثلاً اکبر کے زمانہ میں خانخانان بیرم خان، اس کے بعد خانخانان منعم خان اور خانخانان عبدالرحیم تھے، جہانگیری عہد میں مرزا عبدالرحیم ہی خانخانان رہا، شاہجہانی حکومت میں مہابت خان اور یمین الدولہ آصف خان خانخانان ہوئے، عالمگیری دور میں نواب معظم خان خانخانان تھا جو میر جملہ کے نام سے مشہور تھا، بہادر شاہ اوّل کے وزیر اور سپہ سالار منعم خان کا لقب خانخانان بہادر ظفر جنگ ہوا۔

تیموری دور سے پہلے سلاطین کے عہد کی طرح خان کو زیادہ موقر بنانے کے لیے بھی خان جہاں، خان دوران، خان زمان، خان عالم، خان اعظم اور خان معظم کر دیا جاتا تھا اور توصیفی اسماء کا بھی اضافہ ہو جاتا تھا، مثلاً بلند خان، دلاور خان، فدائی خان، مقرب خان، صف شکن خان، رعد انداز خان، زبردست خان ہمت خان وغیرہ۔

اکبر نے ہندوؤں سے بھی فوجی خدمت لی اور ان کو خطابات دیے، جو تین قسم کے تھے (۱) رائے رایان (۲) راجہ (۳) رائے، رائے رایان، امیر الامراء اور خانخانان کے برابر تھا، رائے اور راجہ خان کے مساوی ہوتے تھے، رائے کے ساتھ توصیفی اسماء ملانے کا بھی دستور تھا، مثلاً سر بلند رائے۔[۷]

---

[۱] طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۲۵
[۲، ۴، ۵، ۶] جوہر ص ۱۳۲، ۱۳۲، ۱۳۲، ۳۲۔
[۳] طبقات اکبری جلد دوم ص ۵۲
[۷] اقبال نامہ جہانگیری اردو ترجمہ ص ۱۴۱

مناسب:

ان خطابات کے علاوہ اکبر نے مختلف فوجی مناصب قائم کیے جو دوازدہ ہزاری سے ہاشمی تک تھے، ہر تیموری شاہزادہ کے لیے فوجی مہم پر جانا ضروری تھا، اس لیے فوجی سرداروں کی طرح اس کے بھی مناصب مقرر ہوتے تھے۔

اکبر کے عہد میں ہفت ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھے، اکبر نے پہلے شاہزادہ سلیم کو دہ ہزاری مراد کو ہفت ہزاری اور دانیال کو شش ہزاری منصب عطا کیا، لیکن بعد میں سلیم کو دوازدہ ہزاری امراء کو نہ ہزاری اور دانیال کو ہفت ہزاری بنایا اور دوسرے مناصب کا اعزاز امراء اور فوجی سرداروں کے لیے تھا، شروع میں اکبر کے اعلیٰ فوجی عہدیدار پنج ہزاری سے زیادہ مناصب پر فائز نہیں ہوئے، لیکن آخر میں راجہ مان سنگھ، میرزا شاہ رُخ، عزیز خان کوکہ اور خان معظم ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کیے گیے۔

اکبری دور کے بعد مناصب کی تعداد بڑھتی گئی، جہانگیر کے عہد میں شہزادہ خرم کا منصب سی ہزاری تھا اور جب جہانگیر اس سے ناخوش ہوا تو اس نے شہزادہ پرویز کا منصب چہل ہزاری کردیا، شاہجہاں کے عہد میں داراشکوہ کا بھی یہی منصب رہا۔

امراء اور فوجی سرداروں میں کسی کا منصب ہفت ہزاری سے نہیں بڑھا، البتہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے خسر اعتمادالدولہ اور آصف الدولہ دونوں کا منصب نہ ہزاری تھا، وہ شاہی خاندان ہی کے افراد سمجھے جاتے تھے۔

اکبر کی حکومت کے آخری دور سے منصب میں کچھ ترمیم اور اضافہ بھی ہوتا گیا مثلاً پہلے صرف پنج ہزاری، چہار ہزاری، سہ ہزاری وغیرہ مناصب تھے لیکن پھر اُن کے ساتھ سوار کے منصب کا بھی اضافہ ہونے لگا، مثلاً پنج ہزاری، پنج ہزار سوار، پہلا منصب ذات کہلاتا تھا اور دوسرا منصب سوار، منصب ذات اصلی منصب ہوتا تھا، جس کے حساب سے منصب دار کو جاگیر اور تنخواہیں ملتی تھیں، منصب سوار کی تعداد کے لحاظ سے منصب دار کو سوار رکھنا پڑتا تھا، اس قسم کے منصب کے تین درجے تھے، اول، دوم، سوم، اگر سواروں کی تعداد منصب کے اعداد کے برابر ہے مثلاً پنج

ہزاری، پنج ہزار سوار تو یہ منصب اوّل درجہ کا شمار کیا جاتا تھا، اگر سواروں کی تعداد منصب کے اعداد سے نصف یا نصف سے زیادہ ہے مثلاً پنج ہزاری، چہار ہزار سوار یا پانچ ہزاری سہ ہزاری سوار تو یہ دوسرے درجہ کا منصب سمجھا جاتا تھا اور نصف سے بھی کم ہوا تو یہ تیسرے درجہ کا منصب ہوتا تھا، سہ ہزاری سے ہفت ہزاری منصب میں ترقی یک ہزار کی ہوتی تھی مثلاً سہ ہزاری سے چہار ہزاری ہو جاتا تھا، یک ہزاری سے دو ہزاری پنج صدی منصب میں پنج صدی اور اس سے نیچے والے منصب میں یک صدی کی ترقی ہوتی تھی۔

جہانگیر کے زمانہ میں سوار کے منصب کے ساتھ ایک اسپہ دو اسپہ و سہ اسپہ کے امتیاز کا بھی اضافہ ہوا، مثلاً سہ ہزاری سوار یک اسپہ، سہ ہزاری سوار یک اسپہ، دو اسپہ پنج ہزاری پنج ہزار، دو اسپہ، سہ اسپہ، جن سے غالباً یہ مراد تھی کہ ایک منصب دار اپنے سواروں کی مقررہ تعداد کو ایک ایک دو دو اور تین تین گھوڑوں کے ساتھ رکھ سکتا تھا، جہانگیری عہد میں ایسے منصب دار امراء بہت کم تھے لیکن شاہجہانی دور میں بہت زیادہ ہو گئے، بادشاہ نامہ جلد دوم میں ۷۰۵ کی عبارتوں کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں پنج ہزاری منصب والوں کو کم از کم ۶۰۰ سہ اسپہ، ۱۲۰۰، دو اسپہ سے اور ۲۰۰ یک اسپہ سواروں کو داغ کے لیے پیش کرنا پڑتا تھا، یعنی چھ سو سہ اسپہ سوار اٹھارہ سو گھوڑے اور بارہ سو دو اسپہ سوار، چوبیس سو گھوڑے اور دو سو یک اسپہ سوار دو سو گھوڑے رکھتے تھے، یعنی ایک منصب دار کے دو ہزار سوار کے پاس ۴۴۰۰ گھوڑے ہوتے تھے۔

اس منصب داری نظام میں رفتہ رفتہ اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں کہ آج ان کو سمجھنا آسان نہیں اور جو شخص بھی اس کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ایک مختلف نتیجہ پر پہونچتا ہے، مختصر یہ کہ منصب ذات ایک اعزاز تھا اور پھر سوار اور یک اسپہ، دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب مزید امتیاز تھا، شاہجہاں کے زمانے میں یمین الدولہ آصف خان خانان کو نہ ہزاری، نہ ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ، خان دوران بہادر نصرت جنگ و ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار پنج ہزاری سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ، سید خان جہاں بارہہ کو شش ہزاری، شش ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ کے مناصب حاصل تھے۔

انعامات:

ان مناصب کے علاوہ فوجی سردار مختلف قسم کے انعامات سے بھی سرفراز کیے جاتے تھے، تیموریوں سے پہلے فوجی سرداروں کو اُن کے کارناموں کے صلہ میں کوئی جاگیر یا علاقہ یا کوئی بڑا عہدہ دیا جاتا تھا اور ان میں امتیازی شان پیدا کرنے کے لیے ان کو جھنڈے بھی دیے جاتے تھے، صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک خان سات جھنڈے کا استعمال کر سکتا تھا اور امیر کو تین جھنڈے استعمال کرنے کی اجازت تھی۔

تیموری دور میں بھی فوجی سرداروں کو جاگیر، علاقے اور عہدے دیے جانے کا دستور قائم رہا، اس کے ساتھ اور شاہانہ عنایتوں سے بھی نوازا جاتا تھا مثلاً جب کوئی فوجی سردار کسی مہم پر جاتا یا وہاں سے فاتح و کامران واپس آتا تو اس کو مناصب کے علاوہ مختلف قسم کے انعامات بھی دیے جاتے جو حسب ذیل ہوتے۔

(۱) نقد رقم (۲) خلعت جس میں چارقب، ستر لاتی لباس، عبائے زردوزی، قبائے طلا دوزی، دستار زردوزی، طرۂ مروارید، کمر بند مسلسل مروارید، سرپیچ، بالا بند، ارکلان، تسبیح مرصع وغیرہ ہوتی (۳) ہتھیار مثلاً شمشیر مرصع، جمدھر مرصع، خنجر مرصع، جیغہ مرصع، کلغی مرصع، پھول کٹارہ وغیرہ (۴) فیل واسپ با زین مطلا یا نقرہ و با براق طلا و نقرا (۵) نقارہ لوازم شاہی میں داخل تھا لیکن تیموریوں نے اپنے فوجی سرداروں کو بھی یہ امتیاز عطا کیا، یہ اعزاز عموماً دو ہزاری منصب سے اوپر والے فوجی سرداروں کو حاصل ہوتا تھا، جب بادشاہ خود لشکر کے ساتھ ہوتا تھا تو اس کے نقارہ کے سوا کسی اور کا نقارہ نہیں بجتا تھا، اس کے محل اور قیام گاہ کے حدود میں بھی کسی کا نقارہ نہیں بجایا جا سکتا تھا، البتہ جہانگیر کے زمانے میں نور جہاں کے باپ اعتماد الدولہ کے لیے یہ مخصوص رعایت تھی کہ اس نقارہ پایہ تخت میں بھی بجا کرتا تھا[1] (۶) علم و نشانات میں علم و چتر توق تو بادشاہ کے لیے مخصوص تھے لیکن تمن توق اور جھنڈا فوجی سرداروں کو اعزاز کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی۔

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۱۵۸

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں فنونِ جنگ

غزنویوں کی فوج کی صف آرائی:

غزنویوں کے عہد میں لڑائی کے موقع پر فوجوں کی ترتیب میں حسبِ ذیل صفیں ہوتی تھیں۔

(۱) مقدمہ (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب

تاریخ یمینی کے مصنف عتبی کا بیان ہے کہ نار دین کی معرکہ آرائی کے موقع پر سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کی ترتیب اس طرح دی۔

> ''سلطان جب اپنی منزلِ مقصود کے قریب پہونچا، تو اس نے اپنے سواروں کو صفوں میں مرتب کیا اور مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ میمنہ میں اپنے بھائی امیر نصر بن ناصر الدین کو جانباز بہادروں کے ساتھ مقرر کیا۔ میسرہ میں ارسلان الجاذب کو طاقتور نوجوانوں کے ساتھ مامور کیا اور مقدمہ میں عبداللہ محمد بن ابراہیم طے تھے، جس کے ساتھ غیظ و غضب سے بھرے ہوئے عرب سوار تھے۔ قلب میں التون تاش شاہی حاجب تھا، اس کے ہمراہ شاہی غلاموں کی ایک بڑی تعداد پہاڑ بن کر کھڑی تھی۔''[1]

مقدمہ فوج کی اگلی صف، میمنہ دائیں صف، میسرہ بائیں صف اور قلب مرکز کو کہتے تھے۔ کچھ فوجیں عقب میں بھی رہتی ہوں گی، مگر غزنوی دور میں ان ..... کے لیے کون سی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی، معلوم نہیں ہو سکی۔

---

[1] الیٹ جلد دوم ص ۳۸ تاریخ یمینی کا فارسی نسخہ پیشِ نظر نہیں ہے۔ اس لیے الیٹ کی انگریزی عبارت سے میمنہ میسرہ اور قلب کی اصلاح قیاساً کی گئی ہے۔

غوریوں کے لشکر کی صف آرائی:

یہی ترتیب غوریوں کے زمانہ میں بھی رہی ۔ ترائین کی جنگ میں معز الدین محمد بن سام المعروف بہ شہاب الدین غوری نے جو صفوں کی ترتیب دی تھی، ان کے لیے منہاج سراج نے حسب ذیل اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

(۱) قدام لشکر (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب (۵) خلف

اس جنگ میں فوجوں کی صف آرائی کا ذکر منہاج سراج نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ودرحدود تراین لشکر گاہ کردہ سلطان تعبیہ لشکر بساخت و قلب و بنہ درایات و علامات و چیز و پیلان در عقب بقدر چند کردہ بگذاشت صف راست کردہ آہستہ می آمد و سوار برہنہ و جریدہ را چہار فوج فرمودہ بود از طرف کفار نامزد کرد و فرمان داد، می باید کہ از چہار طرف میمنہ و میسرہ و خلف و قدام لشکر بہر طرف دہ ہزار سوار تیرانداز دست بر لشکر کفار می دارند و چون پیلان و سوار و پیادہ ملاعین حملہ می کنند، شما پشت می دہد و تیگ اسپ از پیش ایشان دور می شوید لشکر اسلامیان بہمیران منوال کفار را عاجز کردند حق تعالیٰ اسلام را نصرت بخشید"۔[1]

سلاطین دہلی کی فوجوں کی صف بندی:

غلاموں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں لڑائی کے موقع پر فوجوں کی صفوں کے لیے حسب ذیل اصطلاحات استعمال ہوئیں۔

[1] طبقات ناصری ص۱۲۰ نیز دیکھو مبارک شاہی ص۱۰

(۱) طلایہ [1]، مقدمۂ پیش [2]، یزک [3]، یہ تینوں اصطلاحات فوج کے اس دستہ کے لیے استعمال ہوتی تھیں، جو لشکر سے بہت آگے دشمنوں کی مختلف خبریں پہنچانے پر گویا مامور ہوتا تھا، یہ کبھی کبھی غنیم سے ہلکی جھڑپ بھی کر لیتا تھا۔

(۲) مقدمہ یعنی اگلی صف اس کے کبھی کبھی دو بازو کر دیے جاتے تھے، جو جناح [4] کہلاتا تھا۔

(۳) میسرہ، اس کے دونوں جانب کے حصّہ کو دست راست میسرہ و دست چپ میسرہ کہتے تھے۔

(۴) میمنہ، اس کے دونوں بازو دست راست میمنہ و دست چپ میمنہ کہلاتے تھے۔

(۵) قلب، اس کے دائیں بائیں حصّہ کو دست راست قلب اور دست چپ قلب کہتے تھے۔

(۶) ساقہ یا خلف۔

ہر حصّہ کی نگرانی علٰحدہ علٰحدہ عہدیداروں کے ذمہ ہوتی تھی، اگلی صف کا نگراں مقدم یا سر لشکر مقدمہ کہلاتا تھا [5]۔ میمنہ اور میسرہ کے نگراں علی الترتیب سر فوج میمنہ یا سر فوج میسرہ کے لقب سے ملقب ہوتے تھے [6]، قلب میں بادشاہ اس کا قائم مقام عہدیدار ہوتا تھا۔ بادشاہ کے اردگرد علماء، ائمہ، اطبا، منجمین اور ان کے بعد تیر انداز پرے جمائے کھڑے رہتے تھے [7]، شاہی علم، طبل، بوق، دمامے، نفیری، ارغون، سرنا وغیرہ بادشاہ کے سامنے ہوتے [8]۔ بادشاہ جنگ میں شریک نہ ہوتا تو ساری فوج سر [9] لشکر کے ماتحت ہوتی، جو یا تو وزیر اعظم یا کوئی بہت ہی اعلیٰ رکن سلطنت ہوتا۔

مقدم: سر فوج میسرہ اور سر فوج میمنہ کوئی معزز خان ہوتا تھا، اس کے ماتحت

---

[1] طبقات ناصری ص ۲۸۸-۱۲۲ [2] ایضاً

[3] ایضاً ص ۳۰۱-۱۲۲-برنی ص ۹۰-۳۲۰-فتوح السلاطین ص ۳۲۲ و ص ۳۵۷ وغیرہ

[4] جناح کی اصطلاح بالکل واضح نہیں ہوئی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگلی صف کے بازوؤں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ جناح کے لفظی معنی تو بازو کے ہیں، لیکن اس سے میمنہ یا میسرہ ہرگز مراد نہیں۔ فتوح السلاطین میں ہے۔

چو قلب و جناح و یسار و یمین
دو سو شد مرتب دراں دشت کین

[5] فتوح السلاطین ص ۲۵۰ و برنی ص ۸۹ [6] برنی ص ۲۶۰

[7] صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف نمبر ۹ جلد ۲۶ [8] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۳۷ء

[9] برنی ص ۲۶۸، ۳۳۱، ۳۵۱، ۳۷۷ علاء الدین کے عہد میں سر لشکر ملک نائب کافور تھا۔

ملک، ملک کے ماتحت امیر، امیر کے ماتحت سپہ سالار اور سپہ سالار کے ماتحت سرخیل ہوتے تھے۔ایک ملک زیادہ سے زیادہ دس ہزار سوار، ایک امیر، ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار، ایک سو سوار اور ایک سرخیل یا ایک عارف دس سواروں کی نگرانی کرتا تھا[۱]، قلب میں خاصہ خیل یعنی بادشاہ کے خاص سواروں کی نگرانی سرجاندار کرتے تھے اور وہ قلب کے دونوں بازوؤں پر ہوتے تھے[۲] اس لیے سرجاندار میمنہ اور سرجاندار میسرہ کہلاتے تھے، لشکر میں شاہی غلمان ہوتے، تو وہ امیر غلمان میمنہ و میسرہ کے ماتحت ہوتے تھے[۳]۔

اس عہد کے پیادوں کے نگراں کے لیے اصطلاحات معلوم نہ ہوسکیں، سہم الحشم و نائب سہم الحشم وشلہ حشم فوج کے بعض عہدے تھے[۴]، حشم سے مراد اگر پیادے ہوں، تو شاید یہ عہدے پیادہ فوج ہی سے متعلق ہوں گے۔

ہر حصہ میں گھوڑوں کی نگہبانی کے لیے ایک اخور بک، ہاتھیوں کے لیے ایک شحنۂ پیل، اونٹوں کے لیے ایک شحنۂ شتر، ہتھیاروں کے لیے ایک سرسلاحدار ہوتا تھا۔ ایک چاؤش بھی متعین رہتا تھا، جو اس کی نگرانی کرتا کہ ہر لشکری اپنی اپنی جگہ پر موجود ہے، ایک نقیب احکام سنانے کے لیے مامور ہوتا تھا[۵]، ضوابط اور احکام کی خلاف ورزی یا صفوں میں بے ترتیبی پیدا کرنے کے سلسلہ میں سخت سے سخت سزا مقرر تھی۔ علاؤ الدین خلجی کی فوج کیلی میں مغلوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوئی، تو اس نے اپنی فوج کو یہ حکم سنایا۔

کس از سرفرازاں نجنبد زجائے — مگر ہم بہ فرمانِ فرماں روائے
دگر خود کسے بگذرد زیں سخن — سر خود نہ بیند بہ پہلوئے تن[۶]

صفوں کی ترتیب میں پیادوں، سواروں اور ہاتھیوں کے تقدم و تاخر میں کسی یکساں ضابطہ کی پابندی نہیں ہوتی تھی، مصالح اور مواقع کی بنا پر کبھی پیادے، کبھی سوار اور کبھی ہاتھی آگے رکھے جاتے۔

---

۱ برنی ص ۱۴۵ ۲ مبارک شاہی، ص ۶۲ ۳ برنی ص ۳۸
۴ مبارک شاہی ص ۶۲ و برنی ص ۳۰ ۵ برنی، ص ۳۰ ۶ فتوح السلاطین، ص ۲۵۰

پیادے اگر آگے ہوتے، تو پہلی قطار میں برگستوان، جوشن اور سپر والے تیر انداز رکھے جاتے، دوسری قطار میں زرہ پوش، نیزہ باز اور تیغ انداز سپر کے ساتھ ہوتے، تیسری قطار میں تیرا در گرز برداروں کی جماعت ہوتی، چوتھی قطار، سیف، شمشیر اور گرز والوں پر مشتمل ہوتی، تمام قطاروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی جاتی کہ عقب کے سوار اور دوسرے لشکری سامنے لڑائی کے نشیب و فراز کو دیکھ سکتے تھے یا ضرورت کے وقت ان جگہوں سے ہو کر آگے مدد کے لیے بڑھ سکتے تھے یا آگے بڑھ کر اپنی مقررہ جگہ[1] پر واپس آ سکتے تھے۔

سوار اگر آگے ہوتے، تو زرہ، خود، جوشن، دستوانہ اور برگستوان میں ملبوس، تیر کمان، تیغ، نیزہ اور تبر سے لڑتے۔

ہاتھی بھی آگے ہوتے، تو اُن کے پیچھے سوار ہوتے۔ غیاث الدین اور خسرو خان کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے، امیر خسرو اوّل الذکر کی فوج کی صف آرائی کا حال لکھتے ہیں۔

صف پیلان چو صف ابر آزار ۔۔۔ ہر ابرے، برق حملہ، باد رفتار
نہ سوز ہر پیل چون کوہے با شکوہ ۔۔۔ بروبر گستوان چون ابر بر کوہ
بہ پشت پیل ترکان تیر در شست ۔۔۔ چو کوہے کوہ پشت کوہ بنشست
پس پیلان سواران صف کشیدہ ۔۔۔ بجوش از پشت ماہی تف کشیدہ[2]

ہاتھی ہر صف کے آگے ہوتے۔ علاء الدین خلجی مغلوں کے خلاف کیلی میں جنگ کر رہا تھا، تو فتوح السلاطین کے مؤلف کا بیان ہے کہ:

بہر فوج دو بستگان پیل مست ۔۔۔ بقین کردہ آن خسرو چیرہ دست
ازان زندہ پیلانِ شرزہ شکار ۔۔۔ کہ کس برنگوید درین کار زار
بفرمود پس شاہ والا تبار ۔۔۔ شدہ پیش ہر صف یکے کوہسار
کس از سر فرازان نجنبد زجائے ۔۔۔ مگر ہم بہ فرمان فرمانروائے[3]

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۲ء [2] تغلق نامہ ص ۹۳-۹۴

[3] فتوح السلاطین ص ۲۵۰ نیز دیکھو برنی ص ۳۰۱ سیری کی جنگ میں بھی علاء الدین کی فوج کے ہر حصہ میں ہاتھی تھے۔ برنی کا بیان ہے "و در ہر فوجی و اثنگی پنجگان پیل برگستوانپا کردہ ایستادانیدند،

مگر ہاتھی عموماً بادشاہ کے ساتھ قلب میں ہوتا۔ صبح الاعشیٰ کا مصنف محمد تغلق کی لشکری ترتیب کے سلسلے میں رقم طراز ہے۔

> سلطان خود قلب میں ہوتا،...... اس کے سامنے ہاتھیوں کا جھنڈ ہوتا ہے ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے ہیں، جن پر تیرانداز سوار رہتے ہیں اور پھر ان ہی برجوں کی ہر سمت میں سوراخ بنے ہوتے ہیں، جن سے تاک تاک کر نشانے لگائے جاتے ہیں اور ان ہی ہودجوں میں روغن نفط ہوتا ہے، جو شیشہ کی نلکیوں سے دشمنوں پر اچھالا جاتا ہے، جس سے شعلے پیدا ہوتے ہیں۔[1]

محمد تغلق امیر تیمور کے خلاف معرکہ آرا ہوا، تو اس کی فوج کے قلب ہی میں ہاتھی تھے[2] ابراہیم لودھی پانی پت کی جنگ میں صف آرا ہوا، تو قلب ہی میں اس نے ہاتھی رکھے تھے۔

قلب کے پیچھے آخری صف یعنی ساقہ یا خلف ہوتی، اس کی بھی کئی قطاریں ہوتی تھیں۔ پہلی قطار میں شاہی حرم کی بیگمات ہوتیں، ان ہی کے ساتھ شاہی خزانے، اسلحہ خانے اور باورچی خانے وغیرہ ہوتے۔ دوسری قطار میں فاضل گھوڑے، اونٹ اور مویشی، قیدی اور زخمی سپاہی رکھے جاتے، پھر تیسری قطار میں فوج کا ایک دستہ ہوتا تھا، جو عقب سے دشمنوں کے حملہ کی مدافعت کے لیے تیار رہتا تھا[3]۔ خلف قلب سے چند گز دور پر واقع ہوتا۔[4]

ان مختلف صفوں کے علاوہ کمین گاہوں[5] میں بھی فوجیں پوشیدہ رکھی جاتی تھیں، وہ دشمنوں پر اچانک حملہ کرتی تھیں، کوئی صف کمزور دکھائی دیتی تھی، تو اس کی مدد کو بھی پہنچتی تھیں۔

---

۱ صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف جلد ۲۶ نمبر ۹ — ۲ ظفرنامہ جلد دوم ص ۱۰۶

۳ آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء — ۴ طبقات ناصری ص ۱۳۲

۵ فتوح السلاطین ص ۲۲۵ علاء الدین خلجی کیلی میں مغلوں کے خلاف صف آرا ہوا تو اس کی ہر صف کے پیچھے کمین گاہ تھی۔

پشتی ہر صف کرا ز سے دلیر کمین کردہ چون اژدہا و صید شیر

تیمور کی فوجوں کی صف آرائی:

امیر تیمور نے اپنے لشکر کی صف آرائی کے لیے خاص خاص قوانین وضوابط مرتب کیے تھے، اگر اس کی فوج بارہ ہزار سوار پر مشتمل ہوتی، تو اس کی صف آرائی حسبِ ذیل طریقہ پر ہوتی۔

(۱) قراول

(۲) ہراول

(۳) جرانغار۔ اس کے تین حصے ہوتے، ہراول جرانغار، چپاول جرانغار، ستاول جرانغار۔

(۴) برانغار۔ اس کے بھی تین حصے ہوتے، ہراول برانغار، چپاول برانغار، شتاول برانغار۔

(۵) قول

اور اگر فوج کی تعداد بارہ ہزار سے چالیس ہزار یا اس سے زیادہ ہوتی، تو اس صف آرائی کا نقشہ یہ ہوتا۔

(۱) قراول، قراولِ دستِ راست۔ قراولِ دستِ چپ

(۲) ہراول بزرگ، ہراول ہراول۔

(۳) جرانغار، ہراولِ جرانغار، شتاول، ہراولِ شتاول۔

(۴) برانغار، ہراولِ برانغار، چپاول، ہراولِ چپاول۔

(۵) قول، دستِ راست قول، دستِ چپ قول۔

(۶) عقب۔

قراول یعنی فوج کے آگے رہنے والا دستہ، ہراول کے راست وچپ، غنیم کے لشکر کی دیدبانی کے لیے ہوتا، ہراول بزرگ کے آگے بھی ایک ہراول ہوتا، جس میں فوج کا صرف ایک دستہ ہوتا۔ ہراول، ہراول کے پیچھے ہراول بزرگ کی فوج چھ دستوں میں منقسم ہوتی، اسی طرح جرانغار میں چھ دستے ہوتے۔ ہراول برانغار میں صرف ایک دستہ، شتاول میں چھ اور ہراولِ شتاول میں صرف ایک دستہ ہوتا، برانغار، ہراول برانغار، چپاول اور ہراول چپاول کی یہی ترتیب ہوتی۔ قول کی پہلی صف چھ دستوں میں تقسیم ہوتی، اس کے عقب میں اٹھائیس دستے کھڑے رہتے۔ قول

کے دست راست پر امیر تیمور کے "فرزنداں و نبیرگان" اور دست چپ پر "خویشاوندان اور قرابتان" کی جماعت ہوتی۔ ان کی فوج طرح یعنی فوج محفوظ کہلاتی، جو بوقت ضرورت مختلف صفوں میں مدد کے لیے پہونچتی۔[۱]

بابر کی فوجوں کی ترتیب:

صف آرائی کی یہ اصطلاحیں بدلتی رہیں، پانی پت کی جنگ میں خود بابر کے بیان کے مطابق حسب ذیل صفیں تھیں۔

(۱) قراول۔

(۲) ہراول، اس کے ساتھ فوج محفوظ کی صف طرح ہراول کہلاتی تھی۔

(۳) برانغار، برانغار کے اوج یعنی اس کی داہنی طرف بالکل کنارے پر فوج کا ایک ایسا دستہ تھا، جو پلٹ کر غنیم کے عقب پر تیزوں سے حملہ کرتا تھا، اس کو "تولقمہ اوج جرانغار" کہا جاتا تھا، جرانغار کے ساتھ ایک فوج محفوظ بھی تھی، جو طرح جرانغار کہلاتی تھی۔

(۴) جرانغار، جرانغار کے ساتھ بھی تولقمہ اوج برانغار اور طرح برانغار تھی۔

(۵) قول یا غول یعنی مرکز، اس کے دو حصے تھے، دست راست قول، دستِ چپ قول۔

(۶) طرح قول یعنی فوج محفوظ قول کے پیچھے صف آرا تھی۔

سیکری کی جنگ میں بابر کی فوج کے جرانغار اور برانغار میں دائیں اور بائیں بازو بھی تھے، جن کے لیے یمین جرانغار، یسار جرانغار، یمین برانغار اور یسار جرانغار کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔[۲]

بابر کے جانشینوں کی فوجوں کی صف آرائی:

تیموریوں کی سلطنت ہندوستان میں باضابطہ قائم ہوئی، تو مختلف لڑائیوں کے موقع پر صفوں اور اُن کی اصطلاحات میں تھوڑی تھوڑی ترمیم ہوتی رہی،

---

[۱] تزک تیموری، ص ۲۱۰-۱۹۰ [۲] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۱۲-۳۱۳ و بابر نامہ انگریزی جلد دوم، ص ۶۷، ۵۶۵

(۱) قراول جو کبھی مقدمۃ الجیش ا کبھی منقلاع اور کبھی طلیعہ ۳ یا طلایہ کہلاتا تھا۔

(۲) ہراول، اس کے کبھی کبھی دو بازو، راست ہراول اور چپ ہراول ہو جاتے۔ بدایونی نے جوزۂ ۴ ہراول کی ایک اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کی تشریح خود اس طرح کی ہے۔

"وچند نفر چیدہ و برگزیدہ بھمراھی سید ہاشم بارہہ بیشتر از ہراول نامزد شدند کہ آنرا جوزۂ ہراول می نامیدند"۔

مگر یہ اصطلاح کسی اور مورخ نے استعمال نہیں کی ہے۔ ہراول کی فوج محفوظہ کو التمش ۵ کہتے تھے۔

(۳) جرانغار اس کو کبھی دست چپ، کبھی میسرہ، کبھی صرف یسار کہا جاتا تھا، اس کے دائیں بائیں بازو بھی ہوتے تھے، جو دست راست جرانغار اور دست جرانغار کہلاتے تھے۔ جرانغار کے ساتھ تو لقمہ یا تلقمہ ۶ اور طرح بھی ۷ ہوتا تھا۔

(۴) برانغار جس کے لیے کبھی دست راست، کبھی میمنہ اور کبھی صرف یمین کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اس کے بھی دست راست برانغار اور دست چپ برانغار ہوتے تھے، اس کے ساتھ بھی تولقمہ یا تلقمہ اور طرح ہوتا تھا۔

(۵) قول یا غول یا قلب اس کا بایاں بازو دست چپ قول اور دایاں بازو دست راست قول (یا

ا بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۶۸۸

۲ اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۷، ۳۶، بدایونی جلد دوم ص ۱۵، تزک جہانگیری ص ۳۹۲، ۳۳۶، بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ۱۳، ۲۱۳ وغیرہ وغیرہ

۳ اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۶، جلد سوم ص ۵۰۶ با عمل صالح جلد اول ص ۳۰۶ منتخب اللباب ص ۵۸۹۔

۴ بدایونی، جلد دوم ص ۲۳۱ ۵ اکبر نامہ، جلد سوم ص ۳۵۳، ۳۳۲، ۴۲۵

۶ اکبر نامہ جلد سوم ص ۲۲-۱۵ ۷ لب التواریخ از خافی خاں ۹۰ حصہ دوم ص ۸۷۶

۷ عمل صالح جلد دوم ص ۲۷۷

میسرہ قول یا میمنہ قول [1]) کہلاتا تھا۔ ان دونوں بازوؤں کے پیچھے کچھ فوجیں محفوظ رکھی جاتی تھیں، جو طرح دست راست اور طرح دست چپ کہلاتی تھیں۔ [2]

(۶) چنداول جس کو کبھی چنداول یا ساقہ بھی کہتے تھے، یہ فوج کی پچھلی صف ہوتی تھی، جو فوجی سامان شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی محافظت کے لیے متعین ہوتی تھی۔

صفوں کو ترتیب دینے کا ذمہ دار بخشی الممالک ہوتا تھا۔ جنگ سے ایک روز پہلے وہ بادشاہ یا شہزادہ یا جنگ کے حاکم اعلیٰ کے سامنے فوجوں کی تعداد اور مختلف فوجی سرداروں کی متعینہ جگہوں کا نقشہ پیش کرتا تھا [3]، اسی نقشہ کے بموجب وہ میدان جنگ میں مختلف عہدہ داروں کو مختلف صفوں میں متعین کرتا تھا، لڑائی میں کوئی سردار جنگی خطا کرتا، تو اس کی جگہ پر دوسرے کو متعین کرتا۔ بخشی الممالک کے ماتحت نائب بخشی بھی ان کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے۔ کبھی صف آرائی کی خدمت امیر توزک کے بھی ذمہ کی جاتی تھی [4]، کبھی بادشاہ دار السلطنت سے فوجوں کی صفوں کو ترتیب دے کر ان کو روانہ کرتا، فوجیں اسی ترتیب کے ساتھ میدان جنگ میں کھڑی ہوتیں [5]۔ اہم لڑائیوں میں بادشاہ یا سپہ سالار فوجوں کی صف آرائی بہ نفس نفیس خود کرتے [6] جانشینی کی جنگ کے مواقع پر شہزادے خود ہی صفوں کو ترتیب دیتے۔ [7]

[1] عالمگیر نامہ ص ۶۵ و ص ۹۶

[2] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول ص ۳۰۶، اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۱۹ و ص ۳۲۰۔

[3] تزک تیموری ص ۱۹۲-۱۹۱ و بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۲، ۳۱۳ میں جنگ کے موقع پر نظام الدین علی خلیفہ میر بخشی کی صف آرائی۔ بابر نامہ انگریزی جلد دوم ص ۵۶۸، ۵۶۳۔

[4] عالمگیر نامہ جلد اول ص ۳۳۵

[5] عمل صالح جلد اول ص ۳۶۰، جلد دوم ص ۳۶۲ بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۰۵ جلد دوم ص ۴۸۲

[6] مثال کے لیے دیکھو دارا اور اورنگ زیب کی جنگ، عالمگیر نامہ ص ۹۵-۹۰ و منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۶، ۳۰ و منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۸۸

[7] اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ میدان جنگ میں شہزادوں اور سپہ سالاروں کے ساتھ غیر ضروری لوگ نہ ہوں، کیوں کہ باہجوم توابع وحشم آمدن آنہا از فوج انتظام و نسق فوج را اختلال می گذارد۔ (رقعات عالمگیر ص ۲۲۳، معارف پریس)

ہر صف کا نگراں ایک سردار یا سالار[۱] ہوتا تھا، پھر ہر صف کے لشکری مختلف حصوں میں منقسم کیے جاتے تھے۔ یہ حصے قشون[۲] (قوشون) یا تومان (توسن) یا کبھی چوکی اور کبھی توپ[۳] کہلاتے تھے[۴]۔ ہر قشون کا محافظ ایک علحدہ عہدیدار ہوتا تھا۔ بابر کی فوج میں ان عہدوں کی نگرانی کسی سلطان یا بیگ یا امیر کے ذمہ ہوتی تھی[۵]۔ اکبری دور میں جب منصب داری نظام قائم ہوا، تو پھر فوجوں کے قشوں اور تومان کی نگرانی کوئی معزز منصب دار کرتا تھا۔ وہ ہزاری منصب دار کی رہنمائی میں نو ہزاری سے یک ہزاری منصب دار تک ہوتے تھے، اسی طرح ہشت ہزاری کے ماتحت ہشت صدی تک ہفت ہزاری کے ماتحت ہفت صدی تک، پنج ہزاری کے ماتحت پنج صدی تک اور پنج صدی کے ماتحت یک صدی تک مقرر کیے جاتے تھے[۶]۔ جنگ میں بادشاہ یا شہزادہ شرکت کرتا، تو سارے منصب دار اس کے ماتحت ہوتے۔ بادشاہ یا شہزادہ نہ ہوتا، تو سارے سردار یا سالار سپہ سالار کی نگرانی میں ہوتے تھے[۷]۔ مختلف لشکریوں کا سردار عموماً ان ہی کی قوم کا کوئی منصب دار ہوتا تھا مثلاً راجپوتوں کی چوکی ایک راجپوت منصب دار، افغانوں کا تومان ایک افغانی منصب دار، مغلوں کا قشوں ایک مغل منصب دار کے ماتحت ہوتا، توپچی، برق انداز، تفنگچی اور دیگ انداز وغیرہ ایک ایسے

---

۱ تزوک تیموری ص ۲۰۳، جنگ کے موقع پر مختلف سرداروں اور سالاروں کے نام کے لیے دیکھو اکبر نامہ جلد سوم ص ۲۲۴، عمل صالح جلد اول ص ۳۶۹ جلد دوم ص ۶۳، ص ۳۶۳، بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۰۵، جلد دوم ص ۳۸۲، منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۸۸ وغیرہ وغیرہ

۲ تزوک تیموری ص ۲۰۳، ایلیٹ جلد سوم ص ۴۳۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۲، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۳ و ص ۶۷۴، سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۳

۳ تزوک تیموری ص ۲۰۳، ایلیٹ جلد سوم ص ۴۳۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۲

۴ اکبر نامہ جلد سوم میں ہے تحجیان را فرمان شد کہ فیروزی سپاہ را چوکی بہ چوکی بخشِ بیگی بگذراند، اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۵۴، فانخانان لشکر منصور را چہار توپ گردانید۔

۵ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶–۱۶۵، ۲۱۳–۲۱۲ تیموری فوج کی سرداری ایک امیر ہی کرتا تھا۔ اس کی دو قسمیں تھیں، امیر با تمغا اور امیر بے تمغا (تزوک تیموری ص ۲۰۳)

۶ آئینِ اکبری ص ۱۳۰، آئین در سپاہ آبادی

۷ تیموری فوج کا اعلیٰ ترین عہدیدار امیر الامراء کہلاتا تھا۔ (تزک تیموری ص ۹۱–۱۹۰)

منصب دار کی نگرانی میں رہتے، جو میر آتش کہلاتا تھا۔

صف آرائی میں تفنگچی، برق انداز، سوار، ہاتھی اور پیادے کے تقدم و تاخر میں کسی یکساں ضابطہ کا تحریر کرنا مشکل ہے، مگر بڑی بڑی لڑائیوں کے موقع پر عام طور پر ہراول کی پہلی قطار[۱] میں توپچی، برق انداز، گولہ انداز اور دیگ انداز ہوتے تھے۔ توپیں کبھی بڑے بڑے چھکڑوں (ارابہ) پر رکھی جاتیں، ان میں سے دو دو چھکڑے زنجیر اور چمڑے سے متصل کر دیے جاتے اور دونوں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی جاتی کہ اس میں چھ سات مٹی سے بھرے ہوئے توبڑے رکھے جا سکتے تھے۔ تفنگچی ان چھکڑوں اور توبڑوں کے عقب میں پناہ لے کر تفنگ اندازی کرتے تھے[۲]۔ کبھی توپوں کو آہنی زنجیروں سے اس طرح منسلک کر دیا جاتا تھا کہ دشمن یلغار اور یورش کر کے گھسنے نہ پاتے تھے[۳] کبھی غنیم کی یورش کو روکنے کے لیے توپچیوں کی صف کے آگے عمیق خندقیں بھی کھودی جاتی تھیں[۴]، ارابہ کے بعد اونٹوں اور اونٹوں کے بعد ہاتھیوں کی قطار رہتی[۵] اونٹوں پر سے شتر نال اور زنبورک

---

۱ تیموری فوج کے ہراول میں اوقچیان، و شمشیر زنان و نیزہ داران و بہادران آزمودہ کار ہوتے۔ (تزک ص ۱۹۹)

۲ دیکھو بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۶۲، طبقات اکبری جلد دوم ص ۱۳، منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۴۳ "لفظ توبرہ" اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ اکبر نامہ جلد اول ص ۹۵ میں توبرہ کے بجائے تورہ ہے، بابر نامہ کے اردو ترجمہ میں اس کے معنی "جالی" لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں طبقات اکبری کی عبارت یہ ہے۔

"درمیان ہر دو ارابہ شش ہفت توبرہ تعبیہ نمایندہ تا تفنگ اندازان بروز معرکہ در پناہ ارابہ و توبرہ بفراغت تفنگ توانند انداخت"

منتخب التواریخ میں یہ عبارت اور بھی واضح طریقہ پر لکھی گئی ہے۔

"درمیان ہر دو عرابہ شش ہفت توبرۂ پر خاک تعبیہ نمودند تا روز معرکہ تفنگ اندازان در پناہ عرابہ و توبرہ پر خاک بفراغت توانند انداخت"

توبرہ کی وضاحت منتخب التواریخ کی توضیح سے ہو جاتی ہے، اس لیے ہم بدایونی ہی کو قابل قبول سمجھ کر "توبرہ پر خاک" کو استعمال کرتے ہیں۔

۳ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۳، انگریزی ترجمہ ص ۵۶۴، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۷ نیز دیکھو اورنگ زیب اور دارا کی جنگ سموگڈھ کی تفصیل خافی خان جلد دوم ص ۲۱، ۲۰ کرنال کی جنگ میں توپوں کی زنجیر بندی کے لیے دیکھو سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۲

۴ ملاحظہ ہو سلطان بہادر شاہ اور ہمایوں کی جنگ طبقات اکبری جلد دوم ص ۳۲، اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۳۰ و ۱۳۲

۵ دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی

اور ہاتھیوں پر سے جنال اور گجنال چھوڑی جاتی، ہاتھیوں کے بعد برق انداز سوار ہوتے ہے۱

دیگ انداز، توپچی، برق انداز، تفنگچی، رعد انداز اور برق انداز کی کثرت زیادہ تر ہراول اور اس کے دونوں بازوؤں پر ہوتی، مگر جرانغار، برانغار اور قول کی اگلی قطاریں بھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھیں ۲- اسی طرح کبھی کبھی ہر صف میں ہاتھی بھی ہوتے تھے ۳- جنال اور گجنال کی کمی ہوتی، تو ہاتھیوں پر تیر انداز بٹھائے جاتے، تیر انداز بہادروں کے ہم راہ ایک ہاتھی ایک ہزار سوار کا کام کرتا تھا ۴، ہر صف میں ہاتھی کے پیچھے سوار ہوتے تھے- راجپوت سوار عموماً برچھے سے لڑتے تھے ۵- مغل سواروں کا ہتھیار تیر و کمان تھا، ہر سوار کی کمر میں شمشیر یا تیغ ۶ یا تلوار آویزاں ہوتی، کمر کی دوسری طرف بھی کٹار یا خنجر ہوتا، بائیں کاندھے پر سپر یعنی ڈھال ہوتی، جو لڑتے وقت بائیں ہاتھ میں پکڑلی جاتی، سواروں کے عقب میں پیادے ہوتے- تیموریوں کے زمانہ میں بڑی لڑائیوں میں پیادوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی-

قول میں بادشاہ یا شہزادہ یا سپہ سالار عموماً ہاتھی پر حوضہ زرین اور چتر مدور کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا تھا، وہ ایسی جگہ ہوتا کہ لشکر کے ہر حصہ سے دکھائی دیتا تھا- شاہی جنگی علم کبھی اس کے ہاتھی پر یا کبھی اس کے بالکل قریب دوسرے ہاتھی پر لہراتا رہتا تھا ۷، آس پاس

---

۱ عمل صالح جلد دوم ص ۳۶۵

۲ دیکھو بابر اور رانا سانگا کی جنگ کی تفصیل بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۱،۱۷، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۹ عمل صالح جلد دوم ص ۳۶۵، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۸۳،۸۵ نیز دیکھو منتخب اللباب حصہ دوم میں جاجو کی جنگ کی تفصیل ص ۹۰-۵۸۸

۳ سلطان مظفر گجراتی سے اکبری فوجیں معرکہ آرا ہوئیں، تو ابوالفضل کا بیان ہے، فیلان کوہ پیکر یار فتار در ہر فوج شکوہ دیگر بخشیدند (اکبر نامہ جلد سوم ص ۲۴۴، نیز دیکھو اڑیسہ کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۳، ۶۱۲،۱۳ ص و کابل کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۶۵)-

۴ آئین اکبری باب آئین فیل خانہ ۵ مثال کے لیے دیکھو راجہ بھگونت داس کے اسلحہ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۵

۶ عمل صالح جلد دوم ص ۵

۷ تیمور جب جنگ میں شریک ہوتا، تو قلب میں علم کے پیچھے ہی جلوہ افروز رہتا، ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۳۹

دوسرے ہاتھیوں پر فوجی باجوں کی مختلف قسمیں بھی ہوتیں [۱]۔ بادشاہ یا شہزادہ کی عماری میں اس کی کوئی چہیتی اولاد بھی ہوتی [۲] اس کے ہاتھی کے دونوں جانب اعیان سلطنت اور اولیاں دولت گھوڑوں پر سوار رہتے تھے، کبھی کبھی علماء و فضلاء کی بھی جماعت ساتھ ہوتی تھی [۳]۔ بادشاہ یا سپہ سالار قول سے کوئی حکم صادر کرتا، تو اس کو مختلف حصوں میں تواچی [۴]، یساول [۵] یا سزاول [۶] پہنچاتے، یہی یساول اور سزاول اس کی نگرانی بھی کرتے کہ ہر لشکری اپنی جگہ پر ہو۔ احکام کی پابندی سختی سے عمل میں آتی، عدول حکمی کی سزا موت تھی۔ [۷]

---

[۱] مثال کے طور پر دیکھو، سموگڑھ میں دارا کی فوج کی ترتیب

[۲] نورجہاں مہابت خان سے جنگ کر رہی تھی، تو اس کی عماری میں شہریار کی لڑکی اس کی انگہ اور صبیہ شاہنواز خان ساتھ تھی۔ (اقبال نامہ جہانگیری ص۲۶۲، ۲۶۳) اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جنگ جانشینی ہوئی، تو شہزادہ اعظم کے لڑکے بیدار بخت کے ہاتھی پر اس کا کمسن بچہ بیدار دل تھا، خود شہزادہ اعظم کے ساتھ اس کا شہزادہ علی تبر تھا، اسی جنگ میں اعظم شاہ کے لڑکے شہزادہ والا جاہ کی بیوی ہاتھی کے ہودج میں ایک آتشین گولی کی زد میں آکر جاں بحق ہوئی (منتخب اللباب ص۵۹۳)

[۳] ظفر نامہ، ج۲، ص۱۰۱

[۴] ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص۴۳۶، بابر نامہ اردو ترجمہ ص۳۱۵، اکبر نامہ جلد اول ص۱۰۷، جلد سوم ص۴۳

[۵] بابر نامہ اردو ترجمہ ص۳۲۵، جہانگیر نامہ جلد اول ص۲۲۵

[۶] منتخب اللباب ص۵۹۰، اکبر نامہ جلد سوم ص۸۳، و ص۱۲۲، تزک جہانگیری ص۲۵۳

[۷] تزک تیموری میں ہے:

"وامر نموده که باامیر هر فوج که فرمان برلیغ فرستم مطابق حکم برلیغ نمایند اوازان تخلف نه ورزند، اوہر کس از بکلر بیکیان و امراز حکم تخلف و تجاوز نماید و برابه شمشیر بگذرانند و کومل دیرا که منتظر الامارت باشد بجاے وے نصب کنند" (۲۰۲)

بابر نامہ میں ہے

"جون ارکان لشکر قائم گشته هر کس بجاے خود شتافت، فرمان واجب الاذعان لازم الامتثال شرف اصدار یافت که هیچکس بے حکم از محال خود حرکت ننماید و بے رخصت دست بمحاربه نکشاید" (بابر نامہ اردو ترجمہ، ص۳۱۵)

چنداول قلب کے پیچھے ہوتا، اس کی فوجیں عقب سے غنیم کی یورش روکنے کے لیے مستعد رہتیں، یہ شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی نگہبانی بھی کرتیں، کچھ فوجیں کمین گاہوں میں بھی پوشیدہ ہوتیں۔

صفوں کو ترتیب دیتے وقت مختلف صفوں کے درمیان اور پھر ہر صف میں جا بجا اتنا خلا اور گذرگاہ چھوڑی جاتی تھی کہ عقب کے لشکر کے سامنے کی چیزیں دیکھی جاسکیں اور ضرورت کے وقت مختلف گذرگاہوں سے سواروں کے گھوڑے آسانی سے گذر سکیں [۱] ایک صف سے دوسری صف کا فاصلہ کبھی نصف کوس اور کبھی تیر پرتاب کا ہوتا۔[۲]

ہر صف کے گھوڑوں کی نگہبانی کے لیے ایک اخوربک، ہاتھی کے لیے ایک شحنہ پیل، آتشیں اسلحہ کے لیے ایک میر آتش اور عام اسلحہ کے لیے داروغہ قورخانہ یا قوربیگی ہوتا، قوربیگی کے ہاتھ میں شاہی علم بھی ہوتا۔

[۱] بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۳۶۲ [۲] ایضاً

میدانِ جنگ کے طریقے

میدانِ جنگ کا انتخاب:

عام طور سے معرکۂ کارزار کے لیے ایک بہت ہی وسیع اور کشادہ میدان منتخب کیا جاتا تھا، جس کے لیے حسب ذیل چیزوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا۔

(۱) میدان آبادی سے زیادہ دور اور نہ نزدیک ہو۔

(۲) اس کی زمین سخت ہو، لیکن پتھریلی نہ ہو، تاکہ گھوڑوں کے کھر زخمی نہ ہونے پائیں۔

(۳) زمین گیلی اور ریتیلی نہ ہو، تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔

(۴) زمین پر زیادہ گرد وغبار نہ ہو، تاکہ جنگ کی شدت کے وقت گرد کے بادل اس میں ہارج نہ ہوں۔

(۵) اس کے آس پاس پانی آسانی سے دست یاب ہو جاتا ہو۔[۱]

میدانِ جنگ میں فطری سہولت اور مدافعت بھی مدنظر رکھی جاتی تھی، مثلاً خسرو خان غیاث الدین تغلق سے جنگ کرنے کے لیے سیری سے باہر آیا، تو اس نے حوض علائی کے پاس جنگ کے لیے اس طرح میدان منتخب کیا کہ حوض علائی کے سامنے باغات تھے اور پشت پر دہلی کا حصار تھا۔[۲] محمد تغلق اودھ کے حاکم عین الملک کی بغاوت فرو کرنے کے لیے قنوج پہنچا، تو لڑائی کے وقت اس کے لشکر کی پشت پر شہر قنوج اس کی محافظت کر رہا تھا۔[۳]

کبھی غنیم کے راستے کو مسدود کرنے کے لیے لشکرگاہ اور میدانِ جنگ کے چاروں طرف خندق کھودوی جاتی تھی اور خندق کے گرد لکڑی کا حصار بنالیا جاتا تھا، علاء الدین مغلوں سے سیری کے پاس جنگ کرنے آیا، تو مولانا برنی رقم طراز ہیں:

---

۱ آداب الحرب، بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء

۲ برنی ص ۴۲۱

۳ ابن بطوطہ ص ۱۸۰

سلطان علاؤالدین با ندک سوارے کہ در شہر داشت از شہر بیرون آمد و در سیری لشکر گاہ کرد واز غلبۂ مغل و ہجوم مغل سلطان را ضرورت شد کہ گرد بر گرد لشکر خود خندق کا دانیدو بر گرد خندق از تخت ہاے درہاے خانہاے مردمان حصار چوبی بید انیددر او در آمد مغلان رادر لشکر گاہ خود مسدود کرد"[1]

شیر شاہ ہر جنگ میں اپنی لشکر گاہ کے اردگرد خندق کھدواتا اور مٹی کا حصار بنواتا تھا، اس کا حریف ملو خان (والی منڈو، اجین، سارنگ پور وغیرہ) سپر ڈال کر اس سے ملنے آیا، تو عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ:

"شیر شاہ نے ملو خان کو اپنے تمام لشکر کی ترتیب دکھائی، جس کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا، کبھی اس نے ایسی فوج نہیں دیکھی تھی، جس وقت بادشاہ کا چتر سواروں کو دکھائی دیا، تو وہ اپنی تلواریں میان سے نکال کر چتر کی طرف دوڑے آئے اور گھوڑوں سے اترے، سواروں کے کل دستوں نے اس طرح سلام کیا کہ وہ لڑائی کے دن کیا کرتے تھے، جب اس کو معلوم ہوا کہ ہر منزل میں سپاہی ایسی محنت و مشقت کرتے ہیں کہ لشکر کے گرد خندق کھودتے ہیں، اور قلعہ بناتے ہیں تو اس کے ہوش اڑ گئے، اس نے افغانوں سے کہا اللہ اکبر! کیسی محنت کرتے ہو، لحہ بھر آرام لینا حرام جانتے ہو، افغانوں نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا بھی اسی طرح محنت کرنے کا دستور ہے، اس لیے ہم کو بھی محنت و مشقت کی ایسی عادت ہوگئی کہ اس سے کلفت مطلق نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سپاہی کو چاہیے، کہ اس کا بادشاہ جیسی بھی محنت و مشقت و خدمت لینی چاہیے اس کو کرنے سے وہ تنگ نہ آئے آرام

[1] برنی، ص ۳۰۱

کرنا عورتوں کا کام ہے، نیک مردوں کے واسطے آرام کرنا شرم کا مقام ہے"۔ [۱]

آگے چل کر عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہی لشکر کے گرد خندق کھودنے میں بڑے بڑے امراء بیل داروں کی طرح پھاوڑے چلاتے تھے، ملّو خان کو خوف ہوا کہ کہیں اس کو بھی بیل داری نہ کرنی پڑے، اس لیے شیر شاہ کو چھوڑ کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ فرار ہو گیا۔ [۲] ۹۵۰ھ میں شیر شاہی لشکر ناگور، اجمیر اور جودھپور کی طرف روانہ ہوا، تو ریگستانی علاقوں میں ریت کی وجہ سے قلعہ اور خندق تیار نہ ہو سکی، شیر شاہ کے پوتے محمد خان بن عادل خان نے پھر یہ ترکیب کی کہ تھیلوں میں ریت بھر کر قلعہ بنایا۔ [۳]

مندرجۂ بالا باتوں کا خیال تیموریوں کے زمانہ میں بھی کیا جاتا تھا، تیمور "تزک جنگ وجدل" کے سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

"وامر نمودم کہ امیر الامراء در زمین جنگ گاہ چہار چیز ملاحظہ نماید، اوّل آب آن سرزمین، دوم زمینے کہ سپاہ رانگاہ دارد، سیوم کہ بر غنیم مشرف باشد و آفتاب روبرو نباشد، تا شعاع آفتاب چشم سپاہ را خیرہ نگرداند چہارم پیش روے جنگ گاہ کشادہ ووا باشد"۔ [۴]

میدان جنگ میں مذکورۂ بالا سہولتیں میسر ہو جاتیں، تو تیموری لشکر کے سپاہی ایک بے پناہ قوت بن کر دشمنوں سے لڑتے اور فتح وکامرانی حاصل کرتے، چناں چہ اُن کی میدانِ جنگ کی نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی کا خوف اور رعب اُن کے مخالفوں پر ہر زمانہ میں رہا، ہندوستان کی سب سے بڑی بہادر قوم یعنی راجپوت بابر سے میدان کنواہا میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد اپنا تحفظ اسی میں سمجھتے تھے کہ تیموریوں کے خلاف حصار اور قلعے میں محصور ہو کر اپنی مدافعت کریں۔

---

[۱] تاریخ شاہی مصنفہ عباس خاں سروانی بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۹۲-۳۹۳ نیز دیکھو تاریخ ہند جلد سوم مصنفہ شمس العلماء محمد ذکاء اللہ ص ۲۱۰

[۲] ایضاً [۳] الیٹ جلد چہارم ص ۴۰۵، ذکاء اللہ ص ۳۱۹ [۴] تزک تیموری ص ۱۹۱

اگر مذکورہ بالا سہولتیں میسر نہ ہوتیں، تو شاہی لشکر کو بڑی دقتیں اور مشکلیں پیش آتیں، چونسا کی جنگ میں ہمایوں کو شیر خان کے مقابلہ میں جو شکست ہوئی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایوں کی فوج کو خاطر خواہ میدانِ جنگ نہیں ملا، دونوں مخالف فوجیں گنگا کے ساحل پر مقیم ہوئیں، دونوں کے درمیان گنگا کی ایک شاخ پچیس گز چوڑی بہتی تھی، شیر خان نے سبقت کر کے ایک ایسے مقام پر اپنی فوج کو لا کر کھڑا کیا، جو اس کے لیے ہر طرح مفید ثابت ہوا اور ہمایوں کی فوج کو مجبوراً ایسی جگہ قیام کرنا پڑا، جہاں کی زمین بہت ہی ڈھلوان تھی، اس کی گہرائی میں کیچڑ اور دلدل ایسی تھی کہ سوار اور گھوڑے اس میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔[1]

اکبری عہد میں گڈھ کی رانی درگاوتی کے خلاف خواجہ آصف خان نے لشکر کشی کی تو رانی درگاوتی نے کھلے ہوئے میدان میں آنے کے بجائے نرہی کے پاس اپنی فوج کا پڑاؤ اس طرح ڈالا کہ اس کے چاروں طرف سر بفلک پہاڑ تھے، ارد گرد درختوں کے گھنے جنگل تھے، سامنے دریائے گور تھا اور اس کے دوسری طرف نربدا تھا، اس دریا کے پاس ایک پہاڑی پشتہ (گریوہ) تھا، جس سے ہو کر نرہی کا راستہ جاتا تھا، لیکن یہ راستہ بہت ہی تنگ اور ہولناک تھا، چنانچہ رانی درگاوتی کے لشکر کے ناکے بہت ہی دشوار گزار تھے، تیموری فوج کو رانی کے لشکر تک پہونچنے کے لیے بظاہر کوئی ذریعہ میسر نہ تھا، مگر شاہی فوج کے دلیر اور بہادر سپاہی جانبازی سے کام لے کر پہاڑی پشتہ پر پہونچ گئے اور یہاں اپنی توپوں کا ایک مورچہ بنا کر اتنی زبردست آتش بازی کی کہ رانی درگاوتی کے لشکریوں کو کٹ مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔[2]

ابراہیم حسین مرزا کے خلاف اکبر گجرات میں معرکہ آرا ہوا، تو اس کی سب سے بڑی وقت میدانِ جنگ کی سرزمین تھی، جو بہت ہی خراب اور کانٹوں سے بھری تھی، دو سوار پہلو بہ پہلو ساتھ گذر نہیں سکتے تھے، ان خاردار جھاڑیوں سے فائدہ اٹھا کر غنیم کے دو سواروں نے اکبر پر حملے کیے، اکبر کے فوجی سردار پاس ہی کھڑے تھے، مگر جھاڑیاں بیچ میں حائل تھیں، اس کی مدد کو نہ

[1] تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی بحوالہ ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۷۰ و ذکاء اللہ جلد دوم ۲۹۳

[2] اکبر نامہ جلد دوم ص ۲۱۳-۲۱۲

پہنچ سکے، اکبر نے غیر معمولی سرعت سے جھاڑیوں کے اوپر سے اپنے گھوڑے کو جست کرایا اور دشمنوں کا مقابلہ کیا۔

خان اعظم مرزا کوکہ نے سلطان مظفر گجراتی کے خلاف لشکر کشی کی، تو دونوں فوجیں سابرمتی کے پاس مدمقابل ہوئیں، لیکن شاہی لشکر کو زمین کے نشیب کے باعث پیچھے ہٹنا پڑا۔[۱]

اوڑیسہ میں افغانوں نے اکبر شاہی فوج کا مقابلہ کیا، تو ملنا پور میں انھوں نے اپنی فوج کو اس طرح کھڑا کیا کہ بیچ میں جنگل تھا اور اس کے چاروں طرف ایک دریا بہتا تھا۔ شاہی فوج کی باگ راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، اس نے پیش قدمی کر کے غنیم کی فوج کے نزدیک ایک سرکوب پر قبضہ کرلیا اور وہاں فوراً ایک قلعہ تعمیر کرلیا، جہاں سے توپوں کی آتش بازی کر کے دشمنوں کو پسپا کیا۔[۲]

شاہجہانی عہد میں اوزبکوں نے شاہی فوج کا تسلط اور اقتدار اپنے ملکوں میں اس لیے قائم نہیں ہونے دیا کہ وہ درّوں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کی غارت گری کرتے تھے، عالمگیری عہد میں آسام کے علاقوں میں مگھ اور اہوم کی مخالفت محض اس لیے جاری رہی کہ وہ جنگلوں اور بحری درّوں میں لڑنے کے عادی تھے، مرہٹے پہاڑیوں میں چھپ چھپ کر تیموری فوج کا مقابلہ کرتے رہے، اس لیے تیموری ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکے۔

میدانِ جنگ میں فوجیں صف آرا ہوتیں، تو تیموری بھی لشکر گاہ کی مدافعت کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کرتے تھے، امیر تیمور جب محمود تغلق کے خلاف جمنا کے کنارے جنگ کرنے آیا، تو اس کے لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق کھودی گئی، وہ خود لکھتا ہے۔

"وازیں جہت درد ور لشکر خندق کندم و میانِ خندق خود را استوار ساختم"[۳]

ہاتھیوں کو پسپا کرنے کے لیے تیمور نے صف لشکر کے آگے چپروں سے حصار بنایا اور اس کے گرد خندق کھودی، خندق کے سامنے بھینسوں کی گردنوں اور ٹانگوں کو چمڑے سے باندھ کر

۱۔ اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۹۴ ۲۔ ایضاً ۱۲-۹۱۱ ۳۔ طبقاتِ اکبری جلد دوم ص ۳۵

اُن کو کھڑا کیا اور آہنی کانٹے بنا کر پیادوں کو دیے کہ ہاتھی حملہ آور ہوں، تو یہ کانٹے راستہ میں بکھیر دیے جائیں۔[۱]

بابر نے پانی پت کے میدان میں اپنے لشکر گاہ کا تحفظ اس طرح کیا کہ دائیں طرف پانی پت شہر کے محلے اور مکانات کی آڑلی، سامنے توپوں کے ارابے اور مٹی کے تو برے رکھے، بائیں طرف خندق کھود کر درختوں کی شاخوں کی باڑھ لگائی،[۲] کنواہا کی جنگ کے موقع پر بھی بابر نے اپنے لشکر گاہ کو ارابوں اور خندقوں سے مستحکم کیا تھا،[۳] ہمایوں کے خلاف سلطان بہادر مانڈسور میں صف آرا ہوا، تو اُس نے لشکر کے گرد خندق ہی کھود کر ہمایوں کا مقابلہ کیا، طبقات اکبری میں ہے۔

> ''رومی خان نے جس کے اختیار میں سلطان بہادر کا توپ خانہ تھا، کہا کہ صفوں کی جنگ میں توپ و تفنگ کام نہیں آتا ہے، توپ خانہ تو کافی فراہم کرلیا گیا ہے، چناں چہ قیصر روم کے سوا اس قسم کا توپ خانہ کسی اور کے پاس نہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ لشکر کے گرد خندق کھودی جائے اور ہر روز جنگ ہو اور جب مغلوں کے لشکر مقابلہ میں آئیں گے، تو توپ تفنگ کی ضرب سے ان میں سے اکثر ہلاک ہو جائیں گے، سلطان بہادر نے یہ رائے پسند کی اور اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، دو ماہ کی مدت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل میں پڑے رہے''۔[۴]

ابوالفضل کا بیان ہے کہ خندق کے چاروں طرف ارابہ کا حصار بھی بنایا گیا اور حصار پر توپیں نصب کردی گئیں، مگر توپوں کی یہ قلعہ بندی کام نہیں آئی، ہمایوں نے حصار کے باہر توپوں کی زد سے دور تیر اندازوں کی ایک بڑی جماعت دشمنوں کی رسد کو تاراج کرنے کے لیے مقرر کردی، چناں چہ ہر طرف سے سلطان بہادر کی فوج کی رسد بند ہوگئی، جس سے لشکر میں بڑی سراسیمگی پھیل گئی اور یہ توپ خانہ کا قلعہ قید خانہ بن گیا، بالآخر سلطان بہادر بلی سے جھڑپ کرنے کے بعد توپ

---

[۱] تزک تیموری ص ۴۷ [۲] ظفرنامہ جلد دوم ۱۰۲۴
[۳] بابرنامہ ص ۲۶۶ [۴] ایضاً

خانہ میں آگ لگا کر فرار ہو گیا۔[۱]

۹۹۲ھ میں اکبر نے سلطان مظفر گجراتی سے احمد آباد کے پاس سرکیچ میں جنگ کی، تو شاہی فوج کے ایک طرف شہر اور دوسری طرف دریا تھا، میدان جنگ کو خاردار شاخوں سے استوار کیا اور پھر ان خاردار شاخوں کو مٹی کی دیوار بنا کر مستحکم کیا۔[۲]

اکبر کے اکتالیسویں سال جلوس میں صادق خان نے نظام الملک کے خلاف دکن میں فوج کشی کی، تو جنگ وجدل کا مقام سُکھر واقع دریائے بان گنگا (شاخ گوداوری) تھا، شاہی فوج نے لشکر گاہ کو اس طرح ترتیب دیا کہ سامنے دریا اور پشت پر ایک رود بار تھا۔[۳]

جہانگیر کے اٹھارویں سال جلوس میں شاہی فوج گجرات میں عبداللہ خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی، تو تزک جہانگیری میں ہے۔ (ص ۳۷۳)

"از اتفاقات حسنہ جائے کہ لعنت اللہ (یعنی عبداللہ) فرود آمدہ بود، زمین پست و بلند بود، ز قوم زار انبوہ کوچہائے تنگ داشت بنا بریں سلسلۂ افواج او انتظام شایستہ نیافت"

شاہجہانی عہد میں دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کی پہلی لڑائی میں دارا کی طرف سے مہاراجہ جسونت سنگھ نے نربدا کے ساحل پر دھرمات میں میدان جنگ منتخب کیا، لیکن اس کی زمین بہت ہی تنگ، پست، ناہموار اور نشیب و فراز سے پُر تھی، مہاراجہ جسونت سنگھ نے حسب معمول لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق بھی کھدوائی اور میدان کی زمین کو پانی ڈال کر کیچڑ سے آلودہ کر دیا جو سواروں کے گھوڑوں کے لیے مضر ثابت ہوا۔[۴]

خندق کھود کر لشکر گاہ کو محفوظ کرنے کی تدبیر آخر وقت تک قائم رہی، بہادر شاہ کی وفات

۱۔ اکبر نامہ جلد اول ص ۱۳۲ ۔ ۲۔ ایضاً جلد سوم ص ۴۲۵

۳۔ ایضاً ص ۷۱۵ ۔ ۴۔ واقعات عالمگیری عاقل خان، ص ۲۸ - لاہور اڈیشن

کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ شروع ہوئی، تو شہزادہ عظیم الشان نے لاہور کے پاس راوی کے ساحل پر اپنے لشکر کی قیام گاہ کو جس طرح ترتیب دیا، وہ خافی خان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"پشت بدریاے راوی داده فرود آمده دو طرف لشکر حکم کندن خندق فرمود وطرف دیگر لشکر عظیم الشان دریاداشت"۔[۱]

فرخ سیر اور جہاندار شاہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوئے، تو جہاندار شاہ نے پہلے اپنے لڑکے عزالدین کو پچاس ہزار سوار دے کر فرخ سیر کے مقابلہ کے لیے بھیجا، عزالدین کھجوہ میں اپنے لشکر کے ساتھ قیام پذیر ہوا، لشکر کے گرد اس نے خندق کھدوائی جو پندرہ فٹ چوڑی اور دس فیٹ گہری تھی۔ خندق کی مٹی لشکر کے طرف ڈال دی گئی، جس کی اونچائی قد آدم کے برابر تھی، اسی اونچائی پر مورچال بنایا گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھو خافی خان جلد دوم ص ۶۹۹)

خندق کھود کر توپوں کے لیے جو مورچے تیار کیے جاتے وہ ملچار یا مورچل یا مورچال کہلاتے تھے، گویہ اصطلاحات قلعہ اور حصار کی جنگ کے سلسلہ میں زیادہ استعمال کی گئی ہیں، جیسا کہ آئندہ ذکر آئے گا، مگر میدان جنگ میں بھی زمین کھود کر توپوں کی مورچہ بندی کے لیے ملچار اور مورچل بنائے جاتے مثلاً شاہجہانی عہد میں شہزادہ اورنگ زیب بلخ کی مہم میں اوزبکوں سے لڑ رہا تھا، تو تیمور آباد کے پاس اس نے اپنے لشکرگاہ کے گرد ملچار ہا تعمیر کیے، بادشاہ نامہ میں ہے۔

"وباشارهٔ آن والا گوہر برداران ظفر آئین کوه تمکین بردورار و ملجار ہا مقرر نموده و درہر جانب با سپاہیان نبرد گزین مراسم حفظ و حراست بتقدیم رسانیده شب گذرانیدند"۔[۲]

داراشکوہ اپنی جنگ جانشینی کی دوسری لڑائی کے سلسلہ میں اورنگ زیب سے لڑنے کے

---

[۱] منتخب اللباب جلد سوم ص ۶۸۶ [۲] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۶۹۲

لیے دھول پور پہنچا، تو عاقل خان کا بیان ہے:-

"وبر ساحلِ آبِ چنبل خیمه و خرگاه تا گنبد نیلگون برافراشت و بر مسالك و معابر مورچال مقرر کرده جابجا افواج توپخانه تعبیه نموداز جوانب و اطراف راه عبور بر موکب منصور مسدود ساخت"[1]

دارا شکوہ جب دھول پور سے بڑھ کر سموگڑھ میں معرکہ آرا ہوا، تو میدانِ جنگ میں اس کی فوج کو پانی کی کمی کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا- اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لیے قتال و جدال کا میدان گرم ہوا، تو جاجو کی جنگ میں شہزادہ اعظم شاہ کے لشکریوں کو بھی پانی کی قلت کے سبب بڑی صعوبت اور مصیبت اٹھانی پڑی، جاجو کا میدان اعظم شاہ کی فوج کے لیے اس کی گرد آلود زمین کے باعث بھی نہایت مضر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا [2]۔ جنگ جب انتہائی شدت کو پہنچ گئی، تو یکا یک اعظم شاہ کی مخالف سمت سے بہت تیز اور تند ہوا چلی، گرد و غبار کی کثرت سے لڑائی کا میدان لشکریوں کی آنکھوں میں ایسا سیاہ اور تاریک ہو گیا کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں رہی، لیکن یہی ہوا- اعظم شاہ کے حریف معظم شاہ کے لیے فتح و کامرانی کی وجہ بن گئی، موخر الذکر کے لشکر سے جو تیر پھینکا جاتا، وہ ہوا کی مدد سے اول الذکر کے فوجیوں کے زرہ بکتر میں تیزی سے پیوست ہو جاتا تھا اور جو سنگ ریزے بادِ صرصر سے اڑ کر اس کے لشکر میں پہونچتے، وہ گولیوں کی طرح لشکریوں کے چہروں پر لگتے تھے، برخلاف اس کے اعظم شاہ کی طرف سے جو بان تیر اور گولہ پھینکا جاتا، وہ مخالف ہوا کی وجہ سے یا تو چند قدم پر جا کر گر جاتا یا پلٹ کر خود اسی کی صف میں چلا آتا تھا- (خافی خان جلد دوم ص ۵۹۳)

---

[1] واقعات عالمگیری ص ۳۲

[2] منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۹۲ عہد اکبری میں شاہی فوج جانی بیگ کے خلاف سیوان (ٹھٹھہ) کے قریب جنگ کر رہی تھی، تو شاہی فوج کو گرد آلود زمین کی وجہ سے میدانِ جنگ میں بہت دقتیں اٹھانی پڑیں، جنگ کے درمیان تیز ہوا چلنے لگی، تو از شورش باد و خاک از یک دیگر گم می نمود (اکبرنامہ جلد سوم ص ۶۰۹)

بہادر شاہ کی وفات کے بعد شہزادہ عظیم الشان لاہور کے پاس راوی کے کنارے جہاندار شاہ سے جنگ کر رہا تھا کہ یکایک ایک آندھی آئی اور راوی کی ریت ہوا میں بادل کی طرح چھا گئی، لشکریوں کو غبار کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، وہ مشکل سے اپنی آنکھیں کھول سکتے تھے، وہ صرف توپوں کی صدائیں سن رہے تھے اور بے حس و حرکت کھڑے تھے، اس تاریکی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر لشکریوں نے عظیم الشان کے خزانہ کو لوٹنا شروع کر دیا۔[1]

مجلسِ مشاورت:

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اعلیٰ فوجی عہدیداروں کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، سلاطینِ دہلی کے زمانہ میں اس قسم کی مجلس کے لیے امیر خسرو نے کبھی صرف "مجلس"[2] اور کبھی "مجلس ملکی"[3] اور عصامی نے انجمن[4] کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ امیر خسرو نے اس مجلس میں شریک ہونے والوں کو "رای زنانِ لشکر"[5] کہا ہے، یہ مجلس سرلشکر کی صدارت میں منعقد ہوئی اور فوج کے اکثر "ملوکِ کبار" "مردانِ رزم و کار" اور "ویغان سال خوردہ" اس میں شریک ہوتے، کیوں کہ مہم کی کامیابی کی ذمہ داری اُن پر بھی ہوتی تھی[6]، عارض اور اُن کی عدم موجودگی میں نائب عارض اس مجلس میں ضرور شریک ہوتا، اہم فیصلے غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد کیے جاتے، کیوں کہ اگر لشکریوں کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا کہ سرلشکر کے کسی حکم سے ان کی جانیں محض تلف ہو جائیں گی، تو وہ اس کے حکم کو بجا لانے سے انکار کر دیتے، اس لیے آداب الحرب و الشجاعۃ کے مولف فخر مدبر نے لشکر کے نگہبانوں کے لیے یہ ہدایت لکھی ہے کہ فوج کی کثرت اس وقت تک مفید اور موثر نہیں ہو سکتی ہے، جب تک کہ باقاعدہ مشوروں سے مہم

---

1. سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۸۳۔ 2. تغلق نامہ ص ۱۳۸ 3. خزائن الفتوح ص ۱۴۴
4. فتوح السلاطین ص ۲۵۴ 5. خزائن الفتوح ص ۱۴۴
6. ایضاً ص ۱۳۹، تغلق نامہ، ص ۸۴، مجلس مشاورت کی مثالوں کے لیے دیکھو تاریخ شاہی از عباس خان سروانی ہالیٹ جلد چہارم ص ۳۳۰، ۳۷۲، ۳۸۱ وغیرہ

میں کافی احتیاط اختیار نہ کی جائے۔

تیموریوں کے زمانہ میں بھی لڑائی کے موقع پر جنگی مشاورت کی خاص اہمیت تھی، امیر تیمور نے تزک تیموری میں اُن کے متعلق جو اپنے خیالات جا بجا ظاہر کئے ہیں، وہ ملاحظہ ہوں:

''مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ مخالفوں پر غالب آنا نہ لشکر کی کثرت سے اور نہ ان سے مغلوب ہونا، فوج کی کمی سے ہوتا ہے، بلکہ غلبہ صرف تائید اور تدبیر سے حاصل ہوتا ہے۔

مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ رائے تدبیر اور مشورہ عقلمند اور ہوشیار آدمی سے کرنا چاہئے، اگرچہ کامیابی کا راز پردۂ تقدیر میں چھپا ہے'' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق میں نے جو کام کیا، مشورہ سے کیا، جب ارباب رائے واصحاب مشورہ اکٹھا ہوئے، تو بُرے بھلے، نفع ونقصان پیش آنے والے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق میں نے ان سے گفتگو کی اور جب ان کی باتیں سنیں، تو دونوں پہلوں پر غور کیا اور نفع نقصان کو سوچا اور اس کام کے خطرات کو غور سے دیکھا، جس کام میں مجھ کو دو خطرے نظر آئے، اس کو نظر انداز کر دیا اور جس کام میں صرف ایک خطرہ تھا، اس کو اختیار کر لیا............

میں نے تمام کاموں میں مشورہ سے کام لیا اور اس کام کے انجام دینے میں صحیح تدبیر کی اور اس کام کے پورے ہونے کی راہ پر غور کرنے کے بعد اس کام کو شروع کیا اور تدبیر، عزم صحیح، احتیاط، انجام بینی اور دور اندیشی سے اس کام کو پورا کیا، مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ صاحب مشورہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں، جو باتفاق اپنے قول وفعل پر مصمم عزم کر لیں اور اس کام کو کسی وجہ سے نہ چھوڑیں اور اگر یہ کہیں کہ ہم اس کام کو نہ کریں گے، تو اس

ل آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۳۷ء

کے پاس نہ پھٹکیں۔

مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ مشورہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک زبان سے دوسرا دل سے، میں نے جو زبانی مشورہ سنا، اس کو صرف کان سے سن لیا اور جو مشورہ جیب دل سے سنا، اُس کو کان اور دل دونوں میں جگہ دی۔

فوج کشی کے وقت میں نے صلح و جنگ دونوں کے متعلق گفتگو کی اور اپنے امراء کے دل کی بات کا سراغ لگایا کہ وہ جنگ چاہتے ہیں یا صلح اور اگر انھوں نے صلح کا مشورہ دیا، تو صلح کے فوائد کا مقابلہ جنگ کے نقصان سے کیا اور انھوں نے اگر جنگ کی بات چیت کی، تو اس کے فائدے پر صلح کے نقصان کے متعلق غور کیا، جس میں فائدہ زیادہ نظر آیا، اسی کو اختیار کر لیا اور وہ مشورہ جو فوج میں نااتفاقی پیدا کرتا تھا، اس کے سننے سے میں نے احتراز کیا اور جس صاحبِ مشورہ نے بے اختیارانہ مشورہ دیا، اس کو سن لیا اور جس شخص نے عاقلانہ اور مردانہ بات کی، اس کو بھی سنا''۔

میں نے مشورہ ہر شخص سے طلب کیا، لیکن ہر بات کی بھلائی اور برائی پر غور کیا اور اس کے صلح و صواب کے پہلو کو اختیار کیا۔[۱]

تیمور کے جانشین مذکورۂ بالا زرین مشوروں سے برابر مستفید ہوتے رہے، ان کے عہد میں لڑائی کے موقع پر ''مجالس کنکاش'' اور انجمنوں کی مثالیں بکثرت ہیں[۲]۔ میدانِ جنگ میں بادشاہ کی موجودگی میں ایسی انجمن اور مجلس کنکاش کا انعقاد اسی کی صدارت میں ہوتا، وہ نہ ہوتا تو صدارت کے فرائض سپہ سالار انجام دیتا اور اس میں امرائے ''ذوی الاقتدار[۳]''، ''اہلِ اعتبار[۴]''، ''خبرت گزینانِ رکابِ دولت[۵]''، ''کاراگاہان[۶]''، ''سران[۷]'' لشکر یعنی قشون اور تومان کے سردار وغیرہ شریک ہوتے، اس

۱ تزک تیموری ص ۹ تا ۵۵

۲ تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۶۳، ۲۹۲، ۲۹۰ ، اکبر نامہ جلد سوم ص ۲۸-۲۸۲-۲۸۳

۳ طبقاتِ اکبری جلد سوم ص ۲۵ ۴ تا ۷ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۳۸

انجمن مشاورت میں خوب مباحثے ہوتے اور ہر ایک فرد آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا، ضرورت کے وقت یہ انجمن عین لڑائی کے دوران میں بھی منعقد کی جاتی، اس وقت اجتماع شاہی تور کے نیچے ہوتا ہے، مباحثے میں زیادہ تر نبرد آزمائی حملہ آوری اور صف شکنی کے قواعد وضوابط اور "دغا دیجا" کے رسوم و آداب پر گفتگو ہوئی۔[1]

مجلس مشورت میں پرجوش تقریریں:

اس مجلس اور انجمن میں بعض اوقات ولولہ انگیز تقریروں سے لشکر کے سرداروں اور عہدیداروں میں غیر معمولی جوش وخروش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

علاؤالدین خلجی کی فوج کیلی میں مغلوں کے مدمقابل ہوئی، تو ظفر خان نے فوجی سرداروں کی ایک انجمن منعقد کی اور ان کو مخاطب کر کے کہا، اے سرانِ سپاہ! میدانِ جنگ میں کون سی تدبیر اختیار کرنی چاہیے، اگر ہم ان کفار سے جان بچا کر فرار ہو جائیں، تو ہم اپنے سلطان کو کیا منہ دکھائیں گے اور اگر ہم لڑنے کو آمادہ ہو جائیں، تو دس ہزار فوج کے مقابلہ میں ہمارے پاس ایک ہزار فوج ہے، ہم عجب کشمکش میں ہیں، دو بھیڑیوں کے درمیان ایک بھیڑ آ گئی ہے، نہ پیچھے ہٹنے اور نہ لڑائی لڑنے میں چین ہے، لیکن میں وہی کروں گا، جو اس مجلس میں آزمودہ کار اصحاب مجھ کو کرنے کو کہیں گے، فتوح السلاطین میں اس تقریر کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے۔

بدیشان بگفت ای سرانِ سپاہ — چہ تدبیر باید دریں حرب گاہ؟
ازیں فوج کافر اگر بگذریم — چہ روپیش صفدار عالم بریم!
ور آید وزلک یجم در کارزار — کجا یلک ہزار و کجا دہ ہزار!
عجب کار ما را بہ پیش آمد است — دو گرگ ازیں و پیش میش آمد است!
"نہ در عطف خیرے نہ در کارزار! — کنیم آنچہ گویند مردانِ کار"[2]

---

[1] ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۳۲-۴۲۹ ذکاءاللہ جلد سوم ص ۲۷-۲۶۹

[2] فتوح السلاطین، ڈاکٹر آغا مہدی حسین ص ۲۵۴-۲۵۵، ص ۱۹۳۸ء آگرہ

اس تقریر کو سُن کر اصحاب انجمن نے کہا اے خان! مغلوں کو پسپا کرنے میں تمھاری شہرت بہت ہی دور تک پھیل چکی ہے، اس لیے اگر تم لڑائی کیے بغیر سلطان کے پاس گئے، تو تمھاری شان میں کمی نہ ہوگی اور سلطان تم سے ناخوش نہ ہوگا۔

گروہے ز اصحاب آں انجمن بگفتند، اے خانِ فرخندہ فن
شکستی سراسر مغل را سپاہ زماہی رسید ایں خبر تا بہ ماہ
کنوں عطف شایاں تراز کارزار کہ شہ را براہت دو چشم است چار[1]

ظفر خان شجاعت، بہادری اور معرکہ آرائی کے لیے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہو چکا تھا، اُس نے بزدلی اور کم ہمتی سے میدانِ جنگ چھوڑ کر واپس جانے میں ذلت اور خواری محسوس کی، اس کو اپنے فوجی سرداروں کا جواب پسند نہیں آیا۔

چو زاں قوم بشنید خاں ایں سخن
خروشید وجوشید چوں اہرمن[2]

ظفر خان نے ان کو مخاطب کر کے پھر کہا "جب ایک دن مرنا ہے، تو دشمنوں پر حملہ کر کے مرنا بہتر ہے، میں تو اس ہندوستان میں ناموروں کی موت مروں گا اور آج ہی کی لڑائی میں جان دوں گا، تا کہ میرا نام تاریخوں میں زندہ رہے، جو شخص اس نازک موقع پر میدانِ جنگ میں وفادار رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ تو فوجیوں کے ساتھ آگے بڑھے، تا کہ مہر و وفا کی کتاب میں اس کا نام باقی رہے اور جو مراجعت چاہتے ہیں، وہ واپس ہو جائیں، اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں ہیں، وہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچ جائیں، فتوح السلاطین کے مصنف کی زبانی بھی اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں۔

بگفتا کہ اے قوم آشفتہ رائے ندانید فرقے ز سرتا بپائے
ہمہ حال چوں جاں بباید سپرد بباید نمودن یکے دست برد

---

[1] فتوح السلاطین، ڈاکٹر آغا مہدی حسین، ص ۲۵۴۔ ۲۵۵ ، ص ۱۹۳۸ء، آگرہ

[2] فتوح السلاطین، ڈاکٹر آغا مہدی حسین ص ۲۵۵، ۱۹۳۸ء آگرہ

من امروز اید چو نام آوران   کنم ختم در ملکِ ہندوستان
وہم جنگے آیدر کہ درروز گار   بماند بہ شہنامہا یادگار
کرازے کہ باما دریں وقت تنگ   وفائے نماید بہ ہنگامِ جنگ
ہمو ہست ہمراو اہلِ غزا   بود نقش نامش بہ مہر و وفا
گروہے کہ دارند بر عطف راے   نہ بستہ است شاں را کسے دست و پاے
سپہ تا نکر دست بر جنگ ساز   سلامت ہمیں دم بگردند باز[۱]

ظفر خان کی تقریر سن کر تمام فوجی سردار بے حد متاثر ہوئے، یک زبان ہو کر بولے کہ ہم جان دینے اور آگ میں کود پڑنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

کہ تا جان بود جان سپاری کنیم   بہ پیشت سر خود بہ خاک افگنیم
بفرمان خان جملہ راضی شویم   اگر خان فرستد در آتش درویم[۲]

غازی ملک (یعنی غیاث الدین تغلق) جب خسرو خان کے خلاف جنگ کرنے کے لیے دہلی کی طرف بڑھا، تو خسرو خان نے پیش قدمی کر کے سرستی کے پاس اس کو روکنا چاہا، خسرو خان کے پاس کثیر فوج تھی، لیکن غازی ملک نے اپنی پریشانی اور سراسیمگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اپنے لشکر کے سرداروں کو بلا کر ایک پر جوش تقریر کی، جس کو امیر خسرو نے تغلق نامہ میں اس طرح منظوم کیا ہے۔

ملک در پیش یک یک را طلب کرد   پس از دل قصۂ را مہمانِ لب کرد
کہ سارا چرخ پیشیں آورد کارے   کہ گردش ہست دروے چرخ وارے
کرا نیروے پیل است و دل شیر   کہ ہم بازو شود باما بہ شمشیر
نخست از خونِ خود خیزد چو لالہ   پس از خونِ عدو شوید پیالہ
تو خنجر نہد اول سرِ خویش   کشند پس برد گر سر خنجر خویش
بلے مرداں بہر سازے و سوزے   کساں را پرورند از بہر روزے
بود ہر روز عشرت را شمارے   فتد ار بعد عمرے کار زارے

۱۔ فتوح السلاطین ص ۲۵۵   ۲۔ ایضاً ص ۲۵۵

بکارے نایدار یارے دراں روز | بسوزش دل کہ نبودیار دل سوز
بود تیر ازبرائے رزم نخچیر | تو بے آں چوبہ داں چوبہ تیر
کماں گر بشکند ہنگامِ بیکار | زہے کے یابد ازلب ہائے سوفار
اگر شاہیں زبوں گردد زشارک | کلہ گل مرغ را زیبد بتارک
بیائید آں کہ دارد کار باما | شویداز عہد وپیمان یار باما
شود گر عہد پاسحکم بہ سوگند | بکار جاں شویم از جاں کمر بند
وگر یارے ندارد میلِ یاری | کہ دشوار است کار جاں سپاری
دریں یاری کہ دارد کار بامن | دلِ من پست آخر یار با من
بدیں دل کاھتیں سلیست برپائے | کنم گر رسد آہن باشداز جائے
مرا یاور بس است وہم ترازو | دو یازوے من و تعویذ بازو
شنیدم بودرستم چیرہ دستے | کہ گاہ حملہ تنہا صف شکستے
نہ آں رستم زمن درکار بیش است | کہ ہر کس رستمے در عہد خویش است
چو من بر نامِ یزداں تکیہ کردم | یقیں است آں کہ تنہا جیرہ گردم
مراد من چوجز دیں را فرج نیست | من واین کار برغیرے حرج نیست

اس تقریر سے جو اثر پیدا ہوا، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

چو بشنیدند مردانِ سرافراز | زمخدوم خود ایں حرف سر انداز
سراسر چوں ہمہ سرباز بودند | بروئے خاک سرہا باز بردند
بس آنگاہ از سر سرباری خویش | سر خود خدمتے بدندد در پیش
فرو گفتند کاے سرور سراں را | بزیر پائے تو سر سروراں را
ہمیشہ باد سر بار کلاہت | کلہ گوشہ کشیدہ سر بما ہت
سرے کز دولت عمرے کلہ داشت | زکارت چوں تواں اکنوں نگہ داشت
بسر باری چو مارا مژدہ دادی | سر ما دو کلہ باید زشادی

نہ ما آں سرسری آریم پیشت | کہ ندہیم از قفد سر ہائے خویشت
چہ باشد یک سر ما زیر خنجر | ہزاراں پارہ گردد جملہ یک سر
زہر پارہ جدا بر خیزد آواز | کہ بازاز بہرِ تو کردیم سر باز
کمر بستیم و پیماں نیز بستیم | بر آں پیماں رگِ جاں نیز بستیم
کہ تاجاں دوتن است و سر بگردن | نخواہم از درت سر دور کردن
چو مارا سر جدا گشت اندریں کار | تو دانی خواہ صلح و خواہ پیکار[1]

بابر راناسانگا سے جنگ کرنے کو کنواہا کے میدان کی طرف بڑھا، تو اُس نے اپنے فوجی امرا اور سرداروں میں سراسیمگی، بددلی اور کم ہمتی کے آثار دیکھے، لیکن اس نازک موقع پر اس نے غیر معمولی ہوش مندی سے کام لیا، اپنے ہم راہیوں میں شجاعت و بہادری اور جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک مجلس کنکاش منعقد کی اور فوجی عہدیداروں کے سامنے حسب ذیل تقریر کی۔

''اے امرا اور سردارانِ فوج!''

ہر کہ آمد بجہاں اہلِ فنا خواھد بود | آنکہ پایندہ و باقی است خدا خواہد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے، وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا میں آیا ہے، وہ یہاں سے جائے گا بھی، بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہو کر مرنا بہتر ہے۔

بنام نکو گر بمیرم رواست | مرا نام باید کہ تن مرگ راست

جانتے ہو کہ یہاں سے ہم لوگوں کا وطن اور شہر کتنی دور ہے؟ کئی مہینوں کا راستہ ہے، خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ ہم کو شکست ہو جائے اور اگر ہم کو شکست ہو گئی (نعوذ باللہ) تو پھر ہم کہاں کے رہیں گے؟ کہاں ہمارا

[1] تغلق نامہ ص ۸۲-۸۴۔ اسی جنگ میں ایک اور موقع پر غیاث الدین تغلق نے ایک تقریر کی تھی جو تغلق نامہ ص ۴۰ پر درج ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء

وطن؟ کہاں ہمارا شہر؟ ہم اجنبیوں اور بیگانوں کے ساتھ پڑے ہوں گے، جانتے ہو اگر ہم کو شکست ہو گئی، تو مسلمان بادشاہ جو دنیا کے ہر گوشہ میں موجود ہیں، کیا کہیں گے اور ہم کو کس زبان سے یاد کریں گے، اہل دنیا کی گفتگو اور طعن و ملامت کو چھوڑ دو، قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں کیا عذر پیش کر سکوں گا کہ ایک سلطنت مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئی، میں اس سلطنت کا بادشاہ اپنے بہت سے ہم مذہبوں اور ہم قوم کو قتل کر کے بن بیٹھا تھا اور آج غیر مسلموں سے جنگ کئے بغیر، کم از کم بغیر عذر شرعی کے واپسی کا راستہ تلاش کروں؟ آخر ان کے ہاتھوں اس ملک کے باشندوں پر کیا کیا مصیبتیں نہ آئیں گی۔ افسوس! اب وہ وقت ہے کہ دل میں شہادت کی ٹھان کر جہاد کے لیے بڑھیں۔

چوں جان آخر از تن ضرورت رود ہماں بہ کہ باری بعزت رود
سر انجام گیتی ہمیں است و بس کہ نامی بہ نیکی بماند زبس

اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے، تو غازی کہلائے اور اگر مرے تو شہید ہوئے۔ دونوں حال میں ہم کو بڑا درجہ اور بلند مرتبہ ملتا ہے، آؤ ہم سب مل کر حلف اٹھائیں کہ ہم موت سے نہ بھاگیں گے اور جب تک دم میں دم ہے، اس لڑائی سے منہ نہ پھیریں گے۔[1]

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سرداروں، نوکروں، چھوٹوں اور بڑوں نے کلام پاک کو ہاتھوں میں لے کر قسمیں کھائیں کہ وہ میدان جنگ سے کسی حال میں بھی منہ نہ موڑیں گے، چناں چہ لڑائی ہوئی، تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوئی۔

---

1. یہ تقریر بابر نامہ اردو ترجمہ (ص ۳۱۰-۳۰۹) ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم ص (۲۶) اور طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۶ کے مختلف ٹکڑوں کو ملا کر تیار کی گئی ہے۔

شیر شاہ ہمایوں کے خلاف قنوج میں معرکہ آرا ہوا، تو جنگ سے پہلے اُس نے اپنے لشکریوں کو اس طرح مخاطب کیا:

''میں نے بہت سعی کر کے تم کو جمع کیا ہے اور تمھاری تربیت میں حتی المقدور کوتاہی نہیں کی، آج ہی کے دن کے لیے تمھاری نگاہ داشت کی ہے، آج ہی امتحان کا روز ہے، آج ہی کے دن جو میدانِ حرب میں غالب ہوگا! اپنا رتبہ بڑھائے گا، ایسی کوشش کرو کہ وقت کارزار میں سب افغان یک دل و یک زبان ہوں، افغانوں کی فوج میں اتفاق ہو تو شمشیر زنی میں کوئی ان کے برابر نہیں، میں اپنے عزیزوں سے یہ التماس کرتا ہوں کہ حسد، خصومت اور اختلاف کو جانے دو، سلطان ابراہیم کے عہد میں یہ حسد، مخاصمت اور اختلاف ہی کی وجہ سے افغان مغلوب ہوئے۔ جس کا مزہ انھوں نے خوب چکھا، لشکر کو فیروزمندی اور بلندی اس کی یک دلی سے حاصل ہوتی ہے، اے عزیزو! تم کو یہ معلوم رہے کہ میں نے عزم جزم کرلیا ہے کہ اس رزم گاہ سے اس وقت زندہ نکلوں گا کہ فتح و نصرت ہو، ورنہ میرا سر دشمنوں کے گھوڑوں کے سُم سے کچلتا نظر آئے گا، مرنا مسلّم ہے، بہتر ہے کہ ایسے کام میں مریں کہ نیک نام ہوں، اے عزیزو تم ڈرو نہیں، رزم گاہ میں اس طرح جاؤ کہ سر کے ساتھ پاسبانی کلاہ رکھو، سپاہ کے لیے اس سے زیادہ کوئی بدنامی اور شرمندگی نہیں ہے کہ اس کا آقا مارا جائے اور سپاہی اور خدمت گار زندہ رہیں، اس جنگ میں ثبات قدم کے لیے تحریص کرتا ہوں، کیوں کہ ملک ہند کا ہاتھ آنا اور مغلوں کے ہاتھ سے اہل و عیال کا رہائی پانا اسی پر موقوف ہے، میں بڈھا ہو گیا ہوں، ہزاروں دقتوں سے افغانوں کو جمع کیا ہے، اگر خدانخواستہ اس معرکہ میں یہ لشکر شکست کھا کر پراگندہ ہو گیا تو پھر اس کا دوبارہ جمع ہونا محال ہے، ہوا سے جو کلیاں درخت

سے جھڑ جاتی ہیں پھر وہ شاخسار پر جمع نہیں ہوتیں۔''

اس تقریر کو سن کر افغانوں نے پامردی اور جان نثاری دکھانے کا وعدہ کیا۔[۱]

سنہ ۱۸ جلوس شاہی میں اکبر نے دوسری بار احمد آباد میں محمد حسین مرزا کے خلاف اپنی فوج صف آرا کی، تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس نے اپنی فوج کی ہمت ان الفاظ سے بڑھائی۔

''غنیم کی تعداد بہ ظاہر بہت ہے، لیکن درگاہِ الٰہی کے اس نیاز مند کی طرف خداوند کارساز کی عنایت اس سے بھی زیادہ ہے، جتنی کہ انسانی عقل کے احاطہ میں آسکتی ہے، تمہارا طریقہ یہ ہو کہ تم اپنے کو عاطفت ربانی کی مضبوط رسّی میں جکڑ لو۔ تذبذب اور تزلزل کے شائبہ کو دل میں مطلق نہ لاؤ یک دل، یک رو، ایک راہ ہو کر اپنی پراگندگی کو اپنے سے دور رکھو، غنیم کی فوج کا جھنڈا سرخ ہے، اُن کے سر پر خون سوار ہے، تم نصرت کے ہم رکاب ہو کر اُن کے پاس پہنچ جاؤ۔ میدانِ جنگ میں بہادروں کو جوش میں لڑائی اور تجربے کے مسلک سے باہر نہیں ہونا چاہئے اور جب ہم اس سرکش کا کام تمام کر لیں گے، تو دوسرے بدبختوں سے چھٹکارا پالیں گے۔''[۲]

۱۰۳۵ھ میں جہانگیر کشمیر سے کابل جا رہا تھا، تو دریائے جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے سازش کر کے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، نور جہاں بھی ساتھ تھی، جہانگیر کا قید ہونا تھا کہ شاہی فوج میں انتشار پھیل گیا، لیکن نور جہاں اپنی فراست اور تدبیر سے کام لے کر مہابت خان کے پنجے سے بچ نکلی اور دریا کی طرف اپنے بھائی آصف خان سے جا ملی، وہاں پہنچ کر ارکانِ دولت خان کو طلب کیا اور نہایت ہی خشمگین ہو کر اُن کے سامنے ایک ملامت آمیز تقریر کی کہ:

''تمہاری غفلت اور ناتجربہ کاری سے ایسی بات پیش آئی، جو کسی کے تخیل

۱۔ تاریخ شیر شاہی مولفہ عباس خاں سروانی بحوالہ ذکاء اللہ جلد سوم ص ۳-۳۰۲ و ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۸۱۔ مجلس مشاورت میں شیر شاہ کی اور تقریروں کے لیے دیکھو ایلیٹ جلد چہارم ص ۲-۳۷۷-۳۳ و ذکاء اللہ جلد سوم ص ۲۹۲

۲۔ اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۴

میں بھی نہیں آ سکتی تھی، تم اب خدا اور خدا کی مخلوق کے سامنے شرمندہ ہو، لیکن یہ شرمندگی اس وقت دور ہو سکتی ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کا تدارک ہونا چاہئے، بتاؤ اب کیا کرنا ہے۔''

اس ملامت بھری تقریر کو سن کر نور جہاں کے ہمراہیوں نے بالا تفاق مہابت خان کی فوجوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔[۱]

سموگڈہ میں دارا اور اورنگ زیب کی فوجوں کا اجتماع ہوا، تو لڑائی سے ایک رات پہلے اورنگ زیب اپنے لشکر کے ''مبارزان نصرت کیش'' اور ''دلیران صف شکن'' میں یہ کہہ کر جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

''کل بہادری اور مردانگی دکھانے کا دن ہے، اس جگہ سے ہمارا پایہ تخت بہت دور ہے، یک دل اور یک رو ہو کر دشمنوں پر حملہ کرو اور اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کی ضرب سے حکومت حاصل کرو، فتح پا کر اور دشمنوں کو پسپا کر کے دنیا میں نام پیدا کرو۔

بکوشید کوشیدنِ مردوار رگ جان بکوشش کنید استوار

اگر دست بردیم ماراست ملک دگر ماشدیم آن داراست ملک[۲]

کھجوہ کی جنگ میں جسونت سنگھ کی سرداری میں راجپوت سپاہی آئینِ وفا کے خلاف اورنگ زیب کو چھوڑ کر شجاع سے جا ملے، جسونت سنگھ کے ہاتھ میں اورنگ زیب کی فوج کو میمین یعنی دائیں بازو کی کمان تھی، اُس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کر لی کہ رات کو میں عقب سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ آور ہوں گا اور تم سامنے سے حملہ کر دینا، اس طرح ہم دونوں مل کر اورنگ زیب کو پیس ڈالیں گے، چناں چہ جس وقت اورنگ زیب کو جسونت کی بے وفائی کی خبر ملی تو اس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا، اس کی فوج میں انتشار پھیلا، لیکن اس کی پیشانی پر بل نہ آیا، اس نے اطمینان کے ساتھ تہجد کی نماز ختم کی، پھر ضبط و ہمت اور وقار و تحمل کا پیکر بن کر تختِ رواں پر سوار ہوا اور اپنے امراء اور ہم رکابوں کو جمع کر کے اُن سے اس طرح مخاطب ہوا۔

---

[۱] اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۶۰ [۲] واقعاتِ جہانگیری ص ۴۲

"الحمدللہ، اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں اور اب یہی چیز میرے لیے فتح و کامرانی کی باعث ہوگی، بعض کوتہ اندیش اور بد باطن منافقوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اب غنیم کا غلبہ ضروری ہے اور اسی لیے وہ دشمنوں سے جا ملے ہیں، لیکن وہ اپنے اعمال اور خیالِ خام کی سزا پائیں گے"۔[1]

اس تقریر سے اورنگ زیب کے لشکر میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی اور اپنے آقا کا سکون اور اطمینان کلی دیکھ کر اس کو ڈھارس ہوئی، تقریر کے بعد اورنگ زیب نے نقارہ بجانے کا حکم دیا اور اپنی سواری کا ہاتھی منگوایا، تمام رات اسی ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی فوجوں کی نگرانی کرتا رہا، آفتاب طلوع ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھی شجاع کے ہاتھی کی طرف بڑھایا جائے، مرشد قلی خان نے روکا کہ اتنی جرأت بادشاہوں کے دستور کے خلاف ہے لیکن اورنگ زیب نے کہا کہ:

"کوئی شخص یونہی بادشاہ نہیں ہو جاتا، اسی قسم کی جرأت سے بادشاہت ملتی ہے اگر بادشاہت ملنے کے بعد جرأت میں کوئی فرق آ جائے تو سلطنت باقی نہیں رہ سکتی"۔

ع روسِ ملک کس در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آبدار دہد[2]

آغازِ جنگ:

جنگ عموماً صبح کو شروع ہوتی اور شام تک ختم کر دی جاتی، مگر فریقین دن کا کچھ حصہ گذار کر لڑائی شروع کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ ہزیمت اور شکست کی حالت میں رات کی تاریکی فرار ہونے میں معاون ہو۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے سرِ لشکر کے حکم سے نقارہ بجا، کرنا پھونکا جاتا اور تکبیر کہی جاتی، تو سارے لشکری تیاری میں مشغول ہو جاتے، نقارہ کی دوسری آواز میں وہ اپنے گھوڑوں کے ساتھ مسلح ہو کر اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جاتے، تیسری آواز میں وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر مزید

[1] احکام عالمگیری، بحوالہ مقدمۂ رقعات عالمگیر معارف پریس، ص ۲۷۷
[2] عالمگیر نامہ، ص ۲۵۵-۵۶ خافی خاں جلد دوم ص ۵۳

حکم کے منتظر رہتے ۱؎، چاؤش نفیری بجاتے تو لڑائی شروع ہو جاتی ۲؎، مسلمان سپاہی "اللہ اکبر" اور ہندو "نارائین یا مہادیو" کے نعروں کے ساتھ آگے بڑھتے۔ ۳؎

تیموریوں کے دور میں بھی کم و بیش یہی طریقہ مروج تھا، نقارہ اور کرنا ہی سے جنگ کا آغاز کیا جاتا تھا ۴؎، جنگی نعرے کے لیے اس دور میں جا بجا سورن کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، مسلمان سپاہیوں کے لیے اللہ اکبر کے علاوہ مختلف قسم کے سورن تھے، کبھی وہ بستان اور کبھی دہ کے غلغلے بلند کرتے۔

اکبری عہد میں تیموریوں کی فوج احمد آباد میں محمد حسین مرزا کے خلاف جنگ کر رہی تھی، تو اس موقع پر ملا بدایونی رقم طراز ہیں۔

فروشد بماہی و برشد بما بن نیزہ و قبہ بارگاہ
ہوا نیلگوں شد زمین آبنوس بجوشید دریا ز آوازِ کوس
با نگشت لشکر بہامون نمود سپاہی کہ آنرا کرانہ نبود
کمال کیانی در آمد بہ زہ یکے گفت بستان یکے گفت دہ ۵؎

کبھی "بزن بزن" اور "بکش بکش" کی بھی صدائیں بلند ہوتیں ۶؎ "اکبر کا سورن یا معین تھا ۷؎ احمد آباد کی ایک جنگ میں سیف خان کلتاش "یا اجمیری یا اجمیری" کہتا ہوا جان بحق ہوا ۸؎، کبھی لشکری بادشاہ کے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے یورش کرتے ۹؎، کبھی منادی "الجراۃ خیر من الجبن" (جرأت بزدلی سے بہتر ہے) کی ندا دے کر لشکریوں کی ہمت بڑھاتے۔ (سیر المتاخرین، جلد دوم، ص ۳۳۰)

۱؎ آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۳۷ء ۲؎ تغلق نامہ ص ۲
۳؎ ایضاً ص ۲۳-۱۳۹ ۴؎ مثال کے لیے دیکھو ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۲۸-۱ اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۰-۵۱-تزک جہانگیری ص ۱۹ - عالمگیر نامہ جلد اول ص ۶۱ وغیرہ۔
۵؎ بدایونی جلد دوم ص ۱۶۷ ۶؎ ایضاً جلد اول ص ۳۳۵-خافی خان جلد دوم ص ۵۸
۷؎ اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۵-تزک جہانگیری ص ۴۹ ۸؎ اکبر نامہ جلد سوم ۵۸-بدایونی جلد دوم ص ۱۷۰
۹؎ تزک جہانگیری ص ۱۰۲

ہندو نارائن کے علاوہ ''رام رام'' کہتے ہوئے آگے بڑھتے امر بجے'' گوپال گوپال اور ہر ہر مہادیو'' چلایا کرتے تھے۔

جنگ کی شدت میں تیغ اور نیزہ سے لڑنے والے سوار مخالف فوجوں کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے، ایسی حالت میں دوست اور دشمن کا امتیاز یا تو خاص خاص لباس سے کیا کیا جاتا یا نہیں، تو مقررہ الفاظ ہوتے، محمد تغلق جب عین الملک کے خلاف جنگ کر رہا تھا تو اس سلسلہ میں ابن بطوطہ لکھتا ہے۔

''بادشاہ نے اس رات اپنی علامت ''دہلی'' اور غزنی مقرر کی تھی، جب ہمارے لشکر کا کوئی سوار دوسرے کو ملتا تھا، تو دہلی کا لفظ کہتا تھا، اگر دوسرے نے غزنی کا جواب دیا، تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے، لشکر کا ہے ورنہ حکم تھا کہ اس کو قتل کر دو''۔[۲]

غیاث الدین تغلق خسرو خان سے معرکہ آرا تھا، تو اس کی فوج کی علامت کا لفظ ''قلا''[۳] تھا، تیموری دور کی کسی فوج کا امتیازی لفظ معلوم نہیں ہو سکا۔

یورش:

یورش میں عموماً پہلے مقدمہ کی فوج آگے بڑھتی، پھر میمنہ کی فوج پیش قدمی کرتی[۴] پھر قلب معرکہ آرا ہوتا، میسرہ آخر میں بڑھتا[۵] مسلمان حکمرانوں کے ابتدائی دور میں جب آتشیں اسلحہ کی فراوانی نہ تھی، تو غنیم کی فوجوں میں پہلے تیروں کی بارش سے انتشار پھیلانے کی کوشش کی جاتی، راجہ پتھورا کے خلاف دوسری جنگ کرنے کے لیے شہاب الدین غوری میدان میں اترا تو طبقات ناصری کے مصنف کا بیان ہے۔

---

۱ واقعات عالمگیری ص ۲۹ ۲ سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۶۸۱

۳ تغلق نامہ ص ۱۲۳

۴ مثال کے لیے دیکھو کیلی میں علاء الدین اور قتلغ خواجہ مغل کی جنگ، برنی ص ۳۶

۵ آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر (اکتوبر ۳۷ء)

"فرمان داد کہ می باید کہ از چہار طرف میمنہ ومیسرہ
وخلف وقدام لشکر بہر طرف دہ ہزار سوار تیرانداز دست
بر لشکر کفار می دارند۔"[۱]

مسلمانوں کی حکومت جب ہندوستان میں باضابطہ قائم ہوئی اور لشکر میں ہاتھیوں کی تعداد زیادہ رہنے لگی، تو ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج میں تیرانداز سوار[۲] رہتے تھے تغلق نامہ[۳] میں ہے۔

صف پیلان چون صف ابرازار	ہراہیے برق حملہ، باد رفتار
نہ خوذ ہر پیل چون کوہیے با شکوہ	بر و بر گستوان چون ابر بر کوہ
بہ پشت پیل ترکان تیر در شست	چو کوہیے کو بہ پشت کوہ بنشست[۴]

ہودج کی برجوں کی ہر سمت میں سوراخ بنے ہوتے تھے، جن سے تاک تاک کر تیروں کے نشانے لگائے جاتے تھے[۵]، یہ تیر کبھی آتشیں اور کبھی زہر میں بجھے ہوتے تھے، ہاتھی کی عماریوں پر سے شیشہ کی نلکیوں کے ذریعہ سے روغن نفط بھی دشمنوں پر اچھالا جاتا تھا، جس سے شعلے پیدا ہوتے تھے، کبھی منجنیق کے ذریعہ سے پتھر اور آتش گیر مادے پھینکے جاتے تھے۔ محمود تغلق تیمور کے خلاف جنگ کر رہا تھا، تو اس کے ہاتھیوں پر "رعد انداز" آتش باز اور تخش انداز تھے۔ تیموریوں کی آمد سے پہلے دکنی ریاستوں میں توپوں کا بھی رواج ہو گیا تھا، چناں چہ توپوں اور بارود سے بھی دشمن میں اختلال پیدا کیا جاتا، کبھی ان کی صف شکنی ہاتھیوں کے یلغار سے بھی کی جاتی۔

ان ذرائع سے غنیم کے لشکر میں سراسیمگی پھیل جاتی، تو شمشیر تیغ، تیر اور نیزے سے لڑنے والے سوار اور پیدل سپاہی اپنے افسروں کے حکم اور اشارے پر تیزی سے آگے بڑھتے، پھر گھمسان کی لڑائی شروع ہو جاتی۔

۱۔ طبقات ناصری ص ۱۲۰
۲۔ صبح الاعشیٰ، بحوالہ معارف جلد ۳۹ نمبر ۶
۳۔ تغلق نامہ ص ۹۲
۴۔ صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف نمبر ۹ جلد ۳۹
۵۔ ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ۴۳۳

لڑائی کا سارا دباؤ غنیم کے قلب یعنی مرکزی صف پر ہوتا، جہاں عموماً سر لشکر کی جگہ ہوتی، اس لیے علم انداز یعنی ماہر تیر انداز خاص خاص جگہوں پر مامور کیے جاتے کہ دور سے اپنے تیروں کے نشانہ سے غنیم کے سر لشکر کو ہلاک کردیں یا اس کے ہاتھی کو مجروح کردیں، پھر فتح و نصرت میں آسانی ہو جاتی۔

فوج کا کوئی بازو کمزور ہوتا ہوا نظر آتا، تو فوج محفوظ یا دوسرا بازو مدد کو پہنچتا، اس قسم کی مدد پہونچانے میں غیر معمولی جنگی احتیاط کی جاتی تھی۔ ہمایوں اور شیر خان کے درمیان قنوج میں جنگ ہو رہی تھی، تو عباس خان سروانی کا بیان ہے:-

> ''شہنشاہ (یعنی ہمایوںؒ) کے مقدمۃ الجیش کو خواص خان کے لشکر نے شکست دی، لیکن شیر شاہ کے میمنہ نے جو جلال خان کی نگرانی میں تھا، شکست پائی، اس بازو کے چار سرداروں جلال خاں، میاں ایوب سروانی، غازی بجلی محمد گلکھر نے میدان نہیں چھوڑا، جب شیر شاہ نے دیکھا کہ اس کے میمنہ کو شکست ہوگئی ہے، تو خود قلب سے اپنے لشکر کو لے کر مدد کرنے کا ارادہ کیا، لیکن قطب خان لودی نے عرض کیا کہ حضور اپنی جگہ کو نہ چھوڑیں کہیں لوگوں کا خیال ایسا نہ ہو کہ قلب سپاہ کو بھی شکست ہوگئی، اس وقت مناسب یہ ہے کہ دشمنوں کے درمیان گھس جائیں، جب شیر شاہ کی سپاہ سیدھی ہمایوں بادشاہ کے لشکر کی طرف چلی، تو اُس نے اس سپاہ کو شکست دی، جس نے اس کے میمنہ کو شکست دی تھی اور وہ بھاگ کر ہمایوں کے قلب سپاہ میں چلی گئی۔ شیر شاہ میمنہ کے سامنے مغلوں کو پیچھے ڈھکیل چکا، تو اس کے میسرہ کی فوج اپنے مد مقابل فوج کو ہٹا کر ہمایوں بادشاہ کے قلب کی طرف بڑھی، شکست یافتہ میمنہ نے بھی پھر کر ہمایوں بادشاہ کو گھیر لیا''۔[1]

[1] ذکاء اللہ جلد سوم ص ۳۰۳ - ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۸۲

امیر تیمور نے غنیم سے لڑنے کے لیے جو خاص خاص ضوابط و قوانین مرتب کیے تھے، وہ بہت ہی واضح اور روشن ہیں، وہ خود تزک تیموری میں لکھتا ہے:[1]

''فوج غنیم سے ایک منزل کی مسافت پر روبرو کھڑی ہو...... اور میں نے حکم دیا کہ جنگ کے ایک روز پہلے صف آرائی ہو جائے اور فوج کو آراستہ کر کے قدم آگے بڑھایا جائے اور جس ایک سمت سے جائیں، پھر اسی سمت اپنے گھوڑوں کے سروں کو نہ پھیریں اور دائیں بائیں اپنے کو متوجہ نہ کریں اور میں نے حکم دیا کہ لشکریوں کی نظر غنیم کی فوجوں پر پڑے تو بلند آواز سے تکبیر کہہ کر سورن یعنی جنگی نعرے لگائیں......

''اور اگر لشکر کا عارض دیکھتا ہو کہ کوئی سردار غلطی کر رہا ہے، تو وہ اس کی جگہ پر دوسرے کو مامور کرے......

اور میں نے حکم دیا کہ لشکر کے سردار عارض مدد سے غنیم کی فوج کی کمی اور زیادتی کو ملاحظہ کریں اور اپنے اور غنیم کے سرداروں کا مقابلہ کریں اور کمی اور زیادتی کی تلافی اور تدارک کریں، اپنی اور دشمن کی سپاہ کے اسلحہ کا جائزہ لیں اور غنیم کی رفتار کو دیکھتے رہیں کہ آہستہ اور مسلسل وہ جنگ کرتے ہیں یا اضطراب کے ساتھ،

اور دشمن سے لڑنے کا طریقہ ذہن نشین کر لیں کہ ایک ساتھ حملہ کریں یا ایک فوج کے بعد دوسری فوج کو بھیج کر حملہ کریں اور یہ دیکھیں کہ حملہ کے وقت دشمن پہنچ کر واپس جاتا ہے اور پھر دوبارہ حملہ کرتا ہے یا پہلے ہی حملہ پر اکتفا کرتا ہے، اگر ایسا ہو تو داہنے جانب کی فوج جو اُن کے حملہ کا صدمہ برداشت کرتی ہے، صبر کرے، کیوں کہ ایک ساعت کا صبر ہی اصلی بہادری ہے۔

---

[1] تزک تیموری ص ۲۰۷-۱۹۱

اور میں نے حکم دیا کہ جب تک دشمن خود جنگ میں پیش قدمی نہ کرے، اس پر سبقت نہ کریں اور میں نے حکم دیا کہ جب دشمن میدان میں آئے، سردار کو افواج نہگانہ پر نظر رکھنا اور ان کو کام کرنے کی ہدایت کرنا چاہیے، کیوں کہ سردار کا کام یہی ہے کہ فوج کو کام میں لگائے اور سردار کو چاہیے کہ کام کے وقت اپنے دل کو کمزور نہ کرے اور ہوش وحواس میں خلل نہ آنے دے اور فوج کو بمنزلہ ایک ہتھیار کے ہاتھ میں رکھے، کوئی تیر ہو، کوئی تبر، کوئی تلوار، کوئی گرز، کوئی چھری اور کوئی خنجر اور ہر فوج سے خاص خاص اوقات میں کام لے اور سردار کو چاہیے کہ نہ تو فوج کو اور نہ خود اپنے کو ایک کشتی لڑنے والے شخص کی طرح سمجھے، جو اپنے ہر عضو یعنی ہاتھ پاؤں، سر اور سینہ وغیرہ سے لڑائی کرتا ہے اور امید ہے کہ جب تلوار کی تو ضرب باری باری دشمن کو لگے گی، تو وہ نویں ضرب میں ضرور شکست پا جائے گا۔

اور سردار کو چاہیے کہ پہلے ہراول فوج کو دشمن کے مقابلے میں بھیجے اور ہراول برانغار کو اس کے پیچھے مدد کو بھیجے اور ہراول برانغار کے پیچھے، ہراول جرانغار کو بھیجے، تاکہ دشمن کی فوج پر تین ضرب لگے اور اگر اس وقت ہراول شکست کھا جائے، تو برانغار کی فوج اوّل کو روانہ کرے اور اس کے پیچھے جرانغار کی فوج دوم کو بھیجے، اگر فتح حاصل نہ ہو، تو برانغار کی فوج دوم کو آگے بڑھائے اور اس کے پیچھے جرانغار کی فوج اوّل کو روانہ کرے اور مجھ کو اطلاع دے اور میرے رایات کا منتظر رہے اور خدا پر بھروسہ کر کے سردار خود شریک جنگ ہو اور مجھ کو معرکہ میں حاضر سمجھے کہ بہ توفیق الٰہی جب دشمن پر آٹھ ضرب لگے گی، تو نویں ضرب میں شکست کھا جائے گا اور فتح حاصل ہو جائے گی۔

اور سردار کو جلدی بھی نہیں کرنی چاہیے اور لشکر کو کام پر لگائے اور جب خود اس کی باری آئے تو جہاں تک ممکن ہو، اپنے کو قتل نہ ہونے دے کہ سردار کے قتل ہو جانے سے بدنامی ہوتی ہے اور دشمن بھی دیدہ دلیر ہو جاتا ہے، پس سردار کو چاہیے کہ رائے اور تدبیر سے کام کرے اور عجلت نہ کرے کہ عجلت شیطان کا کام ہے اور ایسی جگہ نہ جائے، جہاں سے نکل نہ سکے......

میں نے حکم دیا کہ اگر غنیم کا لشکر بارہ ہزار سے زیادہ ہو، لیکن چالیس ہزار تک نہ پہنچتا ہو، تو اس کے مقابلہ میں میرے کامگار فرزندوں میں سے کوئی ایک سردار ہو اور اس کے رکاب میں دو بیلگر بیگی، امراء اور اتنے قشون، تومان اور الوس ہوں، جن میں چالیس ہزار سوار سے کم نہ ہوں اور غالب ہونے والی فوج کو چاہیے کہ مجھ کو حاضر سمجھ کر تدبیر جواں مردی اور بہادری کے سررشتہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیں......

اور سردار وہی ہے کہ غنیم کی سپاہ کے سردار کو شمار کر کے ان کے مقابلہ میں سرداروں کو متعین کرے اور دشمن کی سپاہ میں، اوچیوں، شمشیر اندازوں اور نیزہ بازوں کو نگاہ میں رکھے اور غنیم کی سپاہ کی رفتار کو دیکھے کہ وہ پیوستہ یا آہستہ فوج پر فوج میدان جنگ میں لاتا ہے یا تیزی سے آتا ہے؟ اور اپنے درآمد و برآمد کی راہ کو میدان جنگ میں ملاحظہ کرے اور غنیم کی جنگ کے شیوہ اور روش کو دریافت کرے، کیوں کہ کبھی وہ اپنے کو کم نمودار کرتے ہیں اور اپنے کو بھاگتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں، ان کے مکر اور گریز پائی سے محفوظ رہنا چاہیے۔

اور جنگ کا تجربہ کار آزمودہ سردار وہی ہے کہ جنگ کے معاملات کو سمجھتا ہو کہ کون سی فوج کو آگے بڑھانا چاہیے اور کون سے رخنہ کو تدبیر سے بند کرنا چاہیے اور کس طرح لڑائی چاہیے، سردار وہ ہے جو

غنیم کے ارادہ کو سمجھتا ہو کہ کس روش پر وہ جنگ کرے گا اور اس کے تمام شیوہ کو اس پر مسدود کر دیتا ہے......

سردار وہ ہے کہ غنیم کی رفتار پر نظر رکھتا ہو اور ہر ایسے امیر کو جو بغیر حکم کے حرکت اور تیزی کرتا ہو، تنبیہ کرتا ہو۔

اور سردار وہ ہے کہ غنیم کے درآمد اور برآمد پر نظر رکھتا ہو اور جنگ کرنے میں اضطراب کا اظہار نہ کرتا ہو، یہاں غنیم خود جنگ میں پیش قدمی کو راہ دیتا ہو اور جب غنیم لڑائی شروع کر دے، تو سردار کو چاہئے کہ ان کی لڑائی کے طریقے کو دیکھے کہ کس طرح وہ میدان جنگ میں داخل ہوتا ہے اور باہر ہو جاتا ہے اور کس طرح اس پر حملہ کیا جائے۔

کبھی غنیم اپنی تعداد کو کم دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور بظاہر بھاگتا نظر آتا ہے، لیکن اس کے اس قسم کے مکروفریب میں نہیں آنا چاہئے۔

اعلیٰ اور تجربہ کار سردار وہ ہے، جو جنگ کے طریقوں سے واقف ہو کہ کون سی فوج کو آگے بڑھانا چاہئے اور اگر فوج میں رخنہ پیدا ہو رہا ہو، تو کون سی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے، سردار کو چاہئے کہ غنیم کے ارادے سے واقف رہے کہ کس طرح وہ جنگ کرے گا اور کس طرح اس کی چالوں کا انسداد کیا جائے گا۔

اور سردار کو چاہئے کہ یہ دیکھے کہ غنیم میدان میں پیش قدمی کر کے حملہ کرتا ہے یا اپنے چپ و راست کی فوجوں کو بڑھائے ہوئے ہے، اسی حالت میں سردار کو چاہئے کہ پہلے ہراول کو ان کے روبرو کرے اور جنگ کرے اور پھر ہراول چپاول اور ہراول شقاول کو ہراول کلاں کی مدد کو بھیجے اور ان کے پیچھے چپاول کی فوج اول اور شقاول کی فوج دوم کو بڑھا کر جنگ کرے اور پھر ان کے پیچھے چپاول کی فوج دوم اور شقاول کی فوج

اوّل کو روانہ کرے۔

اگر ان سات ضربوں سے غنیم پر فتح حاصل نہ ہو، تو اس وقت ہراول برانغار اور ہراول جرانغار دوڑایا جائے، یہاں تک کہ غنیم پر تو ضربیں وارد ہو جائیں اور اگر ان ضربوں سے بھی فتح میسر نہ ہو، تو برانغار کی فوج اوّل اور جرانغار کی فوج دوئم آگے بڑھائی جائے۔

اگر ان گیارہ ضربوں پر بھی فتح حاصل نہ ہو، تو برانغار کی فوج دوم اور جرانغار کی فوج اوّل جنگ کے لیے بھیجی جائے، پھر امید ہے کہ ان تیرہ ضربوں کے بعد غنیم کی فوج کو شکست ہو جائے گی اور فتح حاصل ہو گی۔ اور اگر احیاناً ان تیرہ ضربوں سے بھی فتح حاصل نہ ہو، تو اس وقت سردار کو چاہیے کہ قول کی فوج کو آراستہ کر کے اس طرح روانہ کرے کہ غنیم کی نظر میں وہ پہاڑ نظر آئے، وہ آہستہ اور پیوستہ ہو کر روانہ ہو اور فوجی بہادروں کو حکم دے کہ شمشیر لے کر ہجوم کریں قچیاں تیر چلائیں اور اگر فتح نہ ہو، تو خود سردار جنگ کے لیے قدم بڑھائے اور میرے رایات کا منتظر ہو.........

''اور میں نے حکم دیا کہ افواج چہل گانہ کے امراء کو جب تک میرا فرمان نہ پہونچے جنگ شروع نہ کریں اور جب تک جنگ کی نوبت ان لوگوں تک نہ پہونچے، دست بردنہ دکھائیں، لیکن جنگ کے لیے مستعد اور آمادہ رہیں۔''

''اور جب جنگ کا حکم ان کے پاس پہنچ جائے، تو غنیم کی روش کو دیکھ کر جنگ کریں، یہ دیکھیں کہ غنیم کس راستہ سے آتا ہے، اس راستہ کو اس کے لیے بند کر دیں اور جو راستہ غنیم کے لیے بند ہو گیا ہو، اس کو پھر تدبیر سے کھولیں۔

اور میں نے حکم دیا کہ جب ہراول ہراول جنگ میں پیش قدمی

کرے، امیر ہراول ہراول جنگ میں پیش قدمی کرے، امیر ہراول اپنی فوج کے چھ حصوں کو یکے بعد دیگرے اور ایک دوسرے کے پیچھے جنگ کے لیے بڑھائے، اگر اس طرح چھ متواتر ضربیں لگائی جائیں، تو غنیم کو شکست ضرور ہو جائے گی، اس وقت امیر چپاول کو بھی چاہئے کہ اپنی چھ فوجوں کو باری باری کمک کو بھیجے اور خود حملہ آور ہو اور اسی طرح افواج شقاول کے امیر کو اپنی چھ فوجوں کو آگے والی فوج کی مدد کو روانہ کرے اور اپنے کو بھی وہاں تک پہنچائے اور جب اٹھارہ ضربیں غنیم پر لگائی جائیں گی تو اس کو شکست ہوگی۔

اور اگر اس کے باوجود غنیم خیرگی دکھائے، تو امیر برانغار کو چاہئے کہ اپنے ہراول کو بڑھائے اور امیر جرانغار بھی اپنے ہراول کو روانہ کرے۔

جب چپ و راست سے یہ دونوں ہراول بڑھیں گے، تو البتہ غنیم کا لشکر بے تاب اور ناتواں ہوگا۔

اور اگر اس پر بھی غنیم خیرہ رہے، تو امیر برانغار و امیر جرانغار اپنی اپنی فوج کو باری باری غنیم کی طرف بڑھائیں اور اگر وہ دیکھیں کہ غنیم کی فوج کو افواج قاہرہ سے شکست نہیں ہو رہی ہے، تو برانغار اور جرانغار کے امیر خود..... دشمنوں کے رفع دفع کرنے میں متوجہ ہوں۔

اور اگر اس وقت برانغار اور جرانغار کے امیروں کا حال خراب ہو، تو امیر زادگان جو طرح برانغار میں ہوں اور خویشاوندان جو طرح جرانغار میں ہوں، غنیم پر حملہ آور ہو جائیں، اس وقت ان کی نظریں سردار اور سردار کے علم پر ہوں اور شجاعت اور جواں مردی سے غنیم کی صف شکنی کریں اور غنیم کے سردار کو گرفتار کرنے کا قصد رکھیں اور کوشش کریں کہ مخالفوں کا علم نگونسار ہو۔

اور اگر ان تمام ضربوں کے باوجود بھی غنیم اپنی جگہ پر قائم ہو، تو اس وقت چاہئے کہ متفرق فوجیں، قول کے بہادر، الوسات (قبیلے) کی فوجیں جو قول کے عقب میں آراستہ ہوں، یک بارگی ہجوم کر کے حملہ آور ہو جائیں۔

اور اگر اس وقت بھی فتح نہ ہو، تو سلطان کو چاہئے کہ خود قوی دل اور بلند ہمت کے ساتھ حرکت کرے"

اور اگر غنیم قزاقی کر کے چپاول، منقاول، برانغار اور جرانغار کو برہم کر کے قول تک پہنچ گیا ہو، تو سلطان کو واجب ہے کہ اپنے پائے شجاعت کو صبر کے رکاب میں مستحکم کرے اور غنیم کے رفع و دفع کرنے کی طرف متوجہ ہو۔

گولہ باری:

مندرجۂ بالا طویل اقتباسات سے لڑائی کے موقع پر تیموری فوجوں کی مختلف صفوں کی یورش، یلغار اور طرز جنگ کا اندازہ ہوا ہوگا، تیمور کے جانشین مصالح اور مواقع کی بناء پر ان میں وقتاً فوقتاً فروعی ترمیم کرتے رہے، لیکن اصول تمام تر یکساں رہے، آتشیں اسلحہ کی غیر معمولی ترقی سے بھی یورش و یلغار کی نوعیت بدلتی رہی، جب فوج میں آتشیں اسلحہ کی کثرت ہوتی، تو غنیم کے لشکر میں انتشار پھیلانے اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچانے کی غرض سے جنگ کی ابتدا، توپ و تفنگ یعنی رعد، دیگ، بان، زنبورک، ضرب زن، جنجال، گجنال، سرنال شاہین، دھماکے اور ہکلے کے وار سے کی جاتی۔

رانا سانگا کے خلاف بابر کی فوج صف آرا ہوئی، تو اس نے تفنگچیوں اور رعد اندازوں کو اپنی فوج کے آگے رکھا، ارابوں پر تفنگ اور رعد تھے اور یہ ارابے زنجیروں سے متصل تھے، جن کے پیچھے تفنگچی اور رعد انداز محفوظ کھڑے تھے، یہ طریقہ رومیوں کا تھا، چنانچہ بابر خود اپنی تزک میں لکھتا ہے:

"رعایت حزم را مرعی داشته بطریق غزات روم بجهت تفنگچیان در رعد اندازان که در پیش سپاه بودند، صفے از ارابه تربیت نموده با یکد گر بزنجیر اتصال داده شد"۔ (ص۳۱۳)

بابر کے قول میں شاہی تفنگچی تعینات ہوئے اور قول کے دائیں جانب بھی تفنگچی اور ضرب زن تھے، جن کی نگرانی نادر العصر مصطفےٰ رومی کر رہا تھا، قول کے آگے بھاری بھاری توپوں کے ساتھ نادر العصر استاد علی قلی تھا، لڑائی شروع ہوئی، تو مصطفےٰ رومی نے ارابے کو آگے بڑھایا اور تفنگچیوں اور ضربوں کے ذریعہ سے راجپوتوں کی صفوں کو درہم برہم کرنا شروع کیا، اکبر نامہ میں ہے:

"مصطفےٰ رومی از غول حضرت جهانبانی ارابجار اپیش آوردو تفنگ و ضرب زن آنچنان صفوف مخالف را درہم شکست که زنگ از آئینه دلهاے بهادران بزدودو وجود بسیارے از مخالفان با خاک ہلاک برابر کرده برباد فنا داد"۔ (جلد۱، ص۱۰۸)

اور جب لڑائی گھمسان ہونے لگی، تو بابر نے حکم دیا کہ ارابے کے پیچھے سے قول کے راست وچپ سے اس کی خاص فوج آگے بڑھے اور آگے بڑھتے وقت تفنگچیوں کے لیے بیچ میں جگہ چھوڑ دے اور جب یہ فوج آگے بڑھ رہی تھی، تو استاد علی قلی نے جو قول کے آگے تھا، اپنی توپوں سے آتش باری شروع کی، ان توپوں سے بڑے بڑے گولے پھینکے جانے لگے، ان گولوں کا ذکر بابر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"سنگهاے عظیم القدر که چون در پله میزان اعمالش نهند صاحبش "فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ" نام برآورده، اگر بر کوه راسخ و جبل شامخش اندازند، کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ از پا درآورد" (ص۳۱۶)

ان گولوں سے راجپوتوں میں بڑی سراسیمگی پھیلی، اسی اثناء میں قول کے شاہی تفنگ انداز نے بھی ارابے کے پیچھے سے آگے بڑھ کر یلغار کیا اور جب یہ غنیم کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، تو بابر قول کے ارابے کو لے کر آگے بڑھ گیا، پھر لڑائی انتہائی شدت کو پہونچ گئی اور راجپوتوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔[۱]

پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کو اپنے توپ خانے کی کیفیت وکمیت دونوں پر بڑا ناز تھا، اس لیے پہلے اس نے اپنی بھاری بھاری توپوں کو آگے بھیج کر لڑائی شروع کی، لیکن اکبر کے لشکریوں نے عجلت چابک دستی اور غیر معمولی جان بازی سے کام لے کر ان پر قبضہ کر لیا، جس سے ہیمو کی قوت پر بڑی ضرب کاری لگی۔[۲]

۸۲ھ میں اکبر کی فوج بنگال میں بجورا کے پاس داؤد خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی، تو دونوں طرف لشکر کے آگے منگلوسی ہاتھی رکھے گئے، اکبر کی فوج میں ضرب زن اور زنبورک چھکڑوں میں رکھے ہوئے تھے، لڑائی شروع ہوئی تو داؤد خان نے اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا، لیکن شاہی فوج کے ضرب زن اور زنبورک نے ہاتھیوں کو آگے بڑھنے سے روکا، گولہ باری سے ہاتھی مڑ کر بھاگے اور پھر اتنی سخت گولہ باری ہوئی کہ داؤد کے بہت سے فوجی ہلاک ہو گئے۔[۳]

اڑیسہ میں اکبری فوج جانی بیگ سے برسر پیکار ہوئی، تو اس لڑائی میں بھی شاہی فوج کی توپوں نے بڑی ہولناکی پیدا کی، لڑائی توپوں کی گولہ باری ہی سے شروع کی گئی، غنیم کو اپنے ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، لیکن توپ کے گولوں نے ہاتھیوں پر ایسی زد لگائی کہ سب کے سب ہلاک ہو گئے، اکبر نامہ میں ہے۔

"توپے کہ نخست بر کشودند، میان لہری را (کہ سر آمد
فیلان غنیم بود) با دیگر فیل خرمن ہستی بسوخت" [۴]

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھو تزک بابری اردو ترجمہ ص ۱۷-۳۱۴، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۶-۱۰۷

۲۔ اکبر نامہ جلد دوم ۳۶-۳۵ ۳۔ بدایونی جلد دوم ص ۱۹۴

۴۔ اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۱۴

جہانگیر کی فوج عنبر کے خلاف دکن میں صف آرا ہوئی، تو عنبر نے جہانگیر کا مقابلہ بڑی بڑی توپوں کے ساتھ کیا، دونوں طرف سے لڑائی کی ابتداء بان اور توپ ہی سے کی گئی، غنیم کی فوجوں میں جہانگیر کی توپوں سے ابتری پھیلی، تو شاہی فوج کے بہادر اور دلیر سردار تلوار ین سونت کر غنیم کے ہراول پر ٹوٹ پڑے اور ایسی مردانگی دکھائی کہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ دشمن بنات النعش کی طرح پراگندہ ہو گئے۔ [1]

۱۰۵۷ھ میں بلخ میں شاہجہانی فوج کا مقابلہ نذر محمد خان کے لشکر سے ہوا، تو اس کی ابتداء جس طرح ہوئی، اس کا حال عبدالحمید لاہوری کی زبان سے ملاحظہ ہو۔ [2]

> "جب دونوں طرف کے فوجی صف آرا ہو گئے، تو شاہی لشکر کے بان اندازوں اور تفنگچیوں نے بان اور تفنگ کے وار شروع کیے، بان کی ضرب سے غنیم کی فوجیں ہلاک ہونے لگیں، بان اور تفنگ کے عجیب وغریب وار سے بڑی ڈراؤنی آواز بلند ہوتی گئی، ایسی کہ شیر کا پتہ بھی پانی ہو جائے ان آوازوں سے غنیم کے برانغار جرانغار فوجوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگنے لگیں، اس بھگدڑ سے نذر محمد خان نے بھی لڑائی سے منہ موڑ لیا"۔ [3]

دھرماوت کے میدان میں اورنگ زیب اور مہاراجہ جسونت سنگھ سے لڑائی ہوئی، تو اس کا آغاز بھی بان اور تفنگ سے ہوا اورنگ زیب کے ہراول کی آتش باری اور گولہ باری سے جسونت سنگھ کی صف میں بڑی سراسیمگی پھیلی، راجپوتوں نے اپنے کو ہلاک ہوتے دیکھ کر اورنگ زیب کے توپ خانہ پر یورش کی، جس سے اورنگ زیب کے توپ چیوں میں انتشار پیدا ہو گیا، لیکن اس موقع پر مرشد قلی خاں اور ذوالفقار خان کی غیر معمولی شجاعت اور مردانگی نے اورنگ زیب کی فوج کو سنبھالا، ذوالفقار خان گھوڑے سے اتر کر میدانِ جنگ میں کود پڑا اور تلوار سے راجپوتوں کا

۱۔ تزک جہانگیری ص ۱۵۲

۲۔ آزاد ترجمہ کیا گیا ہے

۳۔ بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۵۵۱ - نیز دیکھو بلخ کی جنگ شہزادہ اورنگ زیب کی نگرانی میں ص ۶۸۹

مقابلہ کرنا شروع کیا، اسی اثناء میں اورنگ زیب کے توپ چیوں نے اپنی توپوں کو اونچی جگہ پر جما کر غنیم کے قلب میں آتش بازی شروع کی، جس سے اُن کے درمیان بڑی ابتری پیدا ہوگئی۔[1]

سموگڑھ کی لڑائی میں دارا کے لشکر کے پورے ہراول میں توپ خانہ ہی تھا، بڑی بڑی توپوں کی آڑ میں تفنگچی کھڑے تھے، ان کے پیچھے اونٹوں کی قطار تھی، جن کی پشت پر شترنال تھی،..... اونٹوں کے پیچھے ہاتھی تھے، جن کے اوپر گجنال تھی۔ اورنگ زیب کے ہراول میں بھی دو توپ خانے علحدہ علحدہ نگراں کی نگرانی میں تھے، طرفین کی طرف سے بان، توپ اور تفنگ ہی سے لڑائی شروع کی گئی۔ دارا نے حملہ کرنے میں پیش قدمی کی، اس نے اپنی توپوں سے لڑائی کے شعلے بلند کیے، گولوں کے دھوئیں سے فضا بالکل تاریک ہوگئی، جیسے اندھیری رات کی تاریکی چھائی ہو۔ اورنگ زیب نے اپنی توپوں کو استعمال کرنے میں احتیاط کی، دور سے گولہ باری کرکے، بارود کو ضائع ہونے نہیں دیا، غنیم کے نزدیک آنے کا منتظر رہا، اس کی توپوں کی خاموشی سے دارا کے لشکریوں کو غلط فہمی ہوئی، اس کا لڑکا شہزادہ سپہر شکوہ اپنی فوج کے مشہور اور آزمودہ کار رہبر رستم خان دکنی کو لے کر دس بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ زیب کے توپ خانے کی طرف بڑھا، سواروں نے اورنگ زیب کے ہراول میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ہراول میں توپیں زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں، اورنگ زیب کا میر آتش اور اس کے ساتھ کے تفنگچی اور توپ چی اپنی جگہوں پر جمے رہے، انھوں نے غنیم کے بڑھتے ہوئے لشکر پر ایسی ہولناک آتش باری کی کہ اُن کی یلغار بالکل ناکام رہی، ٹھیک اسی وقت ایک گولہ رستم خان کے ہاتھی پر گرا، جس سے ہاتھی زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ رستم خان نے اپنی شجاعت کا جوہر دکھانا چاہا، وہ غنیم کے بائیں بازو کی طرف لپکا، لیکن اورنگ زیب کے توپ چیوں نے اس کے ہمراہیوں پر اتنی سخت گولہ باری کی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ دارا اپنے لڑکے سپہر شکوہ اور فوجی سردار رستم خان کی پسپائی نہ دیکھ سکا، اپنی جگہ چھوڑ کر اورنگ زیب کے توپخانے کی طرف بڑھا، خود آگے آگے تھا اور اس کے تفنگ چیوں کا دستہ پیچھے پیچھے تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے توپ چیوں کو گولہ باری کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، لیکن

[1] تفصیل کے لیے دیکھو عالمگیر نامہ ص ۷۳-۶۲

اورنگ زیب کے لشکریوں نے بان، توپ اور تفنگ کا حملہ اتنی تیزی اور شدت سے جاری رکھا کہ دارا کے توپ چیوں کو جوابی حملہ کرنے کا بالکل موقع نہ ملا، دارا خطرے میں گھرا ہوا تھا، اس نے اپنے کو پیچھے کر کے توپ چیوں کو آگے بڑھانا چاہا، لیکن اس وقت تک بڑی تاخیر ہو چکی تھی، اورنگ زیب کی توپیں برابر کام کر رہی تھیں اور دارا کے لشکری موت کے گھاٹ اتر رہے تھے، دارا دشمنوں کی آتش باری سے بچنے کی خاطر دائیں جانب اپنے ہراول کی طرف مڑ گیا، لیکن ابھی وہ اپنے ہراول کے پاس پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اورنگ زیب کی توپوں سے اس کے (یعنی دارا کے) سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد لقمۂ اجل بن گئی، دارا کی فوج میں ابتری پھیلتی جا رہی تھی۔ اورنگ زیب کے یمین یعنی اس کی فوج دست راست نے اس ابتری سے فائدہ اٹھایا اور چکر کاٹ کر دارا کی فوج کو گھیر لیا، پھر یمین و یسار کی توپوں نے ایک ساتھ دارا کے لشکریوں پر مسلسل گولہ باری شروع کی۔ دارا کے توپ چیوں کو جواب دینے کا موقع بالکل میسر نہیں ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب کی فوج سمندر کی موجوں کی طرح دارا کے لشکر کی طرف بڑھتی گئی، اورنگ زیب کے پاس بے شمار توپ و تفنگ تھی، جن کی گرج سے میدان جنگ میں ایک زلزلہ سا آ گیا، آٹھ آٹھ دس دس سیر کے گولے ہوا میں اڑ رہے تھے، توپ چی دارا کے ہاتھی کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے، دارا کے جاں نثار امراء اور لشکری اس کے ہاتھی کے اردگرد کٹ کٹ کر گر رہے تھے، دارا اپنے جان نثاروں کو اس طرح پسپا ہوتے..... دیکھ کر سراسیمہ اور پریشان ہو رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے، یکا یک ایک گولہ اس کے ہاتھی کے ہودج پر آ کر گرا، اس سے خوف زدہ ہو کر وہ ہاتھی کے ہودج سے اتر آیا اور اتنی عجلت میں کہ وہ اپنی جوتیاں بھی پہن نہ سکا، ہاتھی سے اتر کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا، لیکن جب اس کے لشکریوں نے ہاتھی کے ہودج کو خالی دیکھا، تو وہ سمجھے کہ جس کے لیے جنگ ہو رہی ہے، وہی تمام ہو چکا ہے، ان کا یہ سمجھنا تھا کہ میدان جنگ سے ان کے قدم اکھڑ گئے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو عالمگیر نامہ ص ۱۰۵-۹۶ - واقعات عالمگیر ص ۲۸-۲۳ - خافی خان ص ۳۱-۲۸ اس جنگ کے بہت بڑے ماہر جدوناتھ سرکار نے بھی اپنی تصنیف ہسٹری آف اورنگ زیب کی جلد دوم باب ۱۶ میں مختلف تاریخوں سے اخذ کر کے اس جنگ کی بہت سی تفصیلات لکھی ہیں۔

بہادر شاہ عالم کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ لاہور کے پاس ہوئی، تو توپ تفنگ کا سخت معرکہ ہوا، شہزادہ عظیم الشان نے اپنے لشکر کا پڑاؤ راوی کے ساحل پر خندقیں کھود کر ڈالا، اس کے ساتھ کچھ بڑی بڑی توپیں تھیں، جن میں سے بعض کو ڈھائی سو بیل اور پانچ چھ ہاتھی مل کر کھینچتے تھے، عظیم الشان کے مقابلہ میں جہاندار شاہ، رفیع الشان اور جہان شاہ ایک ساتھ تھے، ان تینوں شہزادوں نے اپنے لشکر کا پڑاؤ عظیم الشان کی فوج کے قریب ہی ڈالا اور اپنی توپوں کا ایک مستحکم مورچہ تیار کیا، پاس ہی اینٹوں کے بھٹے تھے، جن پر توپوں کے لیے سرکوب بنایا، لڑائی شروع ہونے سے پہلے تینوں شہزادوں کی طرف سے عظیم الشان کے بارود خانے کو اڑا دینے کی سازش کی گئی، لیکن یہ ناکام رہی، عظیم الشان کی جانب سے توپوں کی مسلسل گولہ باری سے لڑائی شروع کی گئی، شہزادوں نے ہر گولہ کا جواب گولہ سے دیا، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، دوسرے دن شہزادوں کی فوجوں نے عظیم الشان کے لشکر پر ہولناک آتش بازی کی، موخر الذکر کی فوجیں راوی کی ریتیلی زمین میں خندق میں محصور ہو کر لڑ رہی تھیں، ریتیلی زمینوں پر گولے گرتے تو فوجوں میں بڑی سراسیمگی پھیل جاتی، تین دن اسی طرح لڑائی ہوتی رہی، بالآخر تینوں شہزادوں نے ایک ساتھ عظیم الشان کی فوج پر یلغار کی، لیکن عظیم الشان نے اپنی توپوں کی غیر معمولی آتش باری سے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا، چھ گھنٹے تک دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی رہی، بالآخر جہاندار شاہ شدت کی گولہ باری کرتا ہوا عظیم الشان کے لشکر کی خندق کے قریب پہنچ گیا، اب دست بہ دست جنگ ہونے لگی، یکایک ایک گولہ شہزادہ عظیم الشان کے ہاتھی کی سونڈ پر آ کر گرا، جس سے اس کی سونڈ کٹ کر علحدہ ہوگئی، وہ اس طرح زخمی ہو کر راوی میں کود پڑا، جس میں تیموری سلطنت کے ناکام دعویدار کے ساتھ غرقاب ہو گیا۔[۱]

تیموریوں کی حکومت کے آخری عہد تک توپیں استعمال ہوتی رہیں، حسن پور کی جنگ میں محمد شاہ کی توپوں نے سید عبداللہ کی فوجوں میں بڑی ہولناکی پیدا کی، خافی خان نے اس لڑائی کا بڑا موثر اور جاں گداز نقشہ منتخب اللباب میں کھینچا ہے، جو حسب ذیل ہے:[۲]

۱۔ خافی خان جلد دوم ص ۶۸۶، سیر المتاخرین جلد دوم ص ۸۲-۳۸۳ ۲۔ ایضاً ص ۹۲۸

"شاہی فوج نے اپنے آگے توپ خانہ کا مورچال رکھ کر حرکت کی، جنگی کوس اور کرنا کے زیر و بم سے لڑائی کی سرزمین میں ولولہ پیدا ہوا، چھوٹی بڑی ہوش ربا توپوں کی گرج سے زمین اور آسمان میں ایک بھچولہ آگیا، دوپہر کو دونوں مخالف فوجیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مقابلے کے لیے کھڑی ہوئیں، گولوں اور آتش فشاں بان کے وار سے غنیم نے اپنی فوج کی ہمت بڑھائی، شاہی فوج کی طرف سے بھی توپوں نے مسلسل ضربیں لگائیں، جس سے ان کے دلاوروں کا نشہ تیز ہوا اور غنیم کے لشکر میں ہیبت طاری ہونے لگی، غنیم کی فوجوں کی تعداد مور وملخ کی طرح تھی، ان میں تزلزل پیدا ہونے لگا، ان میں بعض پا بوسوار بالکل نئے تھے، بعض کو کم تنخواہوں پر ہر گوشہ سے لشکر میں بھرتی کر لیا گیا تھا، ان کی تعداد کثیر تھی، ان میں کوئی نظم ونسق بھی نہ تھا، وہ مختلف صفوں سے واقف بھی نہ تھے، اس لیے لازمی طور پر ان کے پاؤں اکھڑ گئے، ہر لمحہ اور ہر قدم پر توپ وتفنگ کے گولوں کی بارش ہوتی رہی، ہر ساعت ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن رہے تھے، سادات بارہہ نے کئی بار بڑی جرأت اور جواں مردی سے شاہی فوج پر حملے کیے، بالآخر نجم الدین علی خان بہادر نے سادات کے توپ خانے بڑھائے، اس نے پاس کے گاؤں کی ایک پہاڑی کے درختوں کی آڑ لی اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ شاہی توپ خانہ کی طرف یورش کی، شاہی فوج میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوگئی، ان میں سے بعض کے پاؤں اکھڑنے لگے، لیکن منصور جنگ اور ناصر جنگ مست ہاتھیوں کی طرح بارہہ کے شیروں کے مقابلہ کے لیے بڑھے اور ان کی بڑھتی ہوئی فوج کو روکا، نصرت یار خان، ثابت خان اور دوسرے بہادروں نے بھی ثابت قدم رہ کر جرات دکھائی، شاہی فوج نے

جواں مردی دکھا کر غنیم کے کچھ رہکلے پر قبضہ کر لیا، بارہہ نے درختوں کی آڑ میں، جو مورچال بنایا تھا، وہ بھی ان کے تصرف سے جاتا رہا، آفتاب غروب ہو رہا تھا، بدنصیب سید عبداللہ خان نے رات گزار کے لیے ایک خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کو پھر خیال ہوا کہ کہیں یہ خیمہ تیروں اور توپوں کا نشانہ نہ بن جائے، اس لیے خیمہ نصب نہیں کرایا، چودھویں رات تھی، چاندنی چھٹکی تھی، لیکن جب رات اندھیری ہوئی، تو ناصر جنگ نے ایک عجیب وغریب طریقہ سے توپ خانہ آگے بڑھایا، توپوں کے بیلوں کو توپوں کے ساتھ اس طرح باندھا کہ ان کا منہ پیچھے کی طرف رہا اور دم آگے رہی، اس طرح ایک متحرک مورچال بن گیا، پھر توپوں سے شدید ضربیں لگائی جانے لگیں، صف شکن اور فیل افگن توپوں نے بارہہ کی فوج میں جو ہولناکی پیدا کی، اس کو بیان کرنا مشکل ہے، ہر گولہ سے ایک ہاتھی اور اس کا سوار مارا جاتا، اس وحشت پر وحشت میں ایک قیامت بپا ہوگئی۔

غازی خان نامی توپ سے جو بھی گولہ آتا بارہہ کی صفوں کو درہم برہم کر دیتا، شاہ پسند نامی توپ سے آواز بلند ہوتی اور شعلے پیدا ہوتے، تو زمین اور آسمان میں سیماب کی طرح ایک بے قراری پیدا ہو جاتی۔ حیدر قلی خان چاندی اور سونے کے سکے توپ خانہ والوں کے اردگرد بکھیر رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کی نظروں میں اپنی کارگزاری سے اور بھی زیادہ محبوب ہو جائیں گے اور طرح طرح کے انعامات کے وعدے بھی کرتا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض بڑی توپیں، جن سے اور لڑائیوں کے موقع پر صرف ایک دو بار صدائیں بلند ہوتی تھیں، برابر کام کرتی رہیں اور ان سے اتنی صدائیں بلند ہوتی رہیں کہ بالآخر غنیم کو پسپا ہونا پڑا، میں نے تاریخ محمد قاسم فرشتہ میں دکن کے فرماں رواؤں کے سلسلہ میں

بڑھا تھا کہ توپ خانہ کے رواج کی ابتداء ۷۶۷ھ میں محمد شاہ بہمنی کے عہد میں محمد خان رومی کی نگرانی میں ہوئی اور یہ توپ خانہ بے جا نگر کے راجہ کے خلاف استعمال کیا گیا، لیکن اس وقت سے ابوالمظفر ناصر الدین محمد شاہ کے دور حکومت تک کسی جنگ میں توپوں نے اتنی ہولناکی پیدا نہیں کی جتنی کہ اس جنگ میں کی۔"[1]

محمد شاہ نے بھی اس لڑائی میں اپنے آباؤ اجداد کی شجاعت و بہادری کی یاد تازہ کی، شب و روز اپنے ہاتھی بادشاہ پسند نامی پر بیٹھ کر اپنے لشکریوں کی ہمت بڑھاتا رہا۔ اس کا ہاتھی غنیم کی توپوں کی زد میں کھڑا تھا، لیکن اس کو پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔[2]

نادر شاہ کے خلاف کرنال کی جنگ میں محمد شاہ کے پاس چھوٹی بڑی آٹھ ہزار توپیں تھیں ان میں سے بعض توپوں کو پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار بیل کھینچتے تھے، لیکن نادر شاہ کے فن جنگ کے مقابلہ میں یہ توپیں مفید ثابت نہیں ہوئیں، اس کے علاوہ نادر شاہ کے لشکریوں میں تیزی اور پھرتی ایسی غضب کی تھی کہ محمد شاہ کی بھاری بھاری توپوں کے حرکت کرنے سے پہلے ہی اس کے فوجی اپنی چھوٹی چھوٹی توپیں مثلاً جزائر اور زنبورک کو اونٹوں کی پیٹھ پر لاد کر آگے بڑھے اور اتنی پھرتی سے محمد شاہ کے لشکریوں کو گھیر گھیر کر مارنے لگے کہ سارے لشکریوں خصوصاً ہاتھیوں میں بڑی جلدی پراگندگی پھیل گئی۔

تیراندازی:

توپ تفنگ کے ساتھ تیروں کے ذریعہ سے بھی غنیم کے لشکر میں رخنہ اندازی اور سراسیمگی پیدا کی جاتی، بابر پانی پت کی جنگ کا حال خود لکھتا ہے۔

---

[1] خافی خان ص ۲۶-۹۲۴

[2] ایضاً ص ۹۲۸

''ہماری فوج میں غنیم کی آمد اور انتظام کی ترکیب دیکھ کر ذرا
کھلبلی مچی کہ ٹھہریں یا نہ ٹھہریں، مقابلہ کریں یا نہ کریں، موقع
کی بات کرنی چاہیے، ایسوں سے مقابلہ ہے، جو بے توقف
چلے آتے ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ تولقمہ والے غنیم کے دست
راست اور دستِ چپ سے پھر کر تیر مارنے شروع کریں اور
لڑائی میں مشغول ہوں۔ برانغار بھی جا پہونچے، تولقمہ والے
غنیم کے پیچھے سے پلٹ کر تیروں کا مینہ برسانے لگے۔ جرانغار
میں سے مہدی خواجہ سب سے آگے پہونچا۔ مہدی خواجہ کے
مقابلہ میں کچھ فوج ایک ہاتھی لیے ہوئے آئی۔ مہدی خواجہ کی
جماعت نے تیروں کی بھرمار سے اس فوج کا منہ پھیر دیا۔
جرانغار کی کمک کے لیے قول میں سے احمدی پراچی، تردی
بیگ، قوچ بیگ اور محمد علی خلیفہ بھیجے گئے، برانغار میں بھی لڑائی
شروع ہوگئی۔ محمدی کوکلتاش، شاہ منصور برلاس یونس علی اور
صدر اللہ کو حکم دیا کہ قول سے آگے بڑھ کر لڑائی شروع
کرو۔ استاد علی قلی بھی قول کے آگے بڑھ کر فیر کرنے
لگا۔ مصطفےٰ توپچی دستِ چپ سے خوب گولے مارنے لگا، تو
لقمہ والوں نے چاروں طرف سے غنیم کو گھیر لیا اور ہنگامۂ پیکار
گرم کر دیا''۔[۱]

پانی پت کی دوسری جنگ میں بھی اکبری فوج کے تیراندازوں نے ہیمو کے لشکر میں غیر

۱۔ بابر نامہ اردو ترجمہ، ص ۳۶۶

معمولی ہولناکی پیدا کر دی تھی، اس سلسلہ میں ابوالفضل کا بیان ہے:

"و گروہ گروہ فدائیانِ تیر انداز از اطراف و جوانب بر آمدہ داد کارزاری دادند"[1]

ان ہی تیر اندازوں کا ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں آ کر لگا اور اس کے زخمی ہوتے ہی ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل گیا۔

بیرم خان خانان جب ہندوستان کے تخت و تاج کا دعویدار ہو کر اکبر کے خلاف گوناچور (پنجاب) کے میدان میں صف آرا ہوا، تو دونوں لشکروں کے درمیان دھان کا ایک کھیت تھا، جس میں کیچڑ کی وجہ سے دلدل ہو گیا تھا، لڑائی شروع ہوئی، تو بیرم کے ہاتھی دلدل میں پھنس گئے۔ بیرم کو اپنے ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ ہاتھیوں کا دلدل میں پھنسنے دیکھ کر اکبر کے تیر اندازوں نے فائدہ اٹھایا اور ہاتھیوں پر شدت کے ساتھ تیروں کی بوچھار شروع کر دی۔ ایک تیر انداز نے ہاتھیوں کے سرگروہ کے فیل بان پر تاک کر ایک ایسا تیر لگایا کہ وہ لڑھک کر ہاتھی کی گردن میں آ کر اٹک گیا۔ بیرم خان نے اپنے ہاتھیوں کی اس طرح پسپائی دیکھی، تو دلدل سے بچ کر خشک راستے سے ان کی مدد کو پہنچنے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوج کے سردار آتکہ خان نے دوربینی سے کام لے کر بیرم خان کی کوشش کارگر ہونے نہیں دی۔[2]

۱۰۳۵ھ میں جہانگیر کشمیر سے کابل جا رہا تھا، تو جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، شاہی جلو کے اکثر امراء اور لشکر کے افراد جہلم کی دوسری طرف جا چکے تھے۔ جہانگیر نور جہاں کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا کہ مہابت خان نے اپنی راجپوت فوجوں کی مدد سے اس کو اپنا قیدی بنا لیا۔ نور جہاں اپنی دانشمندی اور فراست سے مہابت خان کی نظر بچا کر دریا کے دوسرے جانب شاہی فوج سے آ ملی، امراء کو غیرت دلائی، فوجوں سے برہمی ظاہر کی اور اپنے محبوب شوہر کو قید سے آزاد کرنے کے لیے خود آگے بڑھی۔ امراء میں سے فدائی خان مہابت خان

---

[1] اکبرنامہ جلد دوم ص ۴۰ [2] ایضاً

کی حرکتِ نازیبا سے آزردہ خاطر اور شہنشاہ ہند کی پسپائی پر بے حد خفیف اور شرمندہ ہوا اور وہ چند سواروں کے ساتھ اپنے آقا کی رہائی کے لیے روانہ ہوا۔ راجپوتوں نے دریا کے پل میں آگ لگا دی تھی۔ فدائی خان نے بڑی دلیری سے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا، اس کے پیچھے اس کے ہم راہی چلے، دریا میں بڑا تلاطم تھا، زیادہ سوار غرقاب ہو گئے اور صرف سات سوار فدائی خان کے پیچھے ساحل کی طرف بڑھے۔ راجپوت ساحل پر سے تیروں کی بارش کر رہے تھے، مگر فدائی خان سر بکف ہو کر کنارے پہنچا اور سات سواروں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ آور ہوا، مگر وہ جہانگیر کی قیام گاہ تک نہ پہنچ سکا، مجبوراً پھر دریا عبور کر کے دوسری طرف آیا۔ شاہی فوج نے پایاب راستہ سے دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی، نور جہاں شہریار کی بچی اور اس کی آتکہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر دریا میں داخل ہوئی، اس کی عماری پر، دو ترکش، دو کمان اور ایک بندوق تھی، شاہی فوج دریا میں تھوڑی دور آگے بڑھی تھی کہ اس میں کئی غار ملے، جس سے فوج کا تسلسل ٹوٹ گیا اور وہ علیحدہ علیحدہ ہو گئی۔ مہابت خان کے راجپوت سپاہیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ساحل پر ہاتھیوں کی قطار کھڑی کر دی اور تیروں کی بارش شروع کر دی، تفنگ کے گولے بھی برسانے لگے، لیکن پھر بھی نور جہاں کی جان نثار اور جان باز فوج ساحل پر پہونچ گئی اور تیر و سنان کی جنگ ہونے لگی، فریقین کے لشکریوں کے خون سے دریا لالہ زار ہو رہا تھا، اسی دار و گیر میں راجپوت تیر اندازوں کا ایک تیر نور جہاں کی عماری میں شہریار کی بچی کے بازو میں جا لگا، عماری رنگین ہو گئی، لیکن نور جہاں نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں کی، بچی کے بازو سے تیر نکال کر زخم کو باندھ دیا۔ راجپوتوں نے نور جہاں کے ہاتھی اور فیل بان کو تلوار اور برچھے سے زخمی کرنے کی کوشش کی، جس سے ہاتھی سراسیمہ ہو کر دریا کی دوسری طرف بھاگا، مگر کچھ فوجی ایسے تھے، جو ساحل پر پہنچ کر تیروں کی ایسی مسلسل بارش کرتے رہے کہ راجپوت ان کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکے، اسی یورش میں فدائی خان بندگانِ شاہی کی ایک مخلص جماعت کو لے کر جہانگیر کی قیام گاہ تک پہنچ گیا، سراپردہ کے اندر سوار اور پیادے بھرے ہوئے تھے، اس لیے دروازہ پر کھڑے ہو کر اس نے تیر اندازی شروع کر دی، اس کے اکثر تیر خلوت خانہ کے صحن میں جہانگیر کے پاس گر رہے تھے۔ مخلص خان جہانگیر کے سامنے آ کر کھڑا

ہو گیا اور اس نے اپنے کو تیر قضا کا سپر بنا لیا، مگر پھر بھی فدائی خان کی شجاعت اور جاں بازی جہانگیر کو ہرانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔[۱]

تیموری شہزادے یا شاہی فوج کے عہدیدار میدانِ جنگ میں ہاتھی کے ہودج میں ہوتے، تو تیر و کمان ہی سے لڑتے اور تیروں سے زخمی ہو کر میدانِ جنگ سے منہ موڑنا اپنی حمیت، غیرت اور شجاعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ سموگڑھ کی جنگ میں شاہزادہ مراد نے دارا کے تیراندازوں کا مقابلہ جس ہمت، دلیری اور پامردی سے کیا تھا، وہ تاریخ ہندوستان کا ایک عجیب و غریب کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس کی عماری پر چار ہزار ناوک تیر چلا رہے تھے۔ ہاتھی کا ہودج تیروں سے چھلنی ہو کر خارپشت (یعنی ساہی) بن گیا تھا، مگر اس عالم رستخیز میں بھی مراد ہمت و استقلال کا پہاڑ بنا ہوا دشمنوں کے تیروں کا مسلسل جواب دیتا رہا، اس کا فیل بان زخمی ہو کر نیچے گر پڑا، تو اس نے فوراً ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا دے۔ راجپوت مراد کی اس ہمت اور پامردی کو دیکھ کر آگے بڑھے۔ راجہ رام سنگھ راٹھور لڑتا ہوا مراد کے ہاتھی تک پہنچا، نفرت اور غرور میں بدمست ہو کر چلایا، تو دارا کے مقابلہ میں تخت و تاج کی ہوس رکھتا ہے، یہ کہہ کر اس نے مراد پر برچھے سے وار کیا، بہادر شہزادہ نے وار بچا کر راجہ کو ایسا تیر لگایا کہ وہ گھوڑے سے گر کر پھر نہ اٹھ سکا۔ راجپوت اپنے سوار کو اس طرح مرتے دیکھ کر دیوانہ وار مراد کے ہاتھی پر حملہ آور ہوئے، اُن کے حملہ سے مراد کے چہرہ پر تین کاری زخم لگے، مگر وہ جاں بازی اور سرفروشی کے ساتھ لڑتا گیا، اس کے تیروں سے اتنے راجپوت زخمی ہوئے کہ ہاتھی کے ارد گرد زمین ارغوانی اور زعفرانی ہو گئی۔ مراد کا یہ ہودج دودمان تیموری کی شجاعت، جاں بازی اور پامردی کی یادگار میں خزانہ عامرہ میں آخر آخر وقت تک محفوظ رہا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں سادات بارہہ نے تیموری خاندان کے افراد پر استیلاء اور غلبہ پانے کی کوشش کی، تو فرخ سیر کی بہن نے غصہ میں اُن سے کہا کہ ہم اُس خاندان کے افراد ہیں، جن کی شجاعت کی یادگار یہ مشبک ہودج اب تک محفوظ ہے۔[۲]

---

[۱] اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۶۔۲۷، مآثر الامرا جلد سوم ص ۱۵۔۱۳، خافی جلد اول ص ۶۸۔۳۶۶

[۲] خافی خان جلد دوم ص ۳۰

جاجو کی جنگ میں اعظم شاہ کا سارا جسم تیروں کے زخموں سے خون آلود ہو گیا تھا، لیکن اس نے اپنے زخموں کی پرواہ مطلق نہ کی اور بہادری سے لڑتا گیا، یہاں تک کہ ایک گولی کے نشانہ سے جاں بحق ہوا، اس کے لڑکے بیدار بخت کا بدن بھی تیروں سے چھلنی ہو گیا تھا، مگر اس نے اپنے ہاتھی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا، جب تک کہ ایک گولی سے اس کا کام بھی تمام نہ ہو گیا، اسی جنگ میں شہزادہ عظیم الشان اپنے باپ بہادر شاہ کی حمایت میں ہاتھی پر بیٹھ کر لڑ رہا تھا کہ اعظم شاہ کے دو فوجی سردار خان عالم اور منور خان جو صف شکنی کے لیے مشہور تھے، اپنے اپنے ہاتھیوں کو عظیم الشان کے ہاتھی کی طرف بڑھایا، خان عالم نے تین بار نیزے سے شہزادہ عظیم الشان پر حملہ کیا، لیکن شہزادہ وار بچاتا رہا اور موقع پا کر اپنے چلۂ کمان سے خان عالم پر تیر کا ایسا نشانہ لگایا کہ وہ تڑپتا ہوا ہودج میں رہ گیا۔ منور خان اپنے بھائی خان عالم کو ہلاک ہوتے دیکھ کر عظیم الشان پر نیزہ سے حملہ آور ہوا۔ شہزادہ نے اس نیزہ کے وار کو بھی رد کیا، پھر یکا یک توپ کے ایک گولہ سے منور خان بھی لقمۂ اجل ہو گیا۔[1]

دکن میں بہادر شاہ اور کام بخش میں جنگ جانشینی ہوئی، تو کام بخش تیروں سے ایسا زخمی ہوا کہ اس کے ہاتھی کا ہودج اس کے خون سے گل رنگ ہو گیا، مگر اس حالت میں بھی وہ خود غنیم پر تیر چلاتا رہا، اس کے دو ترکش خالی ہو گئے، تو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، اس کا لڑکا محی السنت بھی تیروں کی مسلسل بارش سے زخمی ہوا۔ ہاتھی پر فیل بان اور اس کے ہم راہی مارے گئے، وہ زخمی ہو کر خود نڈھال ہو گیا تھا، مگر اس نے میدان جنگ سے منہ موڑنا گوارا نہیں کیا۔ فیل بان کے مرنے پر ہاتھی خود ہانکنے لگا، لیکن گولیوں کے زخموں سے بے ہوش ہو گیا، تو ہاتھی اِدھر اُدھر بھٹک گیا۔[2]

۱۱۲۴ء میں فرخ سیر سادات بارہہ کی مدد سے جہاں دار شاہ کے خلاف تخت و تاج کا

---

1. خافی خان جلد دوم ص ۵۹۰-۵۹۱ وغیرہ
2. خافی خان جلد دوم ص ۶۲۵-۶۲۳

دعویدار ہوا، تو فریقین میں آگرہ کے پاس جنگ ہوئی، اس لڑائی میں فرخ سیر کی حمایت میں سید حسین علی خان اور سید عبداللہ خان دونوں بھائیوں نے شجاعت اور مردانگی کے اعلیٰ جوہر دکھائے، جب گھسان کی لڑائی ہونے لگی، تو سید حسین علی خان ہاتھی سے نیچے اُتر آیا اور ہاتھ میں تلوار لے کر پا پیادہ لڑنے لگا۔ غنیم کے تورانی تیر انداز چکر کاٹ کر سید حسین علی خان کے پیچھے آگئے اور اُس کو تیروں سے ایسا زخمی کیا کہ وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا، اس کا گرنا تھا کہ سادات بارہہ نے اس کو گھیر لیا اور اس کے جسم کو مزید گزند سے بچانے کی خاطر کٹ کٹ کر مرنے لگے۔ فوج کے دوسرے حصّہ میں سید عبداللہ خان بھی تورانی تیر اندازوں کی تاب نہ لاکر دوسری طرف رخ کرنا چاہتا تھا کہ یکا یک جہاں دار شاہ کی طرف سے عبدالغفار خان سید عبداللہ خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا اور چلۂ کمان سے ایک تیر نکال کر عبداللہ خان کو نشانہ بنایا، لیکن موخر الذکر نے نہایت سرعت سے اپنی کمان سے ایک تیر ایسا چلایا کہ عبدالغفار خان کا تیر اس سے ٹکرا کر بیچ ہی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سید عبداللہ خان نے فوراً ہی ایک دوسرا تیر مارا، جس سے عبدالغفار خان زخمی ہو کر دوسری طرف مڑ گیا، اسی اثناء میں سید عبداللہ خان کی مدد کو کمک پہنچ گئی، جس کی مدد سے سادات بارہہ نے جہاں دار شاہ کے ہاتھی پر تیروں کی اتنی بارش کی کہ ہاتھی خوف زدہ اور سراسیمہ ہو کر اپنے لشکریوں ہی کو پامال کرنے لگا، اس کے بعد جہاں دار شاہ کی فوج میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکی۔[1]

محمد شاہ نے سادات بارہہ کے خلاف حسن پور کے میدان میں جنگ کی، تو سید عبداللہ خان بڑی دلیری اور شجاعت سے لڑا، اس کے جسم پر آہنی لباس تھا، جس کی وجہ سے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا، اس کے ہودج پر تیروں کی مسلسل بوچھاریں آ رہی تھیں۔ محمد شاہ خود اس کو اپنے تیروں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ عبداللہ خان بہادری کے جوش میں شمشیر اور سپر سے پا پیادہ لڑنے کی خاطر ہاتھی سے نیچے اتر آیا، مگر اس نے ہاتھی کا ہودج چھوڑا، تو اس کے ہم راہی سمجھے کہ وہ مارا گیا اور ان کے پاؤں اُکھڑ گئے، مگر عبداللہ خان کے قدم پیچھے نہیں ہٹے، وہ جاں بازی سے لڑتا رہا کہ یکا یک کسی قادر تیر انداز نے تاک کر اس کی پیشانی پر ایک تیر لگایا، اس تیر کی زد سے وہ سنبھلنے نہ

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۷۰۳، مآثر الامراء جلد اول ص ۳۲۲ و جلد سوم ص ۱۳۳، ۱۳۲

پایا تھا کہ کسی نے بڑھ کر شمشیر سے اس کے ہاتھ پر ایک ضرب کاری لگائی، جس سے بے بس ہو کر وہ شاہی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔[1]

عام طور سے اوزبک[2] اور تورانی تیر اندازی میں بڑے مشاق اور ماہر سمجھے جاتے تھے۔ تورانیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے ہر تیر سے گھوڑے کی پیٹھ اس کے سوار سے خالی کرا دیتے تھے، تیروں کا حملہ روکنے میں افغانی امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ عظیم الشان اور جہاں دار شاہ کے درمیان جنگ جانشینی ہوئی، تو اول الذکر کے افغانی لشکریوں کے اردگرد تیروں کی جو بارش ہوئی، تو مؤرخوں کا بیان ہے کہ افغانی اس کو پھولوں کی بارش تصور کر رہے تھے۔

تیموری شہزادوں کو تیر اندازی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ جہانگیر کی تیر اندازی کی مہارت یہ تھی کہ وہ ایک ہی تیر سے بھیڑیئے کو ہلاک کر دیتا تھا۔ حالاں کہ مشہور ہے کہ بھیڑیئے میں بیس تیس تیر کھا کر بھی نہیں مرتے، وہ خود تزک میں لکھتا ہے:

> "ایک بھیڑیا میرے سامنے آیا۔ میں نے ایک تیر اس کے کان کے پاس مارا، جو قریب ایک بالشت کے پیوست ہو گیا، وہ بھیڑیا اس تیر سے گر کر ہلاک ہو گیا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ میرے سامنے سخت کمان والے جوانوں نے بھیڑیئے کو بیس تیر، تیس تیر مارے ہیں، مگر وہ نہ مرا، اپنے بارے میں کچھ لکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لیے ان واقعات کو لکھنے میں زبان قلم کو کوتاہ رکھتا ہوں"[3]

اورنگ زیب اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلطان محمد کو برابر تاکید کیا کرتا تھا کہ وہ روزانہ

---

1. مآثر الامراء جلد سوم ص ۱۳۶-۱۳۵ و سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۲، ۴۴۱
2. ۱۰۵۶ھ میں بلخ کی مہم میں شاہجہانی فوج پر بارہ ہزار اوزبک تیر انداز ایک ساتھ تیر چلا رہے تھے، جس سے قریب تھا کہ شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ جائیں، مگر پھر توپ اور تیغ دستان کی زد میں ان پر ایسی پڑی کہ اوزبکوں کی فتح ہزیمت سے بدل گئی۔ خافی خاں جلد ا، ص ۶۶۵۔
3. تزک جہانگیری، ص ۳۶۷

دو گھڑی تیر اندازی اور بندوق کی مشق میں صرف کیا کرے۔[1]

شمشیر زنی:

جب غنیم کی صفوں میں تفنگ، تیر یا کبھی ہاتھیوں کی یورش سے انتشار، خلل اور رخنہ پیدا ہو جاتا، تو سوار اپنی اپنی تلواروں کو سونت سونت کر مخالف فوجوں کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے، جس کو معاصر مورخین چپقلش مردانہ یا چقلش رستمانہ کہتے ہیں، اصلی شجاعت تلواروں ہی سے لڑنے میں سمجھی جاتی۔

قندھار کی دوسری جنگ میں ایرانی لشکریوں کے پاس آتشیں اسلحہ کی کثرت تھی، تو شاہجہانی فوج ان کو طعنہ دیتی تھی کہ وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کے سبب تلواروں سے لڑنے کے بجائے توپوں اور بندوقوں سے جنگ کرنے کے عادی ہیں۔ اعظم شاہ جاجو کی جنگ میں شریک ہوا، تو اپنی بہادری اور شجاعت کے نشہ میں مخمور ہو کر بار بار کہتا کہ توپ و تفنگ تو بازیچۂ اطفال ہیں، بہادروں کا ہتھیار تلوار ہے، جنگ کا فیصلہ تلوار ہی سے ہونا چاہیے۔

لڑائی جب زور و شور کی ہوتی اور بہادر لشکری دلیری اور سرفروشی کے نشہ سے سرشار ہو جاتے، تو وہ اپنے ہاتھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے اتر آتے، تا کہ یہ بے قابو ہو کر دھوکہ نہ دے سکیں، پھر زمین میں پاؤں جما کر کھڑے ہو جاتے، اپنی پوشاک کے دامن کو سمیٹ کر کمر سے باندھ لیتے اور ہاتھ میں تلوار لے کر لڑنا شروع کر دیتے، دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی پھرتی سے اپنی تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور اپنی جان کی فکر مطلق نہ کرتے، یہ شجاعت اور بہادری کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی۔

دھرمادت کی جنگ میں اورنگ زیب کے ہراول کی طرف راجپوت بڑھے، تو ذوالفقار خان نے محسوس کیا کہ بڑا نازک موقع آ گیا ہے اور دشمنوں کے یلغار کو روکنے کی ضرورت ہے، وہ اپنے گھوڑے سے اتر گیا اور ہاتھ میں تلوار لے کر تنہا راجپوتوں میں کود پڑا اور پھر قدم جما کر

---

1. رقعات عالمگیری معارف پریس، ص ۱۷۷

شجاعت اور جاں بازی کا پیکر بن کر لڑا، اس کا جسم متواتر زخموں سے خون آلود ہو گیا، لیکن اس کی سپاہیانہ غیرت اور حمیت نے دشمنوں سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔[۱]

اس واقعہ کو مورخوں نے بڑے آب و تاب سے لکھا ہے، چناں چہ منشی محمد کاظم بن محمد امین عالمگیر نامہ میں لکھتا ہے:۔

"ذوالفقارخان بآئین دلاوران ناموس جوئے ہندوستان که چون کار جنگ تنگ شود از اسپان پیاده شده دل بر ہلاک می نہندو اکثر اوقات به حسن ثبات قدم ورسوخ عزیمت غنیم راہزیمت می دہند، از اسپ فرود آمده با معدودی ہائے ہمت و جلادت بقصد نیل سر خروئی و شہادت در میدان دغا افشرد وداد شجاعت و دلیری داده دران آزمونگاه جوہر مردانگی گوئے ثبات و استقلال ازاقران و امثال برد، اگرچه گلِ زخمی از شاخسار مردی چید، لیکن به برکت توجہات والائے حضرت شاہنشاہی وپاس حسن اعتقاد و نیکو خواہی از آسیب ہلاک ایمن ماند"۔[۲]

بہادر شاہ کی وفات کے بعد عظیم الشان اور جہان شاہ میں جنگ ہوئی، تو عظیم الشان کی طرف ممتاز خان نے اسی شجاعت اور مردانگی کی مثال پیش کی، لڑائی تیز ہوئی، تو وہ لڑتا ہوا جہان شاہ کے پاس پہنچا اور گھوڑے سے کود کر پا پیادہ ہو گیا اور کبھی تیر چلاتا اور کبھی دشمنوں کو اپنی تلوار سے لقمۂ اجل بناتا، اسی بہادری سے وہ لڑتا گیا، یہاں تک کہ دشمنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

---

[۱] عالمگیر نامہ، ص ۶۷

[۲] ایضاً، ص ۶۷

سادات بارہہ لڑائی کی سرزمین میں قدم جما کر تلوار سے لڑنے میں بہت مشہور تھے۔ ۱۱۲۳ھ میں سید حسین علی خان فرخ سیر کی حمایت میں جہاں دار شاہ سے لڑا، تو میدان جنگ میں ہاتھی سے اتر کر اپنی شمشیر آبدار کے جوہر خوب دکھائے، ماثر الامراء میں ہے:۔

"حسین علی خان در روز جنگ که در حوالی مستقر الخلافه با جهاندار شاه اتفاق افتادبا تفاق حسن بیگ صف شکن خان که نائب صوبه داری اوڑیسه بودزین الدین خان پسر بهادرخان روہیله بمقابل ذوالفقار خان که توپ و ضرب زن بسیار پیش رو چیده ایستاده بود، اسپان تاخته به زنجیرهٔ توپخانه در آمد، چون عرصهٔ بر خود تنگ دید، باین ناموس پرستانِ ہند پیاده گشته به زخمهاے طاقت ربابزمین افتاده"[1]

قطب الملک سید عبداللہ خان نے بھی (سید حسن علی خان کا بھائی) حسن پور کی جنگ میں اسی جوہر شجاعت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، لڑائی شدت پر تھی کہ سید عبداللہ خان شمشیر اور سپر لے کر ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور جن دشمنوں نے اس کو گھیر رکھا تھا، اُن سے تنہا بڑی دیری کے ساتھ جنگ کرنے لگا، وہ سر سے پاؤں تک آہنی لباس میں ملبوس تھا، اس لیے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا، وہ دشمنوں کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارتا رہا، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک اس کی پیشانی پر ایک تیر لگا اور اس کے ساتھ کسی نے بڑھ کر تلوار سے اس کے ہاتھ کو زخمی کیا، جس کے بعد دشمنوں کے

---

[1] ماثر الامراء جلد اول ص ۳۲۳ خافی خان میں ہے:

"وبرحسین علی خان چنان عرصهٔ کارزار تنگ گردیده که بدستور بهادران تهور پیشهٔ ہندوستان خودرا از فیل انداخته باچندے از شجاعت پیشگان بارہه ترد د رستمانه نمود، بعد برداشتن زخمهائے کاری بے خبر گشته در معرکه افتاد" (جلد دوم ص ۷۰۳)

ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔[۱]

ایک سپاہی تلوار کی ضرب جس قدر زیادہ تیزی پھرتی اور سختی سے لگاتا، اسی قدر وہ بہادر اور آزمودہ کار سمجھا جاتا۔ اکبر اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب میں شیر کو ہلاک کر ڈالتا تھا۔[۲] عالمگیر نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں ایک مست ہاتھی کو اپنی تلوار سے زخمی کر کے اس کو پیچھے ہٹا دیا تھا۔[۳] بہادر سوار گھوم گھوم کر اپنی تلواروں سے ہاتھیوں پر حملہ کرتے اور ان کو زخمی کر کے پسپا کر دیتے، مست ہاتھی کے قریب آکر تلوار کی ضرب سے اس کی سونڈ کو اڑا دینا اور پاؤں کو بے کار کر دینا کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔[۴]

نیزہ بازی:

نیزہ (سنان یا گرز یا برچھا) عموماً راجپوتوں کا ہتھیار ہوتا، مگر مسلمان سپاہی اس ہتھیار سے بھی لڑ کر کبھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھلاتے تھے، مخالف سوار یورش کر کے گڈمڈ ہو جاتے، تو لمبے نیزوں اور برچھوں سے ان کی چپقلش روکی جاتی۔[۵] مخالف سواروں کے تیز رفتار گھوڑے بھی گرز اور سنان ہی سے زخمی کیے جاتے تھے۔ ہاتھیوں کو مجروح کرنے میں بھی یہ

۱۔ خافی خان جلد دوم ص ۹۳۲ و سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۱-۳۳۰

۲۔ اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۳۲ ۳۔ بادشاہ نامہ جلد اول ص ۹۰-۴۸۹

۴۔ مثال کے لیے دیکھو تزک جہاں گیری ص ۳-۱۰۲ و عمل صالح جلد دوم ص ۵۳۶

۵۔ اکبر اپنے سترہویں سال جلوس میں ابراہیم حسین مرزا کے خلاف گجرات میں جنگ کر رہا تھا، تو اس لڑائی کے سلسلہ میں ابوالفضل رقم طراز ہے۔

"و دریں وقتکہ (ہر طرف ہنگامۂ جان فشانی و جان ستانی گرم بود) سہ دلیرے بے آزرم از گروہ مخالف بصورت شہریار شیر دل تاختند یکے ازاں بد نہاداں پیش دستی نمودہ متوجہ راجہ بھگونت داس شدہ نیزہ حوالہ کرد، راجہ پیشتر ازاں پادر رکاب محکم کردہ ایستادہ می باشد کہ برچھ خود رابایا ور رسانند نیزۂ او خالی افتاد و راجہ برچھ خود را بوان مدبر آنچنان زد کہ حال و گرگون شدہ برگشت" (اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۵)

ہتھیار موثر ثابت ہوتے تھے[1] مخالف سوار ہاتھیوں کے قریب آ کر ہودج نشینوں پر نیزوں اور برچھوں ہی سے وار کرتے تھے[2]

کرنال کی جنگ میں نادر شاہ کے ایک نیشاپوری سوار نے اپنے نیزہ کے استعمال کا ایک عجیب و غریب نمونہ پیش کیا۔ شدت کی لڑائی جاری تھی کہ یہ نیشاپوری سوار محمد شاہ کے فوجی سردار سعادت خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا اور پھرتی سے اپنا نیزہ زمین میں نصب کیا۔ گھوڑے کی باگ نیزے سے باندھ دی اور سعادت خان کے ہاتھی کے ہودج کی جو ڈور کے نیچے لٹک رہی

۱؎ مثال کے لیے دیکھو فرشتہ جلد اول ص ۳۳۰ عبد الحمید لاہوری جلد اول ص ۹۵-۴۸۹، خافی خان جلد اول ص ۴۷۳

۲؎ مثلاً سموگڈہ کی جنگ میں مراد کے ہاتھی پر راجپوتوں کا حملہ ہوا تو خافی خان رقم طراز ہے:

"درین حال راجہ رام سنگھ کہ میانِ راجپوتان بہ تہوری شہرت تام داشت ، شہرۂ مروارید بیش قیمت برسربستہ رخت زعفرانی باہمہ ہمرہان بدعوئ پر دلی پوشیدہ جلو ریز خودرا بفیل سواری محمد مراد بخش رساند و بے باکانہ و گستاخانہ گفت تو مقابل داراشکوہ ہوس بادشاہی در سرداری و برچھے طرف محمد مراد بخش انداخت و برسہادت سہابت تمام بانگ زدہ گفت کہ فیل رانیشان آن بہادر شیر صولت حملۂ او را رونمودہ چنان تیر جان شان بہ پیشانی اور رساند کہ از خانۂ زین سرنگون ساخت ۔" (جلد دوم ص ۲۷)

۱۱۱۹ھ میں شاہ عالم اور اعظم شاہ کی جنگ جانشینی کے سلسلہ میں خافی خان لکھتا ہے:

"وہرلمحہ آتش پیکار شعار میگردید، تا آنکہ خان عالم و منور خان کہ از دلاوران صف شکن و کن گفتہ می شدند و درمبارزت بارہا علم شہرت برا فراشتہ بودند نعرہ زنان فیل جرأت مقابل فیل محمد عظیم بیش راندند و منور خان بے باکانہ مجلۂ رستمانہ نیزہ طرف شاہ زادہ انداخت محمد عظیم نیزہ او را رو کردہ ، آن نیزہ بر جلال خان قراول ردیف محمد عظیم رسید ، محمد عظیم تیر بجلۂ کمان در آورده چنان بہ سینۂ حریف رسانند کہ کاراوساختہ شد" (جلد دوم ص ۵۹۱)

تھی، اس کو پکڑ کر آناً فاناً ہودج پر چڑھ گیا، جس کے بعد محمد شاہ کا فوجی سردار بے بس تھا۔[1]

مندرجہ بالا اسلحہ کے علاوہ دست بدست لڑائی میں جمدھر، خنجر، کچھوا، گرز اور تیر بھی بھی بھی استعمال کیے جاتے تھے۔

جنگی حیلے:

جنگی حیلوں میں یہ حیلہ عام طور سے رائج تھا کہ لشکری میدانِ جنگ سے بظاہر بھاگتے نظر آتے اور جب ان کے دشمن ان کا تعاقب کرتے ہوئے کچھ دور آگے بڑھ جاتے، تو وہ پلٹ کر ان پر حملہ کر دیتے، اس قسم کے جنگی فریب کی مثالیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر جو فتح و کامرانی حاصل کی تھی، اس میں اس قسم کا جنگی حیلہ بھی معاون ہوا تھا۔[2]

سلطان فیروز شاہ تغلق پہلی بار شمس الدین کے خلاف لکھنوتی جنگ کرنے گیا، تو وہ یعنی سلطان فیروز لکھنوتی چھوڑ کر پیچھے چند میل ہٹ گیا۔ شمس الدین کی فوجوں نے خیال کیا کہ سلطان فیروز پسپا ہو کر مراجعت کر رہا ہے، اس لیے وہ قلعہ سے نکل کر باہر آ گئیں اور شاہی فوج کا پیچھا کرنے لگیں، لیکن اُن کو شکست کھانی پڑی۔[3]

شیر شاہ بنگال میں ابراہیم خان کے خلاف سورج گڑھ کے مقام پر صف آرا ہوا، تو اُس نے بھی اپنے غنیم کو جنگی فریب ہی سے شکست دی، لڑائی شروع ہونے سے پہلے اُس نے اپنے فوجی سرداروں کو حسب ذیل ہدایتیں دیں۔

> "غنیم کے لشکر میں بہت سے ہاتھی بہ کثرت بندوقیں اور کثیر التعداد پیدل سپاہی ہیں، لیکن ہم اُن سے اس طرح لڑیں کہ وہ اپنی اصلی صفوں کو برقرار نہ رکھ سکیں، اُن کے سواروں کو ہم بندوقچیوں سے علٰحدہ کر دیں اور اُن کے پیدل سپاہیوں اور سواروں کو اُن کے ہاتھیوں کے ساتھ گڈمڈ کر دیں، تاکہ ان کی فوج میں

---

1 سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۳، ماثر الامرا جلد اول ص ۳۶۵ ‏ 2 طبقات ناصری ص ۱۲۰

3 تاریخ فیروز شاہی از سراج عفیف ص ۱۱۴

ترتیب باقی نہ رہے، میرے ذہن میں ان بنگالیوں کو شکست دینے کی ایک ترکیب ہے، سامنے ایک پہاڑی ہے، اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد کو اس پہاڑی کے پیچھے لے جا کر کھڑی کردوں گا، لیکن تجربہ کار اور جری شہ سواروں کی ایک مختصر جماعت کو جارحانہ حملہ کرنے کے لیے تیار رکھوں گا۔ غنیم اسی طرح لڑیں گے، جس طرح کہ پہلے لڑ چکے ہیں، ان کو اپنی شکست کا مطلق خیال نہ ہوگا، میں اپنے منتخب دستہ کو آگے بڑھاؤں گا، وہ بنگال کی فوج پر تھوڑی دیر تک تیر چلا کر پیچھے ہٹتے نظر آئے گا۔ ابراہیم خان کو یقین ہو جائے گا کہ اس کی طاقت ور فوج سے پسپا ہو کر افغان بھاگ رہے ہیں۔ ابراہیم خان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور میری فوج پر اور بھی زیادہ دباؤ ڈالنے کے لیے اپنی توپوں اور پیدل سپاہیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ آئے گا، اس طرح اس کی صفوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جائے گی، اس کے بعد میں پہاڑی کے پیچھے سے اپنی فوج کو لے کر غنیم پر حملہ کردوں گا، اس طرح بنگالی سوار توپ خانے اور پیدل سپاہیوں کی مدد سے بالکل محروم ہو جائیں گے اور وہ افغان شہ سواروں کا مطلق مقابلہ نہ کر سکیں گے۔"

یہ ترکیب بڑی ہوشیاری اور ہوش مندی سے عمل میں لائی گئی اور وہی ہوا جس کی امید شیر خان کو تھی۔ ابراہیم کی فوج دامِ فریب میں پھنس گئی۔[1]

اکبر نے اپنے انیسویں سالِ جلوس میں داؤد کے خلاف اپنی فوج بنگال بھیجی، تو لڑائی کے درمیان شاہی فوج کے التمش اور قول کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان فوجوں کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر داؤد یہ سمجھا کہ یہ ان کا محض فریب ہے، اس لیے اس نے ان کا تعاقب نہیں کیا، اسی اثنا میں شاہی فوج کے داہنے بازو سے اُن کی مدد کے لیے کمک پہنچ گئی، پھر داؤد کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔[2]

تیموری بادشاہ اس قسم کے جنگی فریب کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از عباس خان شروانی، الیٹ جلد چہارم ص ۳۴۲-۳۴۱ [2] اکبر نامہ جلد سوم، ص ۱۳۶

لڑائیوں میں دجل و مکر کی مثالیں مطلق نہیں ملتی ہیں، کرنال کی جنگ میں نادر شاہ کے بعض دستے میدان جنگ سے بھاگتے نظر آئے، اس طرح کہ اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر الٹے منہ بیٹھ گئے اور تیر اور بندوق چلاتے ہوئے اپنے گھوڑوں کو بھگا لے گئے۔ محمد شاہ کے سپاہی ان کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ وہ ایک کمین گاہ کے پاس پہنچ گئے، جہاں سے نادر شاہ کے سینکڑوں بندوقچی نکل کر ان پر بُری طرح حملہ آور ہوئے۔

اس قسم کا جنگی فریب بڑی احتیاط اور ہوش مندی سے عمل میں لایا جاتا اور جب بھاگتی ہوئی فوج پلٹ کر لڑتی، تو اس کو دوگنی قوت، غیر معمولی تیزی اور پامردی سے لڑنا پڑتا۔

شب خون:

غنیم کے لشکر پر رات کے آخری حصہ میں اچانک حملہ کرنا بھی ایک جنگی فریب تھا۔ یہ پرانا طریقہ اس وقت سے جاری تھا، جب کہ انسانوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں، لیکن یہ اوچھے قسم کا وار سمجھا جاتا تھا، رات کے اس اچانک حملہ کو شب خون کہا جاتا تھا اور یہ حملہ اسی وقت کیا جاتا، جب کہ غنیم کی لشکر گاہ پوری طرح محفوظ نہیں ہوتی، حملہ آور کسی طرح غنیم کی لشکر گاہ میں چپکے سے گھس جاتے اور پھر انتشار و اختلال پیدا کر دیتے، شب خون سے محفوظ رہنے کے لیے فوج چار دستوں میں تقسیم کر دی جاتی۔

(۱) پیدل سپاہی تیر و کمان، تلوار، نیزے اور سپر سے مسلح ہو کر لشکر گاہ میں داخل ہونے کے راستے پر متعین کر دیئے جاتے۔

(۲) دائیں بازو یعنی میمن اور قلب کے سپاہی اپنی جگہ پر ہوتے اور اپنے یہاں کی روشنی گل کر دیتے، تاکہ وہ دشمنوں کو نظر نہ آئیں یا وہ کسی دوسری جگہ جا کر آگ روشن کر دیتے، غنیم گمراہ ہو کر وہاں پہنچ جاتے، تو پھر وہ نرغے میں پھنس جاتے۔

(۳) بائیں بازو یعنی میسار کے سپاہی صف باندھے تیار کھڑے رہتے، تاکہ غنیم کا حملہ ہو، تو اس کو وہ روک سکیں۔

(۴) فوج کا چوتھا دستہ لشکر گاہ کو چھوڑ کر دور کے راستے پر گشت کرتا رہتا، تاکہ غنیم کو کوئی مدد نہ پہنچ سکے، شب خون مارنے والے اپنے غنیم کے تمام راستوں کو مسدود کر دیتے اور چلاتے اور شور مچاتے کہ فلاں سردار مارا گیا اور فلاں آدمی قتل کر دیا گیا، اس طرح غنیم کے لشکر میں سراسیمگی اور بددلی پھیل جاتی ہے[1]

جو فوجیں نسبتہً کمزور ہوتیں، وہی شب خون مارتیں، سلاطین دہلی کی فوجیں اس قسم کے جنگی فریب پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن ان کے دشمنوں کے یہاں اس فریب کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً محمد تغلق نے قنوج کے پاس گنگا کے ساحل پر عین الملک کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اپنا پڑاؤ ڈالا، تو مؤخر الذکر نے پچھلی رات کو شاہی لشکر کے اگلے حصہ پر چھاپا مارا، لشکریوں میں بڑا شور مچ گیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے اور تلواروں سے لڑائی کی جائے، تمام لشکریوں نے تلواریں کھینچ لیں اور وہ دشمن کی طرف بڑھے، لڑائی کا ہنگامہ خوب گرم ہوا۔ عین الملک کا ارادہ بادشاہ کے خیمہ پر چھاپا مارنے کا تھا، لیکن اس کے رہبر نے اس کو دھوکا دیا اور وہ وزیر کی جگہ آ پڑا[2]

پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر نے لڑائی کی ابتداء میں ابراہیم لودی کے لشکر پر شب خون مارنے کی کوشش کی، لیکن اس کی تزک کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ شب خون بطیب خاطر نہیں مارا، بلکہ بعض ہندوستانی امراء کے اصرار پر اپنی فوج کو شب خون مارنے کی اجازت دی۔ پانی پت میں اس کی فوج سات آٹھ دن پڑی رہی، اس کے تھوڑے سپاہی ابراہیم لودی کے لشکریوں پر حملہ کرتے، لیکن یہ اپنی جگہ سے نہ ہلتے، اس لیے بعض ہندوستانی امراء نے شب خون مارنے کی صلاح دی، چناں چہ چار پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج شب خون مارنے کے لیے آگے بڑھی، لیکن وہ غنیم کے پاس اس وقت پہونچ سکی، جب صبح ہو رہی تھی، اس لیے وہ کچھ نہ کر سکی اور واپس ہو گئی[3]

شیر خان نے چونسا کی لڑائی میں محض حیلہ و مکر سے فتح پائی، وہ ہمایوں کے خلاف تین مہینے

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء

[2] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۸۱ [3] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۵

تک پڑاو ڈالے رہا، بالآخر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ شاہ آباد ضلع کے پہاڑا کی سرکشی کو فرو کرنے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ وہاں جائے گا، دو دن تک وہ اپنی فوج اسی طرف بڑھاتا گیا اور جب پچیس میل آگے بڑھ چکا، تو یکا یک ہمایوں کے لشکر گاہ کی طرف اپنی فوج کو موڑ دیا اور بڑی خاموشی اور تیزی سے ہمایوں کے سر پر آ دھمکا - مغل فوج بالکل غافل ہو کر رات کی ٹھنڈی ہواؤں میں مزے کی نیند سو رہی تھی - افغان یکا یک حملہ آور ہوئے، تو ہمایوں کے کسی لشکری کو نہ تو مسلح اور نہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونے کا موقع ملا - ہمایوں اپنی فوج کو جمع نہ کر سکا اور جب اس کے سپاہی سراسیمہ ہو کر منتشر ہو گئے، تو اس نے خود میدان جنگ چھوڑ دیا اور اس کو اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے سکے[1]

اکبر شب خون مارنے کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، وہ ابراہیم حسین مرزا کے خلاف احمد آباد اور بڑودہ کے درمیان دریائے مہندری کے پاس معرکہ آرا ہوا، تو اس کے پاس زیادہ لشکری نہ تھے - اس کے فوجی سردار جلال خان نے اس کو مشورہ دیا کہ جب تک ہمارے پاس کافی فوج نہ پہونچ جائے، دن میں لڑائی لڑنا مناسب نہیں، بلکہ رات کو شب خون مارنا چاہیے، لیکن اکبر نے شب خون مارنے کی صلاح کو پسند نہیں کیا، کیوں کہ شب خون جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے، "صورت تلبیس و تزویر داشت" اکبر نے اپنے لشکریوں کی ہمت بڑھائی اور ان سے کہا کہ دن کا کام رات پر انحصار رکھنا بالکل مناسب نہیں، ہم چستی اور ہوش مندی سے کام لے کر رزم آرا ہو جائیں، ہم میں سے ہر ایک شخص قوی دل ہو کر لڑے اور یہ طے کرلے کہ ہر شخص کم از کم ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اتارے گا[2]

احمد آباد کے حوالی میں محمد حسین مرزا کے خلاف اکبر صف آرا ہوا، تو اس لڑائی میں بھی اس کو شب خون مارنے کا مشورہ دیا گیا، لیکن اس مشورہ کو اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا، اس موقع پر ابوالفضل لکھتا ہے۔

---

1. تاریخ شیر شاہی از عباس خاں شیر وانی ایسٹ جلد چہارم ص ۵-۳۷۴

2. اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۲

شب خون بود پیشۂ بے دلاں   ازیں ننگ دارند خیل یلاں[1]

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح شب خون کو ''کار بیدلان اور شیوۂ فریب کاران'' کہا کرتا تھا۔[2]

مغل فوج شب خون تو نہیں مارتی تھی، لیکن شب خون مارنے والوں کی مدافعت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی، اس لیے وہ اپنی لشکرگاہ کو محفوظ کرنے کے لیے اس کی چاروں طرف یا تو کانٹے بچھا دیتی یا مٹی کی دیوار کھڑی کر دیتی یا خندقیں کھود دیتی۔[3]

''معارف'' یہ مقالہ انگریزی میں بھی اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) کے ۳۶ء و ۳۷ء کے مختلف نمبروں میں شائع ہوا ہے۔

مارچ تا جون ۱۹۵۰ء

---

[1] اکبرنامہ جلد سوم ص ۵۱

[2] تزک جہانگیری، ص ۱۹

[3] اکبرنامہ جلد ۳ ص ۳۲۵ و ۵۳۵، پادشاہ نامہ جلد سوم ص ۳۹

صلیبی جنگ اور اس کے اہم پہلو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں امپیکٹ آف اسلام اون یورپ (یورپ پر اسلام کے اثرات) کے عنوان سے ایک سیمینار ۲۸، ۲۹، ۳۰ راپریل ۱۹۸۰ء کو ہوا، یہ مقالہ اسی کے لیے لکھا گیا اور وہاں اس کے کچھ حصے پڑھے گئے، ترمیم واضافہ کے بعد اب یہ معارف میں شائع کیا جارہا ہے؟

صلیبی جنگ مسلمانوں کی تاریخ کا المناک واقعہ بھی ہے اور طرب ناک بھی، اس کی تفصیل درد انگیز بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی، اس کے ساتھ عبرت، بصیرت اور غیرت کی بھی داستان ہے۔ یہ یورپ اور ایشیا، مغرب اور مشرق مسلمانوں اور عیسائیوں، صلیب اور ہلال کی جنگ ہے، مگر اسی کے ساتھ اس میں اصلی جذبہ یہ کارفرما تھا کہ یورپ کے استیلاء اور غلبہ کا پرچم تو ایشیا بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں لہرائے، مگر یورپ کی سرزمین پر غیر یوروپین اور خصوصاً مسلمانوں کا قدم کسی لحاظ سے بھی جمنے نہ پائے، مگر مسلمان ان کی مرضی کی خلاف اپنی سپہ گری اور نبرد آزمائی سے یورپ پہونچے، تو انھوں نے اسپین میں آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ سسلی میں ان کی حکومت تقریباً دو سو برس تک رہی دولت عثمانیہ کے حکم ران تو ساڑھے چھ سو برس تک یورپ کی سرزمین میں اپنا پرچم لہراتے رہے، مگر یورپ کے عیسائیوں کی نظروں میں یہ سلطنتیں خار کی طرح کھٹکتی رہیں، انھوں نے اس وقت دم لیا جب سسلی اور اسپین سے مسلمانوں کو انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے دربدر کیا اور دولت عثمانیہ کی قوت پر ایک کاری ضرب لگا کر اس کو کمزور کردیا، حالاں کہ سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی، تو ولیم ڈریپر کے قول کے مطابق جنوبی اٹالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو بڑی قوت پہونچی (معرکہ مذہب وسائنس ص ۱۴۱) اسپین کو مالی اور علمی

ترقی دے کر بقول موسیو لیبان مسلمانوں نے یورپ کا سرتاج بنا دیا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۲۷، ۲۵۰) پھر دولت عثمانیہ کے عہد میں اس کے قلم رو کا تمدن یورپ کے کسی ملک سے کم نہیں رہا، سر ایڈوین پیرس ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے ترکی میں مدتوں رہ چکے تھے، انھوں نے اپنی کتاب "ترکی اور اس کے باشندے" میں لکھا کہ اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیز گار قوم بنا دیا ہے (بحوالۂ دولت عثمانیہ ج ۲، ص ۴۴۹ مطبوعہ دار المصنفین) ایک اور انگریز لوی گارنٹ نے لکھا کہ ترکی کے شہروں میں وہ اجڈ پن اور وحشیانہ پن بہت کم ملتا ہے، جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے (ایضاً ص ۴۵۱) مگر مسلمانوں کے ان تینوں متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کو یورپ کے عیسائیوں نے ختم کر کے دم لیا۔

یورپ کے عیسائیوں نے یورپ کی ان مسلم حکومتوں کو اس لیے برباد کیا کہ وہ یورپ میں ان کا اقتدار کسی طرح نہیں چاہتے تھے، اگر ان کا یہ جذبہ صحیح تھا، تو پھر ان کو ایشیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کا کوئی حق نہ تھا، مگر وہ جوع الارض میں ہمیشہ مبتلا رہے، اس لیے ان کو جب بھی موقع ملا، ایشیا اور افریقہ کی سرزمین کو اپنی سیاست کے چوگان کا میدان بنا لیا اور اس کے لیے ہر طرح کا جواز پیدا کر لیا۔

صلیبی جنگ کے اسباب:

صلیبی جنگ میں ان کے یہی جذبات کار فرما رہے، وہ اپنی ازلی عداوت کی وجہ سے مسلمانوں کا اقتدار اور اثر ہر جگہ سے ختم کر کے اپنے جوع الارض کی سیری چاہتے تھے، اس کے لیے بہت سے حیلے بہانے تراشے، مگر فوری وجہ یہ تھی کہ جب گیارہویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ میں سلجوقیوں نے بڑھ کر یونانی علاقے اور ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کر لی، تو یورپ والوں کو پسند نہ آیا۔ تاریخ یورپ کے مصنف اے۔ جی گرانٹ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یورپ کے مغربی اور مشرقی محاذوں پر مسلمانوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، سخت ضرورت تھی کہ ان کو پیچھے ہٹا دیا جائے (تاریخ یورپ، اردو ترجمہ ص ۵۳-۲۵۲) دی کریسیڈ کے مصنف ٹی۔ اے۔ ارچر اور سی۔ ایل کنگسفورڈ نے تو بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ اس صلیبی جنگ کی ضرورت اس لیے پڑی کہ عیسائیت کی

فلاح کے لیے ترکوں کو یورپ کی طرف بڑھنے سے روکا جائے۔ گیارہویں صدی میں وہ بہت تیزی کے ساتھ یورپ کی طرف بڑھ رہے تھے، پہلی صلیبی جنگ کی وجہ سے ان کا سیلاب پیچھے کی طرف مڑ گیا، جو قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اس کے بعد دو صدیوں تک اسلام کی ضرورت سے زیادہ سرگرمیاں بروئے کار آ گئیں ...... اگر محمد ثانی نے قسطنطنیہ کی جو تسخیر کی وہ دو تین صدی پہلے بھانپ لی جاتی، تو پھر ترک، بلقان اور ڈنیوب کے زیریں علاقے ہی تک محدود نہ رہتے، بلکہ یورپ کی طرف بڑھ کر دنیا کی تاریخ ہی بدل دیتے (ص ۵۰-۴۹۹)۔

یورپ کے جاگیردار اس جنگ میں اس امید کے ساتھ شریک ہوئے کہ اگر مشرق کے کسی علاقہ میں ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں، تو ان کو آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرنے کا موقع ملے گا، ان کی یہ امید کسی حد تک پوری ہوئی، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

یورپ کے تاجروں نے بھی اس جنگ کو زیادہ ہوا دی، خصوصاً اٹلی کے تاجر مشرق میں اپنی تجارتی منڈی قائم کرنے کی خاطر ایسے مشرقی سواحل چاہتے تھے، جہاں ان کے تجارتی بیڑے پہونچ کر مشرق کے بازاروں پر چھا جائیں، اس غرض سے ان تاجروں نے اپنے اپنے جہاز دے کر صلیبیوں کی فوجی نقل و حرکت میں بڑی مدد پہونچائی، آگے کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ یورپ کے تاجروں کو ان لڑائیوں سے بڑے فوائد پہونچے (نیز دیکھو کریسیڈاز ارچرا ینڈ لنکسفورڈ، ص ۳۰۱-۲۹۵، باب ۲۸)۔

یورپ کے کلیساؤں کی طرف سے اس جنگ کے لیے زیادہ جوش اور ہیجان پیدا کیا گیا، مگر اس میں بھی مذہبی جذبات کم، کلیسائی مفادات زیادہ مضمر تھے، اس زمانہ میں کلیسا کے اثرات بہت کم ہوتے جا رہے تھے، پوپ اربن دوم نے لوگوں کے مذہبی جذبات اس لیے ابھارے کہ اس کا مذہبی اقتدار قائم ہو، اربن دوم کا اختلاف نہ صرف یونان کے امپائر بلکہ اس زمانہ کے انگلستان، جرمنی اور فرانس کے حکمرانوں سے بہت بڑھ گیا تھا، اس نے اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو بحال کرنے کے لیے صلیبی جنگ کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا، کلیسا کو مسلمانوں سے فطری دشمنی ہے، اس لیے ان کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی، اس کو ہوا پیٹر نے دی، جس کے نام کا جزو

ہرمٹ ہو گیا تھا، بہانہ یہ تراشا گیا کہ سلجوقی حکومت بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے ساتھ براسلوک کرتی ہے۔ یورپ والوں کا طریقہ کار شروع سے یہ رہا ہے کہ جب کسی کو وہ موردِ الزام ٹھہرانا چاہتے ہیں، تو پہلے اس کے مظالم اور بدعنوانیوں کی طرح طرح کی داستانیں مشتہر کرتے ہیں، پھر حق و انصاف کے نام پر جارحانہ کارروائی شروع کر دیتے ہیں، یہی تاریخ بیت المقدس میں دہرائی گئی۔ پوپ اربن دوم نے فرانس میں ایک کانفرنس منعقد کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص اس وقت صلیب نہ اٹھائے گا، وہ میرا پیرو نہیں۔ اے جی گرانٹ نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یہ دیوانہ پن تھا کہ پوپ جو کچھ کہتا اس پر تمام یورپ آمنا وصدقنا کہتا (تاریخ یورپ اردو ترجمہ ص ۳۵۱)۔

پوپ نے ایک مجنونانہ جوش پیدا کر دیا، تو اس کے حکم کو خدا کی مرضی سمجھ کر سرخ کپڑے کی صلیبیں اپنے سینوں پر لگا کر ہر طرف کے عیسائی ایک مقدس جہاد کے لیے تیار ہو گئے، مگر اس میں شرکت کرنے والوں کی نوعیت یورپ ہی کے مورخوں کے بیانات سے ظاہر ہو گی۔

صلیبی فوج کی نوعیت:

ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ صلیبی سپاہیوں نے صلیب کا سہارا ضرور لیا، لیکن ان میں زیادہ تر ایسے تھے، جو اس جنگ کے ذریعہ سے اپنی خواہشوں کی جنت آباد کرنے کے خواہاں تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان امراء کی دولت حاصل کر کے وہ بہت متمول ہو جائیں گے، ان کو اچھی سے اچھی شراب اور حسین سے حسین عورتیں ملیں گی، اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے، جو جاگیرداری اور کلیسائی نظام سے آزردہ تھے، وہ کسان بھی تھے، جو اپنے زمینی آقاؤں کے مظالم سے نجات چاہتے تھے اور اپنی پسند کا ایک علاقہ چاہتے تھے، وہ راہب تھے، جو کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ مقروض لوگ بھی تھے، جو اپنے قرض خواہوں سے نجات چاہتے تھے، وہ مجرم بھی تھے، جو اپنے جرائم کی سزا سے نجات چاہتے تھے (ہسٹری آف ڈکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر، ج ۶، ص ۱۲۔۲۱۱)۔

فرانسیسی مورخ لیبان کا بیان ہے کہ اس میں وہی لوگ شریک ہوئے، جو مفلوک الحال

اور ممنوع الارث تھے یا جنھیں جنگ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی یا وہ راہب تھے، جو خانقاہی زندگی کی سختیوں سے عاجز آ گئے تھے (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۹۵)۔

ایچ۔ جی۔ ویلس نے صلیبی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ میں جوش شعلہ زن ضرور ہوا، لیکن اس میں ادنیٰ درجے کے جذبات بھی تھے، لاطینی گرجا کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ بازنطینی گرجا کو اپنے زیر نگیں کر لے، اٹلی میں کچھ لٹیرے ایسے بھی تھے، جو اٹلی کو لوٹ کر برباد کر رہے تھے، وہ اپنی لوٹ کے لیے کچھ اور حصول علاقے چاہتے تھے، غیر رواداری سلجوقیوں اور فاطمیوں نے وینس اور جنیوا کے تاجروں کے راستے روک رکھے تھے، جو بغداد اور مصر ہو کر یورپ میں تجارت کرتے تھے، وہ اپنی تجارت کے لیے قسطنطنیہ اور بحر اسود کے ذریعہ راستے چاہتے تھے، پھر شیلاٹ اور بوہیمیا کے علاقوں میں وبا پھوٹ پڑی تھی، وہاں بڑا معاشرتی اختلال تھا، اس لیے مشرق کی طرف لوگ اسی طرح چل کھڑے ہوئے، جس طرح آج کل سونے کی کان کی دریافت پر ہر قسم کے لوگ وہاں ٹوٹ پڑتے ہیں۔ (دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، ص ۴۱-۶۴۰)۔

فلپ کے ہٹی نے بھی اس جنگ کے شرکاء کا ذکر کر کے یہ لکھا ہے کہ صلیبی جنگ میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان سب میں خالص مذہبی جذبات نہ تھے، ان کے کچھ سردار اپنے لیے علاقے چاہتے تھے، پیسا، وینس اور جنیوا کے تاجروں کو اپنی تجارت سے دلچسپی تھی، رومان پسند، مضطرب اور مہم جو لوگوں کو مجتمع ہونے کا موقع مل گیا، مجرموں نے سوچا کہ اس کے ذریعے سے ان کی بخشائش ہو جائے گی۔ فرانس، لورین، اٹلی اور سسلی کے عوام اپنے اقتصادی اور معاشرتی حالات سے بددل تھے، صلیب کو اٹھانے میں ان کو راحت محسوس ہوئی، ان میں قربانی اور ایثار کا جذبہ نہ تھا (ہسٹری آف دی عربس، ص ۶۳۶)۔

ان صلیبی لڑائیوں کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات اور جزئیات کا مطالعہ کرنے کے بجائے یہ دیکھنا ہے کہ ان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا کردار کیسا رہا اور یورپ میں ان کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی اور تجارتی اثرات کیا پڑے؟

مسلمانوں کا سیاسی انتشار:

پہلے کہا جا چکا ہے کہ سلجوقیوں کے حدود سلطنت میں اضافہ ہو رہا تھا، تو یہ عیسائیوں کو گوارا

نہیں تھا، کیوں کہ یونانی خلافت بغداد کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود ایشیا میں اپنے اقتدار کے خواہاں ہو گئے تھے، دسویں صدی کے آخر تک بازنطینی حکومت کی سرحد جنوب میں اٹلی اور مشرق میں آرمینیا تک پہونچ گئی تھی، سلجوقی حکم راں طغرل نے اس توسیع پسندی کو روکا اور جب اس کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا، تو جارجیا، آرمینیا اور آذربائجان کو واپس لیا، جس کے بعد یونانی حکم راں رومانس (ارمانوس) نے دو لاکھ فوج کے ساتھ الپ ارسلان سے ایک خون ریز جنگ کی، مگر شکست کھا گیا اور گرفتار ہوا، اس نے زر فدیہ ادا کر کے اور اپنی دو لڑکیوں کی شادی الپ ارسلان کے لڑکوں سے کر کے رہائی حاصل کی، مگر یونانیوں نے خود اس کو تخت سے معزول کر دیا۔ الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک کی حکومت اپنے چچازاد بھائی سلیمان کو دے دی، جس نے نائس کو اپنا دارالسلطنت بنا کر مغرب میں اپنی سرحد بحر قلزم تک بڑھا دی اور بازنطینی حکم رانوں سے خراج بھی وصول کیا۔ الپ ارسلان کا جانشین ملک شاہ ہوا، جو نہ صرف سلجوقیوں بلکہ مسلمانوں کا بڑا ہی جلیل القدر حکم راں ہوا، اس کے وزیر نظام الملک کی وجہ سے اس کی حکومت کا وقار اور بھی بڑھا، مگر اس کی حکومت میں اسماعیلیوں یعنی حسن بن صباح کے فدائیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑا خلل رہا۔ نظام الملک کا قتل ان ہی کے ہاتھوں ہوا، یونانی حکم راں الیکزیس تو اپنی لڑکی کو ملک شاہ کی زوجیت میں دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا، مگر شادی سے پہلے اس کی وفات ہو گئی۔ ملک شاہ کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین کے لقب سے اس کا جانشین ہوا، مگر اس کا بھائی محمد بھی تخت کا دعویدار رہا، جس کے بعد خون ریز خانہ جنگی ہوئی، حسن بن صباح کے فدائیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر شمالی ایران، عراق اور شام پر قبضہ کر لیا اور سربرآوردہ مسلمانوں کو اپنے خنجروں سے یا تو ہلاک کیا یا ان کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، جس سے سلجوقیوں کی حکومت اور بھی کمزور ہو گئی، خلافت بغداد بھی اس وقت زیادہ جان دار نہ تھی، خلیفہ مقتدی کی وفات کے بعد مستظہر باللہ تخت نشین ہوا، تو اس وقت اس کی عمر کل سولہ سال کی تھی۔

پہلی صلیبی جنگ:

ان ہی حالات میں صلیبی مجاہد ایشیا پر ٹوٹ پڑے، مگر اس مقدس جنگ میں وہ کس طرح

آگے بڑھے، اس کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ پہلے ذکر آیا ہے کہ ان مقدس مجاہدوں میں کون کون شریک تھے۔ پہلا جتھا والٹرگویہ مفلس کی رہنمائی میں بڑھا، مگر یہ فوج جس علاقہ سے گذری، مفت رسد حاصل کرنے کی خاطر لوٹ مار کرتی گئی، یہاں تک کہ بلغاریہ کے خود عیسائیوں نے ان کا قتل عام کیا۔ پیٹر دی ہرمٹ اپنی نگرانی میں چالیس ہزار کا دوسرا جتھا لے کر روانہ ہوا، راستہ میں اس نے بلغاریہ کے قتل عام کا پورا بدلہ لیا، جس سے ہنگری اور بلغاریہ کے علاقے ویران ہو گئے، وہ ایشیائے کوچک پہونچے، تو انھوں نے دودھ پیتے بچوں کو قتل کیا اور ان کے جسم کے ٹکڑے ہوا میں بکھیرے، اس طرح وہ نائیس تک پہونچ گئے۔ تیسرے جتھے کی رہنمائی ایک جرمن راہب نے کی، جس کے ساتھ بقول گبن وحشیوں کی ایک بھیڑ تھی، وہ شراب پیتے، زنا کرتے اور لوٹتے مارتے آگے بڑھے، تو ہنگری اور بلغراد والوں نے ان کا اتنا قتل عام کیا کہ میدانوں میں ان کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آئیں۔ چوتھا جتھا انگلستان، فرانس اور لورین سے روانہ ہوا، اس میں بھی ویسے ہی قماش کے وحشی لوگ تھے، راستے میں ان کو مسلمان نہیں ملے، تو یہودیوں کو قتل کرنا شروع کیا، کولون میں ہزاروں یہودی تہ تیغ کیے گئے، اسی طرح دریائے رائین کے ساحل پر بھی ان یہودیوں کا قتل عام ہوا، اس جتھے کی بھی سرزنش ہنگری کی فوج نے اچھی طرح کی۔

اس کے دوسرے سال یورپ کے جاگیرداروں کا جتھا گوڈفری کی نگرانی میں روانہ ہوا، قسطنطنیہ اور نائیس ہوتا ہوا انطاکیہ پہونچا، تو اس کا سات مہینے تک محاصرہ کیا، کھانے پینے کی کمی ہوئی تو انسانوں کا گوشت کھانے لگے اور جب انطاکیہ پر ان کا تسلط ہوا، تو مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا، دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے گرد نمائش کے لیے لٹکا دیے گئے، وہاں کی قبریں کھود کر لاشوں کو باہر نکالا جاتا اور ان کے اعزہ کو دکھا کر ان کو رونے کے لیے چھوڑ دیا جاتا، سلجوقی خاندان کے نوجوان ان کے والدین کے سامنے مارے جاتے، انسانیت سوز حرکتیں جتنی ہو سکتی تھیں، وہ سب عمل میں آ گئیں۔ عورتوں کی عصمت ریزی اور شراب نوشی کے ذلت آمیز فواحش سب دیکھنے میں آئے۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ بابل کی وحشیانہ اور غیر انسانی حرکتیں ان مقدس مجاہدوں اور بیت المقدس کے نجات دہندوں کے ذریعہ سے عمل میں آئیں، ان لاطینی وحشیوں کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملی، مسجدیں بے رحمانہ طریقے پر مسمار کی گئیں، ہر

گھر مذبح خانہ بنا ہوا تھا، گلی کوچے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے (یہ واقعات ایڈورڈ گبن کی ہسٹری آف دی ڈیک لائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر، ص ۲۲۱۔۲۱۶ اور موسیو لیبان کی تمدن عرب ص ۹۶۔۲۹۵ سے لیے گئے ہیں)۔

انطاکیہ سے یہ فوج شمالی شام کی طرف بڑھ کر معرۃ النعمان پہونچی، جہاں تین دن تک قتل عام کرتی رہی۔ ایک لاکھ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کیے گیے، پھر یہ مقدس فوج بیت المقدس کی طرف بڑھی، اس جنگ کے آغاز میں بیت المقدس سلجوقیوں کے قبضہ میں تھا، مگر انطاکیہ پر صلیبیوں کا اقتدار قائم ہوا، تو بیت المقدس کو مصر کی فاطمی حکومت نے اپنے ماتحت کرلیا، مگر جب صلیبی فوج نے اس کا محاصرہ کیا، تو یہ حکومت بھی اس کو بچانہ سکی، جولائی ۱۰۹۹ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔

عیسائیوں کے مظالم:

بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا، جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ گبن لکھتا ہے کہ صلیب کے علم برداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی، تو یہودیوں کو ان کی عبادت گاہوں میں جلایا گیا (ص ۲۵۹) لیبان کا بیان ہے کہ یہ فوج بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کو قتل کرتی رہی، چاروں طرف لاشیں دکھائی دیتیں، اس قدر خون بہا کہ لاشیں تیرتی پھرتی تھیں، بیت المقدس کے مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور غیر مقلد عیسائیوں کا بھی قتل عام آٹھ روز تک ہوتا رہا، تقریباً ساٹھ ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ لیبان یہ بھی لکھتا ہے کہ ان صلیبیوں کا برتاؤ اس مقدس شہر کے باشندوں کے ساتھ اس سے مختلف رہا، جو حضرت عمرؓ نے کئی صدی پیشتر عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۹۹۔۲۹۸)۔

لیبان یہاں تک لکھ گیا ہے کہ صلیبیوں کی تمام فوج کشیوں میں ان کے افعال بالکل رذیل ترین اور احمق ترین وحشیوں کے سے تھے، ان کا برتاؤ شرکائے جنگ کے ساتھ، دشمنوں کے ساتھ، بے قصور رعایا کے ساتھ، سپاہیوں کے ساتھ یکساں تھا یعنی وہ سب کو بلا امتیاز لوٹتے اور قتل کرتے تھے، (تمدن عرب ص ۲۹۰) تاریخ یورپ کا مصنف اے۔ جی گرانٹ بیت المقدس پر

صلیبیوں کی فتح پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اسی لیے پوپ کو یہ تحریر بھیجی گئی کہ خدا ہمارے عجز و انکسار سے رام ہو گیا اور ہمارے عجز و الحاح کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالہ کر دیا...... اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے، ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا، تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے، تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا (تاریخ یورپ، اردو ترجمہ ص ۳۵۷) فلپ ہٹی نے بھی اس کی تصدیق یہ لکھ کر کی ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر بوڑھوں اور عورتوں کا قتل عام ہوا، لاشوں کے سر، ہاتھ اور پاؤں گلی کوچوں میں دکھائی دیتے (ص ۶۳۹)۔

صلیبیوں کے ان مظالم کی تفصیلات مل، ہیلم اور مچاؤ (میشو) کی تاریخوں میں بھی ملے گی، ان کے اقتباسات امیر علی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی سرسینز میں بکثرت دیے ہیں۔ (ص ۳۲۰-۳۳۰)

اس میں مچاؤ (میشو) کی تاریخ سے یہ اقتباس دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا قتل عام سڑکوں اور ان کے گھروں میں ہوا، بیت المقدس ان کے لیے پناہ کی جگہ نہیں رہی، کچھ تو فصیلوں پر سے کود کر موت سے بچے، کچھ محلوں، برجوں اور مسجدوں میں جا کر پناہ گزین ہوئے، مگر عیسائیوں نے ان کو وہاں بھی پناہ نہیں لینے دیا، عمر فاروقؓ کی مسجد صلیبیوں کے قبضہ میں تھی، یہاں مسلمانوں نے پناہ لے کر اس کی مدافعت کی، لیکن صلیبیوں نے یہاں بھی افسوس ناک مظالم ڈھائے، جس سے اس فتح کو ذلت حاصل ہوئی، پیادے اور سوار فراریوں کو ڈھونڈتے پھرتے، اس خوف ناک منظر میں موت کی چیخ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا، فاتحین لاشوں کو روندتے ہوئے فراریوں کا پیچھا کرتے۔ ریمنڈ نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کا بیان ہے کہ مسجد کے چھجے کے نیچے گھٹنوں تک خون بھرا ہوا تھا اور گھوڑوں کی لگام اس سے آلودہ ہو رہی تھی (ج ا، ص ۳۳۶)۔

عیسائی ریاستوں کے مظالم اور ان کی سفاکی:

اس صلیبی جنگ کا اعلیٰ مقصد اس سے بھی ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد

عیسائیوں کی تین ریاستیں اس علاقہ میں قائم ہو گئیں، بولون کا شہزادہ بالڈون الرہا کا حکم راں ہوا، انطاکیہ، بوہمند کے قبضہ میں آیا، بیت المقدس پر گوڈفری کی حکومت قائم ہوئی، اس کے جانشین اس کی سرحد میں اضافہ کرتے رہے (فلپ ہٹی ص ۳۹ ـ ۶۳۷) موسیو لیبان نے ژاک دی وتری کے بطریق کی تاریخ بیت المقدس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان صلیبی بادشاہوں کے جانشینوں میں سے شریر، بدوضع اور مبتذل نسل کا سلسلہ چلا اور اس ارض مقدس میں سوا بد اطوار، لامذہب، چور، زانی، باپ کے قاتل، دروغ حلفی کرنے والے، مسخروں، عیاش راہبوں اور بے حیا پادریوں کے سوا کوئی نہ تھا (تمدن عرب ص ۳۰۱)۔

بیت المقدس پر تصرف حاصل کرنے کے بعد چند سال کے اندر صلیبیوں نے فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا پر قبضہ کر لیا (صلاح الدین از اسٹینلی لین پول دو ترجمہ، ص ۲۰) مسلمانوں میں صلیبیوں کی خون ریزی اور غارت گری سے بے چینی ضرور پیدا ہوئی، لیکن وہ یورپ کی طرح کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے، اس وقت خلافت بغداد بے جان ہو رہی تھی۔ سلجوقی خانہ جنگی میں مبتلا تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے اپنی خوں ریزی اور سفا کی جاری رکھی۔ لین پول لکھتا ہے کہ صلیبیوں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی، انھوں نے اپنے سرداروں کو اشتعال دیا کہ وہ مسلمانوں پر بلا وجہ اور بلا سبب لوٹ مار کے حملے اور دھاوے شروع کر دیں، بارہویں صدی کے پہلے ربع کے حالات میں ایک مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ افرنجیوں کی تاخت و تاراج اور رہزنی روز بروز ترقی پکڑتی گئی، انھوں نے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہونچایا، جس کا بیان کرنا دشوار ہے، ان پر تباہی اور غارت گری انتہائی درجہ تک پہونچا دی، ان کی لوٹ مار کے یہ حملے دیار بکر میں آمد کے شہر تک پہونچے، انھوں نے قتل و غارت میں شیعہ یا سنی کسی کا لحاظ نہیں کیا، سب کو تہ تیغ کیا، عراق پہونچے، تو مسلمانوں کے پاس جس قدر چاندی یا قیمتی چیزیں تھیں، سب لوٹ لیں، حران اور رقہ پہونچ کر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ سخت بے حرمتی اور بے شرمی کے ظلم کیے، روزانہ انھیں موت کا جام پلاتے رہے، دمشق کو جس قدر راستے جاتے تھے، بند کر دیے اور صرف وہ راستہ کھلا رکھا، جو رحبہ اور صحرا میں سے جاتا تھا، افرنجی جہاں رہتے تھے، وہاں کے آس پاس کے شہروں سے ناجائز رقمیں محصول کہہ کر وصول کرتے تھے (صلاح الدین از لین پول اردو ترجمہ ص ۲۹ ـ ۲۸)۔

مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب:

صلیبیوں کو مسلمانوں پر فتح اس لیے حاصل ہوئی کہ مسلمانوں میں یکجہتی نہیں تھی۔ سلجوقی فرماں روا ملک شاہ کی وفات ہوئی، تو پھر اس خاندان کو نظام الملک جیسا کوئی وزیر نہیں ملا، جو ملک شاہ کے فرزندوں کی باہمی نزاع دور کر کے ان میں مصالحت کرا دیتا۔ سلجوقی شہزادے اپنے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے تاج وتخت کو تلف کر رہے تھے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے سردار سلجوقی بادشاہوں کے ماتحت کام کر چکے تھے، خود مختار بننے کی فکر میں تھے۔ بقول لین پول ہر شخص ٹوٹے ہوئے آج کے ٹکڑوں کے لیے دست وگریباں تھا، ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے رشک رکھتا تھا، کوئی صاحب ہمت ان میں ایسا نہ تھا، جو سب کا سردار اور ہادی بن کر دشمن سے لڑنے کو تیار ہو جاتا...... یہی وقت تھا، جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں، اگر اہل یورپ کا یہ حملہ ایک پشت پہلے ہوتا، تو سلجوقی ایسے نہ تھے کہ کوئی گھونسہ دکھاتا اور وہ چپ بیٹھے رہتے، یورپ کی یہی فوج کشی اگر ایک پشت بعد پیش آتی، تو عماد الدین اور نور الدین زنگی سلجوقیوں کے مقامات حکومت پر ایسے مستولی ہو چکے تھے کہ وہ یورپ کے ان حملہ آوروں کو دھکے دے کر سمندر میں غرق کر دیتے (صلاح الدین، ص ۳۱، اردو ترجمہ)۔

عماد الدین زنگی کے کارنامے:

مسلمان صلیبیوں سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے رہے، مگر صلیبی ان پر غالب رہے، مگر ان کا حوصلہ صلیبیوں کے خلاف موصل کے اتابکی خاندان کے فرماں رواؤں عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی کے زمانہ میں بڑھا، بارھویں صدی عیسوی میں سلجوقی سلطنت کا بڑا حصہ متفرق چھوٹے چھوٹے حکم رانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، تو ان ہی میں زنگی موصل کا فرماں روا ہو گیا، وہ ملک شاہ کے غلاموں میں سے ایک غلام کی اولاد میں سے تھا، شہزادوں کا اتالیق تھا، اس لیے اتابک (بمعنی اتالیق) اس کو خطاب ملا، اسی خاندان سے عماد الدین زنگی تھا، اس میں غیر معمولی قسم کی سیاسی ہوش مندی تھی، اس نے محسوس کیا کہ صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہیں، جس سے بڑا نقصان پہونچ رہا ہے، وہ اپنی

ریاست کو بچانے کی خاطر مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مل بھی جاتے تھے، اس لیے وہ بوازیج نصیبین، خابور اور حران جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے شام کی طرف بڑھا اور وہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں مثلاً بج، حضن، بزاعہ، حلب، حماۃ اور حمص وغیرہ تھیں، ان کو بھی ختم کیا، پھر فوج لے کر عیسائیوں کے قلعہ اثارب پر زبردست حملہ کیا اور اس پر فتح پائی اور یہاں کے مسلمانوں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی، مگر مسلمانوں کی بدقسمتی ساتھ دیتی رہی، موصل میں خانہ جنگی شروع ہوئی، تو عماد الدین دس سال تک اسی میں الجھا رہا، ۱۱۳۱ء میں وہ پھر شام کی طرف متوجہ ہوا، لیکن حمص کا مسلمان فرماں روا عیسائیوں سے مل گیا، تو عماد الدین زنگی دوسری طرف رخ کر کے قلعہ لبرین پر حملہ آور ہوا، تمام فرنگی فرماں رواؤں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، مگر ان کو شکست فاش ہوئی، لیکن پول لکھتا ہے کہ عماد الدین نے بعرین پر قبضہ کر کے اس کے فرماں روا کے ساتھ بڑا شریفانہ برتاؤ کیا اور اسے شاہی خلعت عطا کیا اور قلعہ میں جو افرنجی فوج تھی، وہ نہایت خستہ اور پست ہمت ہو چکی تھی، اس کو بھی جنگی اعزاز و احترام کے ساتھ قلعہ سے باہر جانے دیا (صلاح الدین ص ۴۷) مگر قسطنطنیہ کے فرماں روا نے بعرین کے قلعہ کو واپس لینے کے لیے اس کے خلاف فوج کشی کی، دمشق کے مسلمان فرماں روا نے بھی اس کا ساتھ دیا، مگر جب عماد الدین زنگی کا مقابلہ ہوا، تو شکست کھا گیا، ۱۱۴۰ء میں عماد الدین زنگی نے دمشق کا محاصرہ کیا، مگر اس کو چھوڑ کر بعلبک پر قابض ہو گیا، جو والی دمشق مجیر الدین آبق کے کار پرداز سلطنت معین الدین آنر کی جاگیر میں تھا، وہ عماد الدین سے اتنا برہم ہوا کہ عیسائیوں سے مل گیا اور یروشلم کی حکومت کا باج گذار بن گیا، تاکہ وہ شام کو عماد الدین سے آزاد کرائے، مگر عماد الدین زنگی کے حوصلے بلند رہے، اس نے بڑھ کر ۱۱۴۴ء میں عیسائیوں کے قلعہ الرہا پر قبضہ کر لیا، جہاں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے تھے، اس انتقامی جذبہ میں عماد الدین کی فوجوں نے عیسائیوں کا قتل عام کرنا شروع کیا، مگر جب عماد الدین خود شہر میں داخل ہوا، تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر متاثر ہوا، اس نے اپنی سپاہ کو غارت گری سے روکا اور حکم دیا کہ جن لوگوں کو انھوں نے گرفتار کیا ہے، انھیں رہا کر دیں، لڑکے لڑکیاں یا جس قدر زر و مال انھوں نے لوٹا ہے، ان سب پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیں، باشندگان شہر میں جو زندہ بچے تھے۔ انھیں آزاد کر کے ان کے گھروں میں ان کو آباد کیا، تاکہ شہر کی رونق اور خوش حالی میں کمی نہ ہو، شروع میں جو غارت گری ہوئی تھی، اس کی تلافی میں محبت

اور توجہ کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (صلاح الدین، ص ۵۲)۔

الرہا کی تسخیر فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، جو جاتا رہا، اس سے عیسائیوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، یورپ کی قوتیں پھر متحد ہوئیں، اس کے بعد دوسری جنگ صلیبی کا سلسلہ شروع ہوا، مگر اس سے پہلے عماد الدین زنگی کو اس کے غلاموں نے ذاتی عناد کی وجہ سے قتل کر دیا۔ لین پول لکھتا ہے کہ عماد الدین بے شک مر چکا تھا، لیکن وہ اپنی زندگی میں ایسے کام کر گیا تھا، جسے تمام نصرانی دنیا بھی مل کر نہ مٹا سکتی تھی (صلاح الدین ص ۵۴)۔

دوسری جنگ صلیبی اور نور الدین زنگی:

عماد الدین زنگی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نور الدین اپنی موت تک برابر صلیبیوں سے معرکہ آرائی کرتا رہا۔ الرہا پر عیسائیوں نے پھر قبضہ کر لیا تھا، مگر نور الدین نے ان سے لڑ کر پھر اس کو واپس لیا اور ان کے فوجی رہنما کورٹنی کے جوسلن کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا، اس کے بعد الرہا کے علاقے اور شمالی سرحدوں سے عیسائیوں کی قوت کا استیصال ہو گیا (صلاح الدین ص ۵۸) مگر فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم اور جرمنی کے فرماں روا کانراڈ نے مل کر کئی لاکھ فوجیں پھر شام بھیجیں، اس مرتبہ معین الدین آنر نے صلیبیوں کا ساتھ نہیں دیا، پھر تو بقول لین پول یورپ کے بہادر سورما اپنے اپنے وطن واپس گئے۔ (صلاح الدین ص ۵۰)

لیبان ایک قسیس ایجی تل کی تاریخ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس دوسری جنگ صلیبی میں بہت کم صلیبی ایسے تھے، جن کے خیالات خالص مذہبی ہوں، کسی قسم کا گناہ، ظلم، لوٹ اور افعال قبیحہ ایسے نہیں ہیں، جو ان کی طرف منسوب نہ کیے جاتے ہوں۔ سینٹ برنارڈ اس جنگ کی ناکامیابی کو ان ہی کے مظالم اور بے اعتدالیوں کی طرف منسوب کرتا ہے (تمدن عرب ص ۳۰۲) نور الدین کا سر اونچا ہوا، تو شام کے عیسائی جوسلن کا انتقام لینے کی خاطر نور الدین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، دلوک کی جنگ میں ان کو شکست فاش ہوئی، اس کے بعد دمشق پر بھی نور الدین کا قبضہ ہو گیا، وہاں کے عیسائیوں کو اختیار دیا گیا کہ ان میں سے جس کا دل جہاں چاہے جا سکتا ہے، شام میں نور الدین کی قوت بہت بڑھ گئی، تو اس نے صلیبیوں کے خلاف انطاکیہ پر بھی یورش کی،

جنھوں نے حارم کا نصف حصہ دے کر صلح کرلی۔

اس کے بعد صلیبیوں کی مدد کے لیے یورپ کی تازہ دم فوجیں پہونچیں، تو حمص وحماۃ وغیرہ کو تاراج کیا، بانیاس کے فرماں روا ہمفری کی سرکردگی میں نورالدین سے ایک سخت جنگ کی مگر ہمفری کو شکست ہوئی، جس سے صلیبیوں کو بڑا صدمہ پہونچا۔ انطاکیہ، طرابلس اور لوسکنان کے عیسائی فرماں روا گرفتار ہوگئے اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔(صلاح الدین، ص ۷۳)

اس اثناء میں بیت المقدس کے فرنگی فرماں روا کی فوجوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کو ناکامی ہوئی، تو انھوں نے مصریوں سے ساز باز کر کے مصر کے حکم ران اسدالدین کے خلاف فوج کشی کی، مگر نورالدین اسدالدین کی مدد کو پہونچ گیا اور اس نے اسدالدین سے مل کر صلیبیوں کو شکست دی، جس سے نہ صرف نورالدین کی فوج کا حوصلہ بڑھا، بلکہ اسدالدین کا اقتدار اسکندریہ تک بڑھ گیا، مگر جب مصری حکومت بے جان ہوئی، تو اس نے صلیبیوں سے صلح کرلی، جس کے بعد صلیبیوں نے مصر پر پورا قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اس پر قبضہ نہ کرسکے، بلکہ مصری حکومت نورالدین کے ماتحت ہوگئی۔ نورالدین کے ممتاز فوجی سردار نجم الدین ایوب کا بیٹا صلاح الدین منصب وزارت پر مامور ہوا، پھر تو وہاں کا رنگ ہی بدل گیا۔

صلاح الدین کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور نورالدین کے روز افزوں اثرات سے فرنگیوں میں بڑی تشویش پیدا ہوئی، شام کے قسیسوں اور راہبوں نے اعلان کیا کہ بیت المقدس خطرہ میں ہے، شام کے صلیبیوں نے مصر کو اپنے اثر میں لینے کے خیال سے ۱۱۶۹ء میں دمیاط کا محاصرہ کرلیا مگر صلاح الدین اور نورالدین کی ہوش مندی سے وہ ناکام واپس ہوئے، اس کے بعد مصری حکومت ختم ہوگئی، تو اس پر صلاح الدین کا قبضہ ہوگیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ المیہ بھی رہا ہے کہ جب طاقتور حکم ران ایک زمانہ میں ہوتے ہیں، تو مل کر اغیار سے لڑنے کے بجائے خود متصادم ہوجاتے ہیں، نورالدین اور صلاح الدین میں اختلاف پیدا ہونے ہی والا تھا کہ نورالدین کی وفات ہوگئی۔

نورالدین کی وفات کے بعد اتابکی خاندان کے دو ٹکڑے ہوگئے، موصل پر اس کے بھتیجے

سیف الدین غازی نے قبضہ کرلیا، بیت المقدس ابھی تک صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، شام میں ان کی کئی حکومتیں قائم تھیں، پورا یورپ ان کی مدد کر رہا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ مسلمان بھی متحد ہوتے، مگر موصل کا فرماں روا صلاح الدین کے خلاف صلیبیوں سے مل گیا اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ نور الدین کا کمسن لڑکا الصالح اسماعیل اپنے امراء کے ہاتھوں میں کھلونا تھا، جو اپنی خود غرضی میں صلاح الدین کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے، اس لیے وہ اس سے دور دور رہے۔

صلاح الدین ایوبی:

صلیبیوں کا مقابلہ اب صرف صلاح الدین ایوبی ہی کرسکتا تھا، مگر اسلام کے اس سرفروش غازی اور مجاہد میں نہیں، بلکہ اس کی ملت کی شومیٔ قسمت یہ تھی کہ خود اس کی ملت کے لوگ ان کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے اس کے مخالف رہے، موصل کا والی سیف الدین غازی اور دمشق کے امراء نے صلیبیوں سے مل کر اس کے خلاف سازش کی، لیکن اس کی ہوش مندی اور بیدار مغزی کام آئی، اس نے بڑھ کر دمشق، حمص، حماۃ، بعلبک پر اپنا اقتدار قائم کرلیا اور سیف الدین کو شکست دے کر بزاعہ اور عزاز وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ صلاح الدین کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوفزدہ ہو کر سسلی کے عیسائیوں نے دو سو جنگی بیڑے شام کی طرف روانہ کیے، مگر جب اسکندریہ پہونچے، تو صلاح الدین ایوبی کی مدد سے وہاں کے باشندوں نے ان سے لڑ کر ان کو واپس جانے پر مجبور کیا، صلاح الدین کو اس موقع پر ہر قسم کی دلجمعی چاہیے تھی، مگر خود مصر میں اس کے خلاف سازش جاری تھی اور باطنیوں نے تو اس پر قاتلانہ حملے کیے۔ سیف الدین کے جانشین عزالدین اور اس کے چچازاد بھائی عمادالدین نے اپنی مخالفت جاری رکھی، شام کے چھوٹے چھوٹے مسلم حکمراں بھی اس کے مخالف رہے، مگر صلاح الدین نے ان کا مقابلہ کامیابی سے کیا اور سنجار اور حلب جیسے علاقے پر قابض ہوگیا۔

شام کے عیسائی فرماں روا ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر فوج کشی کر کے مدینہ طیبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک اور مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ منہدم کرنا چاہا، مگر اس کو ناکامی ہوئی۔ (صلاح الدین ص ۱۵۲)

صلاح الدین اپنوں اور بیگانوں سے معرکہ آرائی کرنے سے مسلمانوں میں سپہ گری،

پامردی، سرفروشی اور دینی حمیت کی ایسی روح پھونک دی کہ جب وہ مختلف جنگی کارروائیوں کے بعد ۱۱۸۷ء میں حطین میں صلیبیوں کے خلاف صف آراء ہوا، تو اس نے اس جنگ میں فتح حاصل کر کے مسلمانوں کو ساری دنیا میں سرخرو کیا، صلیبیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے تمام بڑے بڑے امراء اور حکمراں گرفتار کر لیے گئے، اس جنگ کے بعد کچھ اور معرکے ہوتے رہے، اس طرح نوے سال کے بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس صلیبیوں سے واپس لے لیا۔

صلاح الدین ایوبی کی رواداری:

صلاح الدین جس فراخ دلانہ اور روادارانہ انداز میں بیت المقدس کے اندر داخل ہوا، اس کی تعریف تمام یورپین مورخوں نے کی ہے، گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے، اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیا، وہ ان سے بھاری رقمیں وصول کر سکتا تھا، لیکن تیس ہزار کی رقم لے کر اس نے سترہ ہزار قیدیوں کو آزاد کیا، دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یونہی چھوڑ دیا، اس طرح قیدیوں کی تعداد گھٹ کر گیارہ سے چودہ ہزار تک رہ گئی، جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی، تو اس نے اس سے نہ صرف انتہائی مہربانی سے باتیں کیں، بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی، جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں، وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا، مگر اس نے جس فیاضانہ رحم دلی کا ثبوت دیا، اس سے وہ نہ صرف تعریف و تحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے۔ (ج ۶، ص ۵۰۰-۴۷۹)۔

لین پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنی تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت ثابت نہیں کیا تھا، جیسا کہ اس موقع پر ثابت کیا۔ جب کہ یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز ذمہ دار افسروں نے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم کر رکھا تھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی زیادتی کو روکتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کوئی گزند نہیں پہونچا، شہر سے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ زرفدیہ

دینے والے شہر سے باہر کسی روک ٹوک کے بغیر چلے جائیں۔

لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض وقت ایسے غربا بھی آتے جو زر فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے، مسلمان سپاہی اور تاجر جو بکثرت شہر میں آ گئے تھے، وہ عیسائیوں کا مال اور اسباب خریدتے تھے تاکہ عیسائیوں کے پاس اتنا سرمایہ ہو جائے کہ وہ اپنی آزادی خرید سکیں، مسلمان فوجی سردار بھی اسی طرح کے نیک کام کرتے رہے، اسی کے ساتھ لین پول نے عیسائی مذہبی طبقے کا حال اس طرح لکھا ہے کہ تقدس مآب بطریق یروشلم اخلاق اور ایمان دونوں سے عاری تھا، اس نے گرجاؤں کی دولت سمیٹی، سونے کے پیالے اور آب مطہر رکھنے کا سامان حتیٰ کہ مہد مسیح پر جو طلائی ظروف رہتے تھے، اپنے قبضہ میں کیے، اس کے ساتھ اپنا ذاتی اندوختہ بھی بہت تھا، سب کو محفوظ کیا، یہ جمع کی ہوئی دولت اتنی تھی کہ اگر چاہتا تو بہت سے غریب عیسائیوں کا زر فدیہ دے کر آزاد کرا دیتا، جب مسلمان امراء نے سلطان سے کہا کہ اس بے ایمان اور نالائق پادری کو لوٹ کا اتنا مال لے جانے سے روکا جائے، تو سلطان صلاح الدین نے جواب دیا کہ میں جو قول دے چکا ہوں، اس سے پھر نہیں سکتا۔ لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ صلاح الدین کے بھائی العادل نے ایک ہزار غلام صلاح الدین سے مانگ کر آزاد کیے، پھر صلاح الدین نے خود شہر میں یہ منادی کرائی کہ تمام بوڑھے جن کے پاس زر فدیہ ادا کرنے کو نہیں، آزاد کیے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں۔ لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ جن عیسائی عورتوں کے شوہر مر چکے تھے، انھیں صلاح الدین نے بلا کر خزانے سے بافراط روپے دیے، جیسا کچھ ان کا مرتبہ اور درجہ تھا، اس کے مطابق کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیا اور وہ جہاں جہاں گئیں، اس عزت اور فیاضی کا چرچا کیا۔

اس کے بعد لین پول لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین کے ان احسانات پر ہم غور کرتے ہیں، تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں، جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں، جب گوڈفرے اور ٹنکرد یروشلم کے کوچہ و بازار سے گذرے، تو وہاں مردے پڑے اور جاں بلب زخمی لوٹتے تھے، ان بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، ان کو زندہ جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا اور جہاں ان کے اسی قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا

تھا اور اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگا تھا، جہاں رحم اور محبت کا وعظ جناب مسیح نے سنایا تھا اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے وہ لوگ ہیں، جو رحم کرتے ہیں۔ (ص ۳۰۵۔ ۳۰۴) لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ سالزبری کے اسقف ہیوبرٹ والٹر نے صلاح الدین سے درخواست کی کہ تربت مسیح، بیت اللحم اور ناصرہ کی دینی خدمت میں شامی عیسائیوں کے ساتھ دو رومن کیتھولک پادریوں کو بھی شرکت کی اجازت دی جائے، تو اس نے منظور کیا اور تینوں مقامات پر رومن کیتھولک پادری مقرر کیے گئے (ص ۳۱۴) لین پول نے ایک واقعہ یہ بھی لکھا ہے کہ جب صلاح الدین کرک کے محاصرہ میں تھا، تو یروشلم کے فرماں روا کی سوتیلی بہن ازابیلا کی شادی کی تقریب میں وہاں جشن منایا جارہا تھا، صلاح الدین نے اپنے اس دشمن کے پاس شادی کا کھانا بھیجا اور فوج کو حکم دیا کہ جس برج میں دولھا دلھن ہیں، ان پر تیر نہ پھینکے جائیں (ص ۳۰۵۔۳۰۴)۔

تیسری صلیبی جنگ:

صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا، تو یورپ میں غیظ و غضب کی لہر پھر اٹھی۔ جرمنی کا قیصر فریڈرک، انگلستان کا رچرڈ شیر دل، فرانس کا فلپ دوم، صقلیہ، آسٹریا اور برگنڈی وغیرہ کے آہن پوش فوجی سردار شام کی طرف امنڈ پڑے اور یہ تیسری صلیبی جنگ پانچ برس تک صلاح الدین کے خلاف ہوتی رہی، مگر صلاح الدین ہی ان پر بھاری رہا، جب صلح ہوئی، تو بیت المقدس اور دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، صرف ساحل عکہ پر ایک مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی۔

اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اے۔ جے گرانٹ نے لکھا ہے کہ تیسری جنگ میں شہنشاہ فریڈرک باربروسا شیر دل انگلستان اور فلپ دوم شاہ فرانس پوپ کے دباؤ سے اس جنگ میں ضرور شریک ہوئے، مگر ان میں نہ تو مذہب کا اثر تھا اور نہ مقاصد میں یکجہتی تھی، اسی لیے اس جنگ میں ان کو ناکامی ہوئی، شہنشاہ فریڈرک تو ایشیائے کوچک کی ایک ندی میں ڈوب گیا۔ شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اثنائے راہ میں لڑتے رہے اور جب وہ شام پہونچے، تو وہاں بھی ان کی یہی حالت رہی، وہاں ان کو چند فتوحات ضرور حاصل ہوئیں، مگر فلپ فرانس واپس جانا چاہتا تھا، کیوں کہ اس کو

صلاح الدین کی طرف سے اتنا خطرہ نہ تھا، جتنا کہ رچرڈ کی روز افزوں قوت سے تھا، رچرڈ کچھ دن اور رہا اور اپنی شجاعت اور کمال سپہ گری کا جوہر دکھایا، مگر انسانیت میں وہ صلاح الدین کے معیار سے بہت گرا ہوا تھا، عکہ میں اس نے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا، برخلاف اس کے صلاح الدین نے یروشلم میں اسیران جنگ کو آزاد کر دیا۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد گرانٹ لکھتا ہے کہ رچرڈ کے حالات زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیت کی تحریک محض لغو تھی، صلیبیوں پر مذہب کا اثر کم تھا، ان کے مذموم افعال سے کلیسا کی نیک نامی پر بھی حرف آتا تھا۔ (تاریخ یورپ ص ۶۰۔۳۵۹)۔

گرانٹ رچرڈ شیر دل سے شاید اس لیے خفا ہے کہ وہ صلاح الدین کے بھائی عادل سے اپنی بہن کی شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا، گو یہ رشتہ قائم نہ ہو سکا (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر از ایڈورڈ گبن ج ۶ ص ۸: ۵)۔

آرچر اور کنگسفورڈ نے بھی لکھا ہے کہ تیسری جنگ صلیبی میں صلیبیوں کو شکست محض ان کی باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ہوئی۔ فرانسیسی برابر اس فکر میں رہے کہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ رچرڈ برابر سوچتا تھا کہ فلپ اگر فرانس واپس چلا جائے، تو زیادہ اچھا ہے، اس جنگ کے بعد مغرب سے اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بہادر فوجی سردار پھر کبھی نہیں آئے، لیکن باہمی اختلاف و رقابت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے تیسری جنگ میں تباہی آئی اور یہی چیزیں یروشلم کی لاطینی حکومت کے ساتھ برابر لگی رہیں۔ (کریسیڈ ص ۳۴۸)

چوتھی صلیبی جنگ:

گرانٹ لکھتا ہے کہ دوسری تیسری صلیبی لڑائیوں سے کوئی اہم نتائج مرتب نہیں ہوئے مگر چوتھی جنگ کو یورپ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے، یہ اہمیت مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ اس جنگ سے یورپ کی صورت حال بدل گئی۔ پوپ انوسینٹ سوم نے یورپ کو پھر صلیبی جنگ کے لیے ابھارا، تو اس میں زیادہ تر فرانس کے امراء شریک ہوئے اور جب وہ یہ مقدس فوج لے کر وینس پہونچے، تا کہ وہاں کے جہازوں پر سوار ہو کر شام کے ساحل پر اتریں، تو

وینس کے تاجروں کو اس مقدس جنگ سے زیادہ اپنی تجارت کی فکر ہوئی، انھوں نے ان صلیبی لڑائیوں میں مشرق کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا اور قسطنطنیہ تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی، مگر اس تجارت میں ان کا رقیب زارا کا شہر تھا، جو ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع تھا، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں کو جہاز اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ زارا کو فتح کر کے وینس کے ماتحت کر دیں۔ صلیبی اس کے لیے تیار ہو گئے، زارا فتح کر لیا گیا، تو پوپ کو دکھ ہوا کہ صلیبی خود ایک مسیحی شہر پر حملہ آور ہوئے، مگر صلیبیوں نے پوپ کی مرضی کے خلاف یہ اقدام کر ہی لیا اور جب وہ شام کی طرف بڑھے، تو قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا الیگزلس اپنے چچا کے خلاف صلیبیوں سے فوجی امداد کا طلب گار ہوا، اس نے وہ وینس کے تاجروں کو ہر قسم کی مراعات دیے، صلیبیوں کو خاطر خواہ معاوضہ عطا کرنے اور مشرقی اور مغربی کلیساؤں کو متحد کر دینے کا سبز باغ دکھایا۔ گرانٹ لکھتا ہے کہ صلیبیوں کو مذہب کا پاس کب تھا، وہ سپاہی جنھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اٹھایا تھا اور صلیب کا نشان لگائے ہوئے، پھر ایک دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہو گئے اور اس شہر کو اس طرح لوٹا کہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے۔ کوئی شہر اس بری طرح سے نہیں لوٹا گیا، صلیبیوں کی جماعت ہی میں سے فلانڈرس کا رئیس بالڈون یہاں کا شہنشاہ بنایا گیا، وینس کے تاجروں نے ہر قسم کی رعایتیں حاصل کیں۔ گرانٹ لکھتا ہے کہ یہاں کی شہنشاہی اس طرح کمزور ہو گئی کہ ۱۴۵۳ء میں یہ ترکوں کے قبضہ میں ہو گیا (تاریخ یورپ، ص ۳۶۲-۳۶۱)۔

صلیبیوں کی تھوڑی سی فوج فلسطین پہونچی، العادل سے برسرِ پیکار ہوئی، وہ اس نے تھوڑی رعایتیں دیں، مگر ان کا فوجی سردار ریجی نالڈ انطاکیہ کے حکم راں بوہمنڈ سے مل کر ہی جنگ کرنے کی خاطر اس کی طرف روانہ ہوا، تو اس کی فوج غنیموں سے گھر کر بالکل تباہ ہو گئی۔ (کریڈ از ارچرا اینڈ کنگسفورڈ، ص ۳۷۱)

گرانٹ لکھتا ہے کہ اس اندوہناک مہم کے بعد صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور چوتھی جنگ کے بعد ان جنگوں کی صحیح تعداد معلوم کرنی بھی دشوار ہے کیوں کہ پاپایانِ روم نے یہ عادت اختیار کر لی تھی کہ جس جنگ سے انھیں سروکار ہوتا۔ اسے وہ صلیبی قرار دیتے تھے، ان کے کہنے پر جو فوجی مہمیں روانہ کی گئیں۔ وہ بڑے پیمانہ پر نہ تھیں۔ فرانسیسی مورخ لیبان اور انگریز مورخ گرانٹ نے بقیہ اور لڑائیوں کا حال مختصر طریقہ پر اس طرح لکھا ہے۔

پانچویں صلیبی جنگ:

بیت المقدس پر چڑھائی کرنے کے عوض میں اکثر صلیبی لوٹ کی امید میں مصر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن زیادہ دور نہ جاسکے، شکست کھا کر پلٹ آئے (تمدن عرب ص ۳۰۴)۔

چھٹی صلیبی جنگ:

جرمنی اور نیپلز کا شہنشاہ فریڈرک دوم پوپ کے ایماء سے ۱۲۲۹ء میں یروشلم گیا، چند روز کے بعد واپس گیا، تو پوپ نے اسے کلیسا سے خارج کردیا، لیکن وہ دوسری مرتبہ پھر بیت المقدس پہونچا، اس کے تعلقات مسلمانوں سے خوش گوار تھے، اس لیے اس نے مصر کے سلطان سے فلسطین میں مسیحی زائروں کے داخل ہونے کی اجازت حاصل کرلی اور ایک دفاعی معاہدہ بھی کرلیا، یہ اس کی بڑی کامیابی تھی، مگر پوپ اس سے خوش نہیں ہوا، اس کی ریاست نیپلز کو بھی کلیسا سے خارج کردیا (تاریخ یورپ ص ۲۶۳)۔

ساتویں صلیبی جنگ:

۱۲۴۴ء میں سلطان مصر نے بیت المقدس پر اپنا مکمل قبضہ کرکے تمام مسیحی فوجوں کو شام سے نکال دیا، تو فرانس کا سینٹ لوئی پچاس ہزار فوج کے ساتھ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا، اس نے دمیاط فتح کرکے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی، مگر منصورہ میں مسلمانوں نے اس کو بری طرح شکست دی، مسیحی فوج کی ایک قلیل تعداد بچ کر ساحل کی طرف روانہ ہوئی، مگر بیماری اور دشمن کے حملوں سے تنگ آکر سینٹ لوئی نے ہتھیار ڈال دیے اور قید ہوگیا، فدیہ دے کر رہا ہوا...... (تمدن عرب ص ۳۰۵)۔

آٹھویں صلیبی جنگ:

سینٹ لوئی ہمت نہ ہارا، سوا سال کے بعد اس نے ایک نئی جنگ صلیبی کا ارادہ کیا، جولائی ۱۲۷۰ء میں تیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوار لے کر ایک مارت سے روانہ ہوا، تیونس کی طرف اس امید موہوم کے ساتھ بڑھا کہ وہاں کے حاکم کو عیسائی بنائے، مگر اس شہر کے محاصرہ میں طاعون

کے مرض سے مر گیا اور اس کی فوج بھی اس وبا کی نذر ہوگئی، اس کے بعد حقیقی صلیبی جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ گرانٹ لکھتا ہے کہ اس کے بعد صلیبی جنگ کی متعدد تحریکیں ہوئیں، مگر ان کا اطلاق صلیبی جنگ پر نہیں ہوتا، یورپ میں اس صدا پر کوئی لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوا، دنیاوی لڑائیوں کو جو حرص و ہوا اور انتقام پر مبنی تھیں، مذہبی قرار دینے سے کلیسا کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا (تاریخ یورپ ص ۳۶۵)

ہم نے اوپر صلیبی لڑائیوں کی کہانی زیادہ تر یوروپی مصنفوں کی زبانی بیان کی ہے، تاکہ ایک مسلمان اہل قلم کے جذبات میں جانبدارانہ رنگ نہ پیدا ہونے پائے، آئندہ اب ان لڑائیوں کے مختلف قسم کے اثرات کو بھی ان ہی یوروپی مصنفوں کی تحریروں کی روشنی میں دکھاتا ہے۔

سیاسی اثرات:

صلیبی لڑائیوں سے یورپ پر مختلف قسم کے سیاسی اثرات پڑے۔ فرانس تو براہ راست متاثر ہوا، وہاں کے بڑے بڑے جاگیرداران لڑائیوں میں شریک ہوئے، تو یا تو وہ وہاں مارے گئے یا وہ ہیں چھوٹے چھوٹے علاقے لے کر آباد ہوگئے، وہ فرانس سے گئے، تو اپنی جاگیروں کے مالکانہ حقوق شہروں کے ہاتھ فروخت کر کے گئے، جن کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں بن گئیں، مگر وہ بادشاہ کے ماتحت رہیں، پھر ان شہروں میں مجالس بلدیہ قائم ہوگئیں، تو یہ شہر ان جاگیرداروں کے دائرہ اثر سے باہر ہوگئے اور وہ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوگئے، جس سے بادشاہ کا تسلط روز بروز ان پر بڑھتا گیا اور جاگیرداری نظام رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوگیا، یہی صورت حال اٹلی میں پیدا ہوئی، مگر انگلستان میں اس سے مختلف صورت پیدا ہوئی، وہاں جاگیردار کم اور بادشاہ زیادہ صلیبی جنگ میں مشغول رہے، بادشاہ کی عدم موجودگی میں انگلستان کے امراء نے اپنے اثرات زیادہ پیدا کر لیے، ان کے اثرات اتنے بڑھے کہ آئندہ چل کر وہ بالکل محض دستوری حکمران بنتے چلے گئے۔

(تمدن عرب اردو، ص ۳۱۰۔۳۰۹)۔

صلیبی مسلمانوں کی یک جائی کو درہم برہم کرنے یروشلم گئے تھے، مگر خود بھی انتشار میں مبتلا ہوگئے، ان لڑائیوں میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک ہوئے، تو راستے ہی میں علیحدہ علیحدہ بولنے والوں کی ٹولیاں الگ ہونے لگیں، اس طرح فرانس اور جرمنی کے صلیبیوں میں اختلاف ہوا، جو

دوسری جنگ میں اتنا بڑھا کہ ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، تیسری جنگ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں اس اختلاف میں اتنا اضافہ ہوا کہ انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کی کامیابیوں کو برداشت نہیں کر سکے، فرانس کے بادشاہ کو وطن لوٹنا پڑا، جس کے بعد انگلستان اور فرانس کی کشمکش اندر اندر بڑھتی گئی، جو ایک صدی تک جاری رہی۔

(کریسڈ از ارچر کنگسفورڈ ص ۴۲)

سیاسی اثرات:

یورپ کی مغربی ریاستوں نے جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے آخر میں "صلاح الدین ٹیکس"، کے نام سے ایک ٹیکس وصول کرنا شروع کیا تھا، جس سے ان کی دولت میں نہ صرف اضافہ ہوا، بلکہ ان کو نئے ٹیکس لگانے کا اختیار بھی حاصل ہوگیا، اب تک ان کو زمین کی پیداوار ہی پر ٹیکس لگانے کا حق تھا، اس حق سے فرانس نے زیادہ فائدہ اٹھایا اور چوں کہ فرانس نے ان لڑائیوں میں زیادہ حصہ لیا تھا، اس لیے اس کو ان سے فوائد بھی زیادہ پہونچے، شام میں اس کی نوآبادیاں زیادہ قائم ہوتی گئیں اور یورپ میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اس کے وقار میں زیادہ اضافہ ہوا (تفصیل کے لیے دیکھو مضمون کریسڈ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۷، ص ۵۴۷ گیارہواں ایڈیشن)۔

ان لڑائیوں کی وجہ سے جرمنی کی سیاست بھی ایسی الجھی کہ اس کے سلجھنے میں بڑی دیر لگی، لیتھونیا کے نائٹوں کی شرکت کی وجہ سے پروشیا کی سیاست بھی ایسی بدلی کہ اس کے بعد جدید پروشیا کی بنیاد پڑی، (کریسڈ ارچر اینڈ کنگسفورڈ باب ۲۸)۔

ان لڑائیوں کا سب سے زیادہ اثر بازنطینی سلطنت پر پڑا، اس کی سرحد یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلی ہوئی تھی، قسطنطنیہ نہ صرف اس سلطنت بلکہ یورپ کا حصن حصین تھا، اس کو مسلمان فتح نہ کر سکے تھے، مگر جب چوتھی صلیبی جنگ کے سلسلہ میں صلیبیوں نے اس کو لوٹ کر برباد کردیا اور وہاں فلانڈرس کا رئیس شہنشاہ بنا دیا گیا، تو قدیم شہنشاہی کی طرح یہ شہنشاہی قوی ثابت نہیں ہوئی، یہ تباہ ہوئی، تو یونانی شہنشاہی قائم ہوئی، مگر اس کو بھی سابقہ قوت کبھی حاصل نہیں ہوئی اور وہ کمزور ہوتی گئی، (تاریخ یورپ از اے، جے گرانٹ ص ۳۶۲)

جب دولت عثمانیہ ابھری، تو وہ اس بازنطینی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس سے برسرپیکار رہی۔ عثمان خاں اول نے تو اس کے اہم قلعے فتح کرکے اپنی فتوحات کا دائرہ بحر اسود تک پہنچا دیا، پھر ایشیائے کوچک میں اس کے شہر بروصہ کو بھی حاصل کرلیا۔ عثمان خاں کے بیٹے اورخان نے گیلی پولی پر قبضہ کرکے مسیحی یورپ میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے دیانا کی دیواروں تک پھیل گئی، بازنطینی حکومت کا قیصر کنٹا کوزین تو اتنا اس کے سامنے جھکا کہ اس نے اپنی بیٹی تھیوڈرا کو خان کے حبالۂ عقد میں دے دیا، اس وقت اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا، قسطنطنیہ کے علاوہ صرف تھریس، مقدونیہ اور موریا کے کچھ حصے اس کی سلطنت میں رہ گئے تھے اورخان کے جانشین مراد اول کے زمانہ میں دولت عثمانیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر مسیحی حکومتیں صلیبی جنگ کے زمانہ کی طرح اس کے خلاف صف آرا ہوئیں، مگر کسووا کی جنگ میں ہلال کو صلیب پر فتح ہوئی اور جب مراد اول مرا، تو یورپ میں بلغاریہ، سرویا اور بوسنیا پر اس کا تسلط تھا۔

مراد کے جانشین بایزید اول یلدرم کی طاقت اور بڑھی، تو سرویا کے بادشاہ نے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا کو اس کے نکاح میں دے دیا، اس نے اپنی بڑھتی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھا کر قسطنطنیہ میں بہت سی رعایتیں حاصل کرکے اس کے آخری قلعہ فلاڈلفیا پر بھی قبضہ کرلیا، ولاچیا اور بلغاریہ بھی اس کے زیرنگیں ہوگئے۔ اناطولیہ اور ایشیائے کوچک کے اکثر علاقے اس کی حکومت میں شامل ہوگئے اور جب یورپ میں اس نے نائکوپلس، ویدین اور سلسٹریا کو بھی فتح کرلیا، تو یورپ نے اس کے خلاف ایک صلیبی جنگ کا اعلان کیا اور فرانس اور جرمنی، بوریا اور برگنڈی وغیرہ کو ابھار کر ایک صلیبی فوج اس لیے تیار کی گئی کہ بایزید یلدرم کو شکست دے کر یہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے، پھر یہ درۂ دانیال کو عبور کرکے شام میں داخل ہو اور ارض مقدس پر قبضہ کرکے یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کرکے انتقام لے (ہسٹری آف دی اوٹومن ٹرکس از اڈورڈ کریسی ص ۵۲، ج ۱) پھر ایک بار یورپ میں صلیبی جنگ کی فضا قائم ہوگئی، بڑی خونریزی ہوئی، مگر ہلال صلیب پر غالب آیا، اس کے بعد بایزید نے یونان کو بھی فتح کرلیا اور جب وہ قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے اس کے محاصرہ میں مشغول تھا، تو تیمور اپنے جرار اور سفاک لشکر کے ساتھ اس کے قلمرو پر حملہ آور ہوا اور اس کو شکست فاش دے کر اس کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، تیمور نے اس کو قید کرلیا اور اسی قید میں اس کی موت ہوئی، اس کی

اس شکست پر یورپ میں بڑی خوشی منائی گئی اور بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، لیکن محمد اول نے دولت عثمانیہ میں از سر نو جان پیدا کی، اس کے جانشین مراد ثانی کے عہد میں اس کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے نہ صرف قسطنطنیہ سے ٹکر لی، بلکہ سالونیکا اور سرویا پر بھی قبضہ کر لیا۔ مسیحی حکومتیں مل کر اس کے خلاف بیس برس تک جنگ کرتی رہیں، ان مختلف معرکہ آرائیوں میں صلیبی جنگ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان صلیبیوں کو وارنا کی جنگ میں شکست ہوئی۔ مراد ثانی کے جانشین محمد کے زمانہ میں ترکوں کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا، جس کے بعد بازنطینی امپائر کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد جس طرح قسطنطنیہ میں داخل ہوا ہے، اس کا ذکر لارڈ ایورسلے نے اپنی کتاب ٹرکش امپائر میں اس طرح کیا ہے "اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا، جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں، جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہو پائی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ (ص ۸۷ بحوالہ دولت عثمانیہ ج ۱ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۱۱۵) پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنی مشہور کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ کے عیسائیوں نے اطاعت قبول کر لی، تو وہاں کے کلیسا کے بطریق کو یہ رعایتیں دی گئیں کہ وہ شہر میں جلوس کے ساتھ نکل سکتے ہیں، وہ اپنی عدالت میں اپنے مقدمے کا خود فیصلے کر سکتے ہیں، اپنے مجرموں کو موت کی سزا بھی دے سکتے ہیں، وہ اپنی عیسوی فقہ پر عمل کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، لارڈ ایورسلے محمد کی اس رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان مورس کے ساتھ جنھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں یعنی عیسائیوں کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کو ملک سے نکالتے وقت یہ نمونہ پیش نہیں کیا۔ یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، (ٹرکش امپائر لارڈ ایورسلے ص ۸۹)۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر آرچ اور کنگسفورڈ نے تبصرہ کرتے ہوئے اجمالی طور پر لکھا ہے کہ پہلی جنگ صلیبی کی وجہ سے رومن امپائر سلجوقیوں کے زیر نگیں ہونے سے بچ گیا تھا، آخر بارھویں صدی میں اس امپائر کے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے واپس مل گئے تھے، لیکن بعد میں صلیبی فوج جس منتشر طریقے سے جنگ کے لیے روانہ ہوئی، اس سے اس امپائر کو بڑا نقصان پہونچا، اس کے زوال کو صلیبی جنگ سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ (ص، ۴۴۷)۔

یہی مصنفین لکھتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی طاقت مشرقی یورپ میں یونانی امپائر کے زوال سے بڑھتی گئی، چودھویں صدی کے آخر میں بایزید نے بلغاریہ اور سرویہ کو زیر کیا، پھر ہنگری خطرہ میں پڑگیا، جس سے مغربی یورپ کے سورما عیسائیت کے مشترکہ دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرانس کے نائٹوں کی ایک بڑی جماعت ترکوں سے برسرپیکار ہوئی، مگر شکست کھا گئی، اس وقت بایزید قسطنطنیہ کو فتح نہ کرسکا، لیکن اس میں عیسائیوں کے شجاعانہ کارناموں کا کوئی دخل نہیں، تیمور کا حملہ حائل ہوا، پھر بایزید کے لڑکوں میں خانہ جنگی بھی رہی، جس سے قسطنطنیہ کچھ دنوں اور محفوظ رہا، لیکن ۱۴۵۳ء میں جب محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا، تو پوپ نے مغربی یورپ کو ایک صلیبی جنگ کے فرائض ادا کرنے پر پھر ابھارا، لیکن دو صدیوں تک ترک مشرقی یورپ پر طوفانی بادل کی طرح چھائے رہے، جب ۱۵۷۱ء میں لیپانٹو اور ۱۶۸۳ء میں ویانا میں ترکوں کو جو شکست ہوئی، تو یہ یقینا صلیب کی فتح تھی، مگر چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک ترکوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑی گئیں، ان میں مقدس جنگ کا رنگ نہیں رہا، (کریسیڈ ص ۴۲۱-۴۲۰)۔

ان لڑائیوں میں بیت المقدس کی صلیبی لڑائیوں کا مذہبی جنون نہ رہا ہو، مگر فرانسیسی مورخ موسیو لیبان نے اعتراف کیا ہے کہ جنگ صلیبی نے کئی صدیوں تک دنیا میں شدید مذہبی عداوت اور ناروا داری جاری رکھی اور اس کو بے رحمی اور خوں خواری کے درجہ تک پہنچادیا، جس کی مثال مذہب یہود کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی (تمدن عرب ص ۳۰۸)۔

یہ مذہبی عداوت، ناروا داری، بے رحمی اور خون خواری صدیوں تک کس کے خلاف رہی، یقینا مسلمانوں کے خلاف، عیسائی سسلی اور اسپین کے مسلمانوں کا خون چوسنے کے بعد مطمئن نہیں

ہوئے، تو ٹرکش امپائر کے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے کے لیے برابر متحدہ کوشش کرتے رہے اور اس میں وہ کامیاب رہے، انھوں نے صدیوں کی کوششوں کے بعد پہلی جنگِ عظیم کے بعد ٹرکش امپائر کا تیا پانچہ کردیا، کس طرح؟ اس کی ایک جھلک یورپ کے مشہور مورخ ٹوائن بی کی حسب ذیل تحریر میں دکھائی دے گی۔ سمرنا میں جب یونانی فوج داخل ہوئی، تو ٹوائن بی لکھتا ہے۔ ۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی، جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہوگیا، جنگِ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے کے بعد ایک روز دفعتہً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے گئے، عقبی خطہ کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہوگئی، جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کے بندرگاہوں کو اندرونِ ملک سے جدا کرکے تجارت کو تباہ کردیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کردی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے اور جو بچ رہے، وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کرلیے گیے یا جلاوطن کردیے گئے، غرض قتل وغارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا، (بحوالہ دولت عثمانیہ ج ا، ص ۳۴۸، شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)۔

کیا یہ سفاکی، خون ریزی اور ہولناکی صلیبی جنگ کی یاد تازہ نہیں کررہی تھی؟

کلیسا پر اثرات:

اب تک صلیبی لڑائیوں کے جو فوری اور دوررس سیاسی اثرات مرتب ہوئے، اس پر روشنی ڈالی جارہی تھی۔ اب ذرا یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان لڑائیوں سے کلیساؤں نے کیا کیا فوائد اٹھائے، یہ لڑائیاں پوپ ہی کے اشتعال دلانے پر چھیڑی گئیں، اس کی ہر آواز پر یورپ آمنا وصدقنا کہتا رہا۔ صلیبی فوجیں اسی کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہوتی رہیں، صلیبیوں کی فوج اسی کی فوج سمجھی جاتی، اس سے پاپائی طاقت میں اتنا اضافہ ہوا کہ یورپ کے حکمران اس سے خوفزدہ رہنے لگے، پوپ کی طاقت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ فرانس کا بادشاہ سینٹ لوئی اپنے ملک فرانس میں تو مقبول رہا مگر پوپ اس سے پانچویں جنگ صلیبی میں خفا ہوا، تو اس کو اور اس کے قلم رو نیپلز کو کلیسا کے دائرہ اثر

سے خارج کر دیا۔ فریڈرک اور پوپ دونوں کے جانشینوں میں سخت اختلاف رہا۔ فریڈرک نے تو یہ آواز بلند کی کہ زمانہ کی ساری خرابیاں اہل کلیسا کے غرور اور دولت کی وجہ سے ہیں، اس کی اس رائے سے یورپ کے اور حکمراں بھی متاثر ہوئے۔ (آؤٹ لائن آف ہسٹری، از ایچ، جی، ویلس ص ۶۶۰)۔

کلیساؤں کے غرور کی وجہ یہ بھی تھی کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں وہ یورپ کے ہر ملک کی سیاست میں بھی اثر انداز ہونے لگے تھے، مغربی یورپ کے ہر ملک کے کلیسائی نظام میں پوپ مقتدر اعلیٰ قرار دے دیا گیا تھا، اس کے احکام کو حکومت بھی تسلیم کرنے لگی، جس سے آگے چل کر حکومت اور کلیسا میں بڑی آویزش ہوتی گئی۔

صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں اہل کلیسا کا اثر اس لحاظ سے بھی بڑھا کہ جو لوگ صلیبی جنگ میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوئے، تو وہ ان ہی کے حکم کے پابند رہتے اور جو صلیبی جنگ میں جانے کا وعدہ کر کے اس میں شرکت کرنے سے گریز کرتے، تو ان کے معتوب ہو جاتے۔

ان کلیساؤں کو ان لڑائیوں کے زمانہ میں متمول ہونے کا بھی موقع ملا، پوپ نے تو ''صلاح الدین ٹیکس،، کی طرح عشر بھی عاید کر رکھا تھا۔ صلیبیوں کے پاس جنگ میں شریک ہونے کے لیے سرمایہ نہ ہوتا، تو وہ اپنی زمین، جائداد اور اثاثہ فروخت کر دیتے، ان کو زیادہ تر کلیسا کی طرف سے خرید لیا جاتا یا خود پادری انفرادی طور پر خرید لیتے، جو لوگ بوڑھے یا جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہوتے، تو وہ شرکت سے بچنے کی خاطر اپنا اثاثہ کلیسا کے حوالے کر دیتے، اس طرح کلیسا اور پادریوں کے پاس بڑی دولت جمع ہو گئی، جس زمین اور جائداد پر ان کا قبضہ ہو جاتا، وہ برابر ان ہی کے پاس رہتی، ان کی بڑھتی ہوئی دولت کا ردعمل بھی ہوا اور کلیسائی نظام میں ریفارمیشن کی جو تحریک چلی، اس میں ان کلیساؤں کا متمول ہونا بھی تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو ان لڑائیوں میں جس طرح استعمال کیا گیا، مفاد پرستوں کی وجہ سے ان میں جو ناکامیاں اور ہولناکیاں ہوئیں۔ اس سے بھی ایک طبقہ میں بڑا تکدر پیدا ہوا، جس سے بھی یورپ کے ریفارمیشن کی تحریک میں بڑی مدد ملی، (مزید تفصیل کے لیے دیکھو کریسیڈ از آرچر اینڈ کنگسفورڈ، ص ۳۲-۳۳۲ اور تمدن عرب از موسیو لیبان، ص ۳۰۸-۳۰۷)۔

تجارتی و اقتصادی اثرات:

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یورپ کے تاجروں کو مشرق میں ایک تجارتی منڈی مل جائے، جو ان لڑائیوں کی وجہ سے ان کو مل گئی۔ گرانٹ لکھتا ہے کہ شمالی اطالیہ کی تجارتی سلطنتوں نے صلیبی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا، اس سے انھوں نے بہت سے مالی فوائد حاصل کیے، مشرق کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں میں انھوں نے تجارتی حقوق پیدا کر لیے، اس طرح قسطنطنیہ کی تجارت وینس اور جنیوا کے بندرگاہوں میں منتقل ہو گئی تھی اور دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وینس کو ان مذہبی لڑائیوں سے زیادہ نفع حاصل ہوا، (ص ۶۱-۳۶۰) وینس کے تاجروں نے تو اسکندریہ کے مسلمانوں سے اپنی تجارت کی خاطر دوستانہ تعلقات بھی پیدا کر لیے تھے اور جب یہ لڑائیاں ختم بھی ہو گئیں، تو ان کی تجارت بدستور جاری رہی، جب ان کی تجارت خطرے میں پڑ جاتی، تو اطالوی تجار صلیبی جنگ سے آزردہ اور بددل رہتے۔ (کریسیڈ از آرچر اینڈ کنگسفورڈ، ص ۳۳۷-۳۳۶)

پہلے ذکر آیا ہے کہ اطالوی تاجروں نے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر صلیبیوں کا رخ زارا اور قسطنطنیہ کی طرف بھی موڑ دیا تھا، زارا ان کا تجارتی حریف ہو گیا تھا، اس کی تباہی کے بعد تجارت پر وینس کا پورا قبضہ ہو گیا، اس کی تفصیل لکھتے ہوئے "دی بازنطیس امپائر" کے مصنف سی ڈبلیو، سی، اومان رقمطراز ہے کہ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبی وینس میں مقیم تھے، وہ اس مہم پر روانہ ہوئے تھے کہ مصر کے سلطان العادل پر وہاں پہونچ کر ایک کاری ضرب لگائیں۔ وینس کے تاجروں نے ان کو بحری بیڑے دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر اس شرط پر کہ وہ مصر کے ساحل پر حملہ آور نہ ہوں، کیوں کہ ان تاجروں کے تعلقات مصر کے سلطان سے بہت اچھے تھے، جس نے اسکندریہ میں ان کو اتنی تجارتی رعایتیں دی تھیں کہ ہندوستان تک کی تجارت ان کے ہاتھوں میں آ گئی تھی، اس لیے ان تاجروں نے ان صلیبیوں کا رخ موڑ دیا۔ صلیبیوں نے وینس کے تاجروں سے جہازوں کا جو کرایہ دینے کا معاہدہ کیا تھا، وہ نہ دے سکے، تو تاجروں کو ایک بہانہ مل گیا۔ زارا کے شہری ان دنوں وینس سے بغاوت کر کے ہنگری کے بادشاہ سے مل گئے تھے۔ وینس کے تاجروں نے صلیبیوں سے کہا کہ اگر وہ زارا پر حملہ

کر کے وینس کے ماتحت کر دیں، تو وہ ان کے سارے قرض معاف کر کے ان کو وہاں پہونچا دیں گے، جہاں جانا چاہتے ہیں۔ صلیبی مسلمانوں کے خلاف ایک مقدس جنگ کرنے چلے تھے، لیکن وہ اب عیسائیوں کے ایک قصبہ کی طرف بڑھے، ضمیر رکھنے والے اس کے لیے آمادہ نہ ہوتے، وہ تو مصر کی مہم کے لیے اصرار کرتے، لیکن صلیبیوں کے یہاں گذشتہ ایک سو سال سے ضمیر کم یاب ہوتا جا رہا تھا، ان میں حریص مہم باز فوجی سردار تھے، جو زارا پر حملہ کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔

زارا کی تسخیر ہو گئی، تو وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے...... جہاں کے حکمراں کے بھتیجے الکزلس نے ان کو قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی دعوت یہ وعدہ کر کے دی کہ وہ ان کو روپے، رسد، جنگی بیڑے اور فوج بھی دے گا۔ پوپ زارا جیسے عیسائی شہر پر ان صلیبیوں کے حملہ سے آزردہ تھا، مگر وینس کے تاجر صلیبیوں کو مصر پر حملہ کرنے سے باز رکھنا چاہتے تھے، اس لیے وہ بھی ان کا رخ قسطنطنیہ کی طرف موڑ دینا چاہتے تھے،............ یہ صلیبی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے............ اور جب اس کو فتح کیا، تو تین دن زنا اور غارت گری کا جشن مناتے رہے۔ نائٹ اور سپاہی اپنی پسند کے گھر میں گھس جاتے اور اندر جا کر ان کا جو جی چاہتا کرتے، گرجاؤں اور ننوں کی رہائش گاہوں کو بھی نہ چھوڑا، پوپ بھی چیخ اٹھا کہ اس قسم کی فتح سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، شراب پی کر بدمست سپاہیوں نے ایک طوائف کو سینٹ صوفیہ کے منبر پر بٹھا کر اس کی تاج پوشی کی اور اس سے ناشایستہ گانے گوائے اور ناروا رقص کرائے۔

صلیبیوں کے ساتھ بہت سے پادری بھی تھے، وہ اپنے ہم وطنوں کو ان ناروا حرکتوں سے روکنے گئے مگر وہ خود لوٹ میں مشغول ہو گئے، گرجاؤں میں جتنی مقدس چیزیں تھیں، ان سب کو انھوں نے لوٹا۔ ایک یونانی مصنف نے اس غارت گری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس نے لکھا کہ کافر مسلمانوں نے ایسی ناروا حرکتیں نہیں کیں، جو ان صلیبیوں کے ذریعہ عمل میں آئیں، مسلمانوں نے جب کوئی شہر فتح کیا، تو انھوں نے گرجاؤں اور عورتوں کا احترام کیا۔ (باب ۲۲ ص ۲۹۰-۲۷۹)

وینس کے تاجروں کے ساتھ مارسیلز کے تاجروں نے بھی فلسطین میں اپنی تجارت کی منڈی قائم کر لی تھی، اس طرح انگلستان، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے کے تجارتی بیڑے بھی بحر قلزم میں پہنچنے لگے، جس سے ان ملکوں کی دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ پروشیا کے تاجروں نے بھی اس

سے فوائد اٹھائے، تجارت بڑھی، تو بینک بھی قائم ہونے لگے۔ زرمبادلہ کی سرگرمیاں بھی بڑھیں، بحری قوانین کا نفاذ بھی صلیبی جنگ کے ہی زمانہ سے شروع ہوا، اس تجارت سے مرچوں، مسالہ، خوشبوئیات کا رواج یورپ میں ہونے لگا۔ صقلیہ میں ریشم کے کارخانے قائم ہوئے، گنے کی پیداوار بھی وہاں ہونے لگی، روئی اور ریشم کی صنعتیں شام سے یورپ میں آنے لگیں۔ ایران سے خوشبوئیات، ہندوستان سے مسالہ اور جواہرات اور چین سے چینی برتن آنے لگے (آرچر اینڈ کنگسفورڈ ص ۴۲۰۔۴۲۷) موسیو لیبان لکھتا ہے کہ وہ تجارتی ترقی جو صلیبی جنگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ صلیبیوں کے ایشیا سے نکالے جانے پر بھی ختم نہیں ہوئی، کیوں کہ اطالیہ کے اکثر خودمختار تجارتی بندروں نے سلاطینِ اسلام کے ساتھ معاہدے کر لیے تھے اور یہی مشرقی تجارت وینس کی سرسبزی اور قوت کا باعث ہوئی اور اس وقت تک عروج پر رہی، جب کہ نئے بحری راستوں کے قائم ہونے سے یہ تجارت دوسری قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ (تمدن عرب ص ۳۱۰)

یہی مورخ لکھتا ہے، صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے لکڑی اور فلزات کی دست کاریاں چینی اور شیشے کے عمدہ کام کی واقفیت ایشیا سے یورپ کو ہوئی، مصور کے شیشہ کے آلات وینس کے لیے نمونے بن گئے، ریشمی کپڑوں کا بننا اور ان کا عمدگی کے ساتھ رنگنا، جو مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ پر تھا، یورپ میں پھیل گیا، پھر صلیبی فوج کے ساتھ جو تجار اور صیقل گر شام سے گئے، انھوں نے اپنے پیشوں سے متعلق وہاں سے بہت کچھ سیکھا۔ (ایضاً ص ۳۱۰ و ۳۱۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کریسیڈ کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بہت سے نئے پودے، نئے پھل، نئے رنگ، پوشاک میں نئے فیشن شکر، باجرا، لیمو، خوبانی، تربوزے، روئی، ململ، بوٹے دار ریشمی کپڑے، بنفشی ارغوانی اور آسمانی رنگ، پوڈر، آئینے اور تسبیح کے دانے وغیرہ، یورپ میں صلیبی لڑائیوں کے بعد ہی یورپ میں مشرق سے آنے لگے۔ (مضمون کریسیڈ، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۷، ص ۵۵۰۔۵۴۹، گیارہواں ایڈیشن)۔

معاشرتی اثرات:

لیبان لکھتا ہے کہ فنون اور صنعت میں مشرق کا اثر یورپ پر بہت کچھ ہوا، ان پُرتکلف اور خوب صورت اشیا کو دیکھ کر جو مشرق میں قسطنطنیہ سے لے کر مصر تک موجود تھیں، صلیبیوں کا مذاق

درست ہو گیا، یورپ کا طرزِ عمارت بھی بالکل بدلنے لگا، ان کی عمارتوں میں عرب کے تمدن کے اثرات پائے جانے لگے۔ (تمدن عرب ص ۳۱۱) آرچر اور کنگسفورڈ نے لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ میں تاجروں کے ذریعہ سے تعیشات کے سامان آنے لگے، تو ان کے باشندوں کا معیار زندگی عیش پسندی کی حد تک بڑھ گیا (ص ۲۳۶) فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ عیسائی جب بیت المقدس پہونچے، تو ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں سے اپنے تمدن میں برتر ہیں، وہ مسلمانوں کو بت پرست سمجھتے تھے، ان کا عام خیال تھا کہ وہ محمد کو خدا کی حیثیت سے پرستش کرتے ہیں، لیکن ان کا میل ملاپ مسلمانوں سے بڑھا، تو ان کی یہ غلط فہمی جاتی رہی اور جب ان کا باہمی ملنا جلنا بڑھا، تو دونوں کے خیالات میں نمایاں فرق ہونے لگا، دونوں میں ہمسایہ کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونے لگے۔ عیسائی اپنے یہاں مقامی کاری گروں اور کاشت کاروں کو رکھنے لگے۔

انھوں نے اپنی جاگیر میں فیوڈرل نظام قائم کیا تھا، مگر مقامی نظام ہی کو اختیار کر لیا، وہ اپنے ساتھ گھوڑے، باز اور کتے بھی لے گئے تھے، انھوں نے یہ معاہدہ کر لیا کہ ان کے شکار کی مہم میں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا، دونوں طرف سے مسافر اور تاجر بہ حفاظت تمام آنے جانے لگے، عیسائیوں نے اپنا یورپی لباس پہننا چھوڑ دیا اور عربوں کا مناسب اور آرام دہ لباس پہننے لگے، وہ ایسی غذائیں بھی کھانے لگے، جن میں مسالہ اور شکر زیادہ ہوتی، وہ ایسے مشرقی طرز کے مکانات بھی پسند کرنے لگے، جن میں وسیع صحن اور فوارے ہوتے، انھوں نے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنا شروع کیا اور وہ مسلمانوں حتیٰ کہ یہودیوں کے متبرک مقامات کا احترام بھی کرنے لگے اور جب وہ آپس ہی میں لڑ جاتے، تو ان کفار (یعنی مسلمانوں) سے مدد کے خواست گار بھی ہوتے۔ مسلمان بھی مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مدد لے لیتے (ہسٹری آف دی عربس ۴۴-۶۴۳) انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ اول نے تو یہ تجویز پیش کی تھی کہ یورپ کی شہزادیاں مسلمانوں کے حرم میں بلا تکلف داخل کر دی جاتیں، تا کہ وہ اپنے حسن سے اپنے مسلمان شوہروں کو اپنا مذہب بدلنے پر آمادہ کریں (کریسیڈ ص ۳۲۹) یورپ کے مدبرین کی یہ پرانی چال رہی ہے کہ تیغ و سنان سے کام لینے کے ساتھ حسین عورتوں کے مژگان سے بھی کام لیتے رہے ہیں۔ سلجوقی خاندان اور دولتِ عثمانیہ کے فرمانرواؤں کے حرم میں یورپ کی بہت سی شہزادیاں داخل ہوئیں۔

علمی اثرات:

صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ کے جغرافیہ دانوں نے ایشیا کے جغرافیہ سے واقف ہونے کی کوشش کی، تو جغرافیہ پر اچھا لٹریچر فراہم ہوگیا، پھر مورخوں نے ان لڑائیوں کی تاریخیں لکھیں، تو تاریخی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا، ان پر اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی گئیں۔ فرانسیسی شاعری پر تو صلیبی لڑائیوں کا اچھا خاصا اثر پڑا، اسی کے بعد یورپ والوں کو مشرق کی زبانوں کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ۱۳۱۱ء تک آتے آتے یورپ میں مشرقی زبانوں کے چھ اسکول کھل گئے اور مشرق کے بہت سے قصے یورپ میں لکھے جانے لگے۔ مغربی یورپ کے ملکوں کی زبانوں میں عربی کی کچھ الفاظ بدلی ہوئی شکلوں میں استعمال ہونے لگے، تجارت، جہاز رانی اور موسیقی کے بھی اصطلاحات عربی زبان سے لیے گئے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، ج ۷، ص ۵۵۰۔ ۵۴۹، گیارہواں ایڈیشن)۔

مسلمان سلاطین کے کردار اور شجاعت کا اثر:

صلیبی بلکہ خود یورپ کے فرمانروا عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے کردار اور شجاعت سے مرعوب اور متاثر رہے، جیسا کہ یورپ کے حسب ذیل مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوگا۔

گبن لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی نے افرنجیوں سے انطاکیہ میں لڑ کر اپنی سپہ گری کی شہرت قائم کی، اس نے تیس معرکے اور سر کیے، جس کے بعد اس کو موصل کا علاقہ دیا گیا، تا کہ وہ اپنے پیغمبر کے مشن کا حق ادا کر سکے اور اس نے اپنے عوام کی امیدوں کو پورا کیا، اس نے پچیس دن کے محاصرہ کے بعد الرہا (اڈیسا) کی تسخیر کی اور افرنجیوں نے فرات تک کے جو علاقے فتح کر لیے تھے، ان کو پھر سے حاصل کیا، اس نے کردستان کے جنگجو قبیلوں کو بھی سر کیا، اس کے سپاہی اپنے فوجی کیمپ ہی کو اپنا ملک سمجھتے، ان کو اپنے اس آقا کے فیاضانہ انعامات کے عطا کرنے پر پورا بھروسہ رہتا اور وہ بھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے خاندانوں کی پوری نگہبانی کرتا۔

اس کے لڑکے نور الدین نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی قوت کو متحد کیا، حلب کی حکومت میں دمشق کا اضافہ کیا، شام کے عیسائیوں کے خلاف بڑی طویل لڑائی لڑتا رہا، اس نے اپنی سلطنت کی سرحد دجلہ سے نیل کے ساحل تک بڑھا دی، عباسیوں نے اس کو وہ سارے خطابات اور مراعات دیے، جو بادشاہت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ عیسائی خود اس کی ہوش مندی، شجاعت، انصاف پسندی اور سیرت کی طہارت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے، اپنی حکومت کے زمانہ میں اس مقدس سپاہی نے اسلام کے پہلے چار خلفا کے جوش وخروش اور سادگی کا اعادہ کیا تھا، اس کے محل میں سونا اور ریشمی کپڑے نہیں دکھائی دیتے، اس کی مملکت میں شراب کا استعمال ممنوع تھا، بیت المال کی آمدنی عوام کی خدمت میں بھی صرف ہوتی، اس کی خانگی زندگی بہت ہی سادہ تھی، جس کے مصارف اُس مالِ غنیمت سے پورے کیے جاتے، جو اس کو جائز طریقہ سے ملتا، اس کی ملکہ اپنے اخراجات کے لیے کچھ رقمیں مانگتی، تو وہ کہتا کہ "مجھ پر خوف الٰہی طاری رہتا ہے، میں مسلمانوں کا صرف خزانچی ہوں، میں ان کے مال کا ناجائز مصرف نہیں لے سکتا، حمص میں میری ملکیت میں تین دکانیں ہیں، یہی تم لے سکتی ہو"، اس کی عدالت میں بڑے سے بڑے لوگوں پر دہشت طاری ہوجاتی اور یہ غربا کی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی، اس کی وفات کے چند سال کے بعد ایک مظلوم دمشق کی سڑکوں پر چلا کر کہتا تھا، نورالدین! نورالدین! اب تم کہاں گئے، اٹھو! آؤ اور ہم لوگوں پر رحم کھاؤ اور ہم کو بچاؤ اور جب کوئی انتشار پھیلتا، تو ایک ظالم کی گردن نورالدین کے نام سے جھک جاتی (فال اینڈ ڈکلائن آف دی رومن امپائر، ج ۷، ص ۸۸ ـ ۴۸۷)۔

گبن صلاح الدین ایوبی کے بارہ میں لکھتا ہے کہ وہ کھردرے قسم کا ادنیٰ لباس پہنتا، صرف پانی ہی اس کے مشروبات میں تھا، اپنی سیرت کی پاکیزگی میں اپنے رسولؐ سے بھی آگے چلا گیا تھا[۱] وہ اپنی زندگی اور عمل میں کٹر قسم کا مسلمان تھا، وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ اپنے مذہب کی مدافعانہ لڑائیوں کی خاطر حج کرنے کو نہیں جاسکتا ہے، وہ حج کے لیے جاتا رہا، پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، وہ روزے بھی برابر رکھتا رہا، اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بھی کلام پاک کی تلاوت کرلیا کرتا تھا اور جب غنیم کی یورش ہوتی، تو بھی اس کی تلاوت میں مشغول رہتا، یہ بظاہر نمائشی چیز معلوم ہوتی ہے

---

[۱] نعوذ باللہ

مگر اس سے اس کی پرہیزگاری اور ہمت دونوں ظاہر ہوتی ہے، وہ شافعی مسلک کا تھا، اس لیے اسی مسلک کے عقائد کا مطالعہ کرنے کی ترغیب کر دیتا، شعراء اس کی مذمت سے محفوظ رہے، لیکن اس کو غیر مذہبی علوم سے نفرت تھی۔ ایک فلسفی نے بہت سی نئی باتیں کہیں، تو اس کی سزا کا مستحق ہو گیا، اس کی عدالت کا دروازہ ادنیٰ آدمیوں کے لیے کھلا رہتا اور وہ اس کے اور اس کے وزراء کے خلاف مقدمے دائر کر سکتے تھے۔ سلطان صرف اپنی سلطنت کے مفاد میں ہی کبھی انصاف سے تجاوز کر جاتا، سلجوقیوں اور زنگیوں کے جانشین اس کے رکاب میں ضرور رہتے، اس کی پوشاک کو جھاڑا کرتے، مگر وہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازموں کے لیے نرم اور رحم دل رہا، اس کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی، عکہ کی تسخیر کے وقت اس نے بارہ ہزار گھوڑے تقسیم کیے، جب اس کی وفات ہوئی، تو اس کے خزانے میں صرف ۴۷ نقرئی درہم اور ایک اشرفی تھی، لیکن اس کی فوجی حکومت میں متمول شہری کسی خوف اور خطرہ کے بغیر اپنی محنت کا صلہ پاتے رہتے۔ اس زمانہ میں مصر، شام اور عرب کو اسپتالوں، مدرسوں اور مسجدوں سے آراستہ کیا گیا۔ قاہرہ کو حصار سے محفوظ کیا گیا۔ سلطان اپنے کو کسی نہ کسی مفید کام میں مشغول رکھتا، وہ کسی باغ میں تفریح کے لیے نہیں جاتا اور نہ اپنے محل کے اندر کوئی تعیش کا سامان کرتا، یہ مذہبی جنون کا زمانہ تھا، لیکن صلاح الدین کی خوبیوں سے خود عیسائی متاثر ہو کر خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ جرمنی کے شہنشاہ کو اس کی دوستی پر فخر رہا۔ یونانی شہنشاہ اس سے اتحاد اور تعاون کا خواستگار رہا اور جب سلطان نے یروشلم کو فتح کیا، تو اس کی شہرت کو چار چاند مشرق اور مغرب دونوں جگہوں میں لگے۔ (ایضاً ص ۳۰۶-۳۰۴)

آرچر اور کنگسفورڈ عماد الدین زنگی کے بارہ میں رقمطراز ہیں کہ زنگی کی سیرت میں بہت سے شریفانہ اوصاف تھے، وہ ایک بہادر سپاہی، ایک لائق جنرل اور ایک ہوش مند مدبر تھا، اس کی سب سے بڑی کمزوری صرف یہ تھی کہ وہ فریب اور جھوٹ سے بھی کام لیا کرتا تھا، لیکن ایک حکمران کی حیثیت سے وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے کام پر نظر رکھتا تھا اور اپنی انتھک سرگرمیوں کی بدولت وہ مستقبل کے واقعات سے بھی باخبر ہو جاتا، اپنے ماتحتوں کے لیے ضابطہ کی پابندی میں بہت سخت تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ ایک ملک میں ایک ہی ظالم کو ہونا چاہیے، اس کے خوف سے ہر شخص لرزہ براندام رہتا، ایک بار اس نے ایک ملاح کو اپنی ڈیوٹی کے وقت سوتا پایا، جب اس نے اس کو جگایا، تو اس پر

اتنا خوف طاری ہوا کہ اسی وقت گر کر مر گیا (کریسیڈ، ص ۲۰۲)۔

یہی مصنفین نور الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی ہوشیار قسم کا سپاہی تھا، اپنے باپ ہی کی طرح اپنے ماتحت سپاہیوں کا بڑا خیال رکھتا، مگر ان کو لوٹ کی اجازت نہیں دیتا، پھر بھی اس کے سپاہی اس سے محبت کرتے اور لڑائی میں بڑی پامردی سے اس کا ساتھ دیتے، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ لڑائی میں مارے بھی گئے، تو سلطان ان کے اہل وعیال کی پوری خبر گیری کرتا رہے گا۔ ایک بار اس نے درویشوں کے ساتھ بڑی فیاضی کی، جس سے اس کے سپاہیوں کو کچھ ناگواری ہوئی، لیکن اس نے ان کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ ان لوگوں کو حق ہے کہ ہماری فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میں تو ان کا ممنون ہوں کہ وہ اسی پر قناعت کر لیتے ہیں، جو اپنے حق کی بنا پر طلب کرتے ہیں، ایک بار ایک امیر نے خراسان کے ایک عالم کی تضحیک کی، تو نور الدین نے اس سے کہا کہ اگر تم ان کی برائی بیان کرو گے، تو میں تم کو سخت سزا دوں گا، گو تم حق بات ہی کیوں نہ کہو، اس عالم میں ایسی خوبیاں ہیں کہ اس کی برائیاں دب کر رہ جاتی ہیں، مگر تم اور تمہارے جیسے لوگوں میں تمہاری برائیاں تمہاری خوبیوں سے بہت زیادہ ہیں۔

نور الدین کو تعمیرات سے بھی بڑا شوق تھا، شام میں زلزلہ آیا، تو اس کے بڑے شہروں کی ازسر نو حصار بندی کرائی، اس نے ہر جگہ مسجدیں بنوائیں، بہت سے شہروں میں اسپتال قائم کیے، ابن اثیر اپنے تنخواہ دار طبیب سے آزردہ ہو کر دمشق پہونچا، وہاں کے اسپتال والوں نے اس کی خدمت کی اور اس نے ان کو کچھ انعام دینا چاہا، تو انھوں نے کہا کہ ہم تو نور الدین سے بھی انعام لینا پسند نہیں کرتے۔

اسلامی فقہ کے مطابق جن کھانوں، مشروبات اور پوشاکوں کی اجازت تھی، وہی نور الدین استعمال کرتا اور اپنی رعایا سے بھی استعمال کراتا، اس کے دربار میں بڑے آداب برتے جاتے، کوئی اس کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا تھا، صرف صلاح الدین کے باپ ایوب کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی، ...... وہ چوگان کھیلا کرتا، یہی اس کی تفریح تھی، مگر وہ کہتا کہ وہ اس تفریح میں اس لیے مشغول رہتا ہے کہ اس سے اس کی سپہ گری بیدار رہتی ہے اور گھوڑوں کی بھی تربیت ہو جاتی ہے، ابن اثیر نے

لکھا ہے کہ اس نے اپنی تفریح میں بھی ریاضت پیدا کر لی تھی۔

نور الدین کی سیرت میں اس کے مذہبی جذبات کو بڑا اثر تھا، ان ہی جذبات کی بنیاد پر وہ عیسائیوں سے برابر جنگ کرتا رہا، ایک بار اس سے کہا گیا کہ اس کے بھائی کی ایک آنکھ اس مقدس جنگ میں جاتی رہی، تو اس نے نہ افسوس کیا اور نہ اپنے بھائی سے ہمدردی کا اظہار کیا، بلکہ یہ کہا کہ اگر میرا بھائی دیکھ سکتا کہ اس کے صلہ میں اس کو بہشت میں کیا ملے گا، تو وہ اپنی دوسری آنکھ کو بھی قربان کرنے کو تیار ہو جاتا، وہ اپنی لڑائی میں اپنے تحفظ کی بھی فکر نہ کرتا، ایک بار اس کے ایک رفیق نے کہا کہ وہ اپنی جان کی فکر نہیں رکھتے، اگر ان کی جان جاتی رہی، تو پھر اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ نور الدین نے جواب دیا، نور الدین کون ہے، وہ کیا ہے، ہمارے ملک اور ہمارے مذہب کا محافظ مجھ سے بہتر موجود ہے اور وہ خدا ہے (ص ۲۳۱-۲۳۰)۔

یہی مصنفین صلاح الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ صلاح الدین کو خراج عقیدت عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں نے پیش کیا ہے۔ تاریخوں اور افسانوں میں اس کا نام اس کے حریف رچرڈ شیر دل کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ہربرٹ والٹیر کا بیان ہے کہ اگر دونوں کی خوبیاں ایک دوسرے میں جمع ہو جاتیں، تو دنیا میں پھر ایسے دو شہزادے کبھی نہیں پیدا ہوتے، جب صلاح الدین مرنے لگا، تو اس نے اپنے علم بردار کو بلا کر کہا کہ تم نے لڑائی میں میرے علم کو برابر ہاتھ میں رکھا، میری وفات کے بعد بھی میرے جنازہ کے علم کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، ایک معمولی چیتھڑے کو ایک نیزہ پر رکھنا اور چلاتے رہنا، دیکھو مشرق کا شہنشاہ اپنے ساتھ دنیا سے صرف کپڑے کا یہ ٹکڑا لے جا سکا۔

اسٹینلی لین پول عماد الدین زنگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے، اتابک زنگی بڑا مردم شناس تھا، اگر کوئی لائق ملازم یا امیر اس کے ہاں ہوتا، تو اسے یقین رہتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کا معتقد ہو جائے گا...... وہ اپنے لشکر میں کسی قسم کے جور و ظلم کو گوارا نہ کرتا تھا، عورتوں کی آبرو ریزی پر جیسی سخت سزا وہ دیتا تھا، اس زمانہ میں کہیں نہ دی جاتی...... جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتا تھا، تو معلوم ہوتا تھا، دو رسیاں تان دی گئی ہیں اور سپاہ ان کے درمیان سے گذر رہی ہے، کسی کو حکم نہ تھا کہ کسی کاشت کار سے وہ ایک تنکا بغیر قیمت دیئے لے سکے ...... جنگ دستوں کی شرح مقرر

کرنے میں نرمی کرتا، مگر دولت مند شہروں سے مصارف جنگ کے لیے کثیر رقمیں وصول کرتا تھا، مگر جس قدر روپے وصول کرتا، اس سے زیادہ کام کر دیتا، اس کی تختی و سیاست کا نتیجہ تھا کہ تمام عمل داری میں امن و خوش حالی کو ترقی رہی۔ (صلاح، ص ۳۹-۳۸)۔

نور الدین کے متعلق رقمطراز ہے کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا، دانش مند اور پکا دین دار تھا، گو عیسائیوں پر وہ بہت سخت تھا، مگر عدل وہ صفت تھی، جس کی قدر و قیمت اس کے دل میں خدا کے بعد تھی، اس کی رعایا میں اسے اگر کوئی شخص قاضی کی عدالت میں طلب کرتا، تو ضرور حاضر ہوتا،...... بیت المال کے روپے کو ہاتھ نہ لگاتا...... اس کی سنجیدہ اور متین آنکھوں کا ''پُرسکوت عالم'' بارعب پیشانی اور گندم رنگ میں ایک گھلاوٹ پیدا کرتا، چہرہ تقریباً بے ریش تھا، اس میں ایک شریف انسان کا انداز، خودداری اور صدق و صفا پایا جاتا تھا، جہاں کہیں وہ ہوتا، خاموشی اور سکوت طاری ہوتا رہتا۔ (ص ۱۱۶-۱۱۵)

لین پول نے تو صلاح الدین پر پوری ایک کتاب ہی لکھ دی، وہ اس کے ہر وصف کو جھوم جھوم کر لکھتا ہے اور بڑی بلند آہنگی سے ایک جگہ تحریر کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل تھا (صلاح الدین ص ۲۰۵)۔

فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی کی وجہ سے صلیبی جنگ کا رخ اسلام کی حمایت میں بدل گیا، وہ ان ہیروؤں کا ہیرو تھا، جن کی انتہا صلاح الدین کی ذات میں ہوئی، وہ اسلام کے کاز کا چمپین تھا، مگر اس کا بیٹا نور الدین اس سے زیادہ لائق ثابت ہوا (ص ۶۳۵-۶۳۴) صلاح الدین کا نام تو مسلمانوں کے محبوب حکم رانوں کی فہرست میں ہارون رشید اور بیبرس کے ساتھ اب تک سرفہرست ہے۔ یورپ میں تو گانے والوں اور ناول نگاروں کے لیے ایک موضوع بنا ہوا ہے اور اب تک بہادری کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ (ص ۶۵۲)۔

صلیبی جنگ کا تجزیہ:

اب تک گذشتہ اوراق میں صلیبی لڑائیوں اور ان سے متعلق اور تمام باتوں کا ذکر یورپ

کے مصنفوں ہی کی روشنی میں کیا گیا ہے، ان کا تجزیہ ان سے الگ ہو کر بھی کرنے کی ضرورت ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں میں ان لڑائیوں میں بڑا مذہبی جوش پیدا ہوا، مگر سوال یہ ہے کہ مذہبیت میں ایمان کی طہارت اور کردار کی پاکیزگی زیادہ تھی، طرفین اور فریقین اپنے دعاوی میں پیش قدمی کر سکتے ہیں، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائی بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے مگر وہ چھین نہ سکے، مسلمانوں کا قبضہ اس پر بدستور سابق رہا، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی سپہ گری اور ایمان کی ولولہ انگیزی میں عیسائیوں سے برتر رہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں صلیبی جنگ کا عہد بہت ہی نازک ترین دور تھا، پوری عیسائی دنیا ان کی اور ان کے مذہب کی بیخ کنی کے لیے امنڈ پڑی تھی، مگر انھوں نے جس پامردی اور نبرد آزمائی سے ان کا مقابلہ کر کے ان کے ارادوں کو ملیامیٹ کیا، وہ ان کی تاریخ کا بہت ہی زریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

عیسائی ان لڑائیوں کو صلیبی کہہ کر مذہبی قرار دیتے رہے، مگر یہ مذہبی اس لیے نہیں کہی جا سکتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی تو یہ تعلیم بتائی جاتی ہے کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے، تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بے گار لے جائے، تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے، تو اس کو اپنا کرتا بھی دے دے، کیا عیسائیوں نے اس تعلیم پر عمل کیا اور اگر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا، تو کیا ان کے راہبوں اور قسیسوں نے ان کو حضرت عیسیٰؑ کی یہ تعلیم بتائی تھی کہ مقدس جہاد کرو۔ تو اپنا خون بہاؤ اور اتنا قتل عام کرو کہ فوجیوں کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں خون میں ڈوبے ہوئے ہوں، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیواروں سے ٹکرا دو اور ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دو، لوگوں کو زندہ جلا دو، عورتوں کے جسم کو ریزہ ریزہ کر دو، ان کی لاشوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے ڈھیر لگا دو۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ مضمون کریسیڈ گیارہواں اڈیشن)

یورپ کے مستشرقین جب مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ لکھتے ہیں، تو اس کو قصائی کی دوکان بنا دیتے ہیں، مگر کبھی جادو سر پر چڑھ کر بھی بولتا ہے۔ خود یوروپی مصنفوں نے اس جنگ میں عیسائیوں کے جو غیر روادارانہ مظالم بیان کیے ہیں، ان کی تفصیل گذشتہ اوراق میں آ چکی ہے، اس سے انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ لین پول کو لکھنا پڑا کہ صلیبیوں نے بیت المقدس میں

داخل ہو کر جو قتل عام کیا، اس سے تنگی دنیا کی عزت میں بٹہ لگا ہے۔ (صلاح الدین ص ۲۰۴) اور آج بھی ان کی لڑائیوں سے تنگی دنیا کی عزت میں بٹہ لگ رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہیروشما اور ویٹ نام میں انھوں نے جو ہولناکیاں کیں، ان سے چنگیز خان اور ہلاکو کی سفاکیاں بھی ماند پڑ گئیں، انھوں نے ان لڑائیوں میں جو کچھ کیا، کیا وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔

اور اگر صلیبیوں نے یہ مقدس لڑائیاں اس لیے لڑیں کہ بیت المقدس ان ہی کی اصل عبادت گاہ ہے، وہ اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتے ہیں، تو پھر اسی سرزمین میں ان کی لڑائیاں محدود ہوئیں، مگر ریجی نالڈ نے تو جزیرۃ العرب کی طرف بھی فوج کشی کی کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو منہدم کر دیا جائے، صرف اس واقعہ سے یہ نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ صلیبی جنگ بیت المقدس کے لیے نہ تھی، بلکہ اسلام کو اس روئے زمین سے مٹا دینے کی کوشش تھی، اس مذہبی جنون میں پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف دو سو سال تک مبتلا رہا، اس سے بڑھ کر غیر رواداری، عداوت اور تعصب کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اور اگر یہ واقعی مقدس جہاد اس لیے تھا کہ حضرت عیسیٰ جہاں پیدا ہوئے اور جہاں سولی پر چڑھائے گئے، اس لیے اس پر قبضہ عیسائیوں ہی کا ہونا چاہیے تھا، تو آج بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا تسلط ہے۔ یورپ میں پوپ، قسیس اور راہب کیوں نہیں، اس کا اعلان کرتے کہ یورپ کے تمام عیسائی سرخ کپڑے کی صلیب اپنے سینوں پر لگا کر اور اپنی ساری چیزیں لٹا کر بیت المقدس کی طرف کوچ کریں اور اس کو اسرائیلیوں کے ناپاک وجود سے آزاد کر کے پاک کریں۔ اربن، پیٹروی، ہرمٹ، ریجی نالڈ، فلپ، آگسٹس، فریڈرک، باربروسا، رچرڈ شیر دل اور سینٹ لوئی، جیسے فدائیان عیسائیت پیدا ہو کر کیوں نہیں آگے بڑھتے، آہن پوش جوان اور جنگی بیڑے اس کی ناپاکی کو دور کرنے کے لیے کیوں نہیں بھیجے جاتے اور موجودہ پوپ کی طرف سے یہ اعلان کیوں نہیں ہوتا کہ جو شخص بیت المقدس کی طرف کوچ کرنے میں صلیب نہیں اٹھائے گا، وہ میرا پیرو نہیں ہے، مگر اسرائیلیوں سے یہ مذہبی لڑائی لڑنے کے بجائے ان کی اسلام دشمنی یہ کام کر رہی ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں ایسی پیچیدگی اور زبوں حالی پیدا کر دی جائے کہ وہ کسی طرح پنپنے نہ پائیں، جیسا کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں ان کی کوشش رہی۔

اب ذرا اس جنگ میں بعض مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں پر بھی تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام مسلمانوں میں وصل نہ کہ فصل کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم ہے کہ مسلمان باہمی عصبیت کا شکار نہ ہوں (مائدہ ۲۰۔ نساء ۱۴۲) وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (حجرات - ۷) مگر کیا ان صلیبی لڑائیوں میں تمام مسلمانوں نے یہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ یورپ کی سامراجیت کی جارحیت ان پر اس لیے ہوئی کہ وہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ کر مجموعی حیثیت سے کمزور تھے، ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صلیبی ان پر ٹوٹ پڑے، اس نازک موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیے تھا، مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ جب متحدہ یورپ کا زبردست حملہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے ہو رہا تھا، تو شام اور اس کے آس پاس، ربیعہ موصل، حلب، بوازیج نصیبین، بخارا، حابور، دمشق، حماۃ، حمص اور حران وغیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی حکومتیں علیحدہ رہ کر مسلمانوں کی قوت کو کمزور کر رہی تھیں۔ عماد الدین، نور الدین اور صلاح الدین نے ان کو ملا کر متحد کرنے کی کوشش کی، مگر اسلامی حمیت اور دینی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے بعض حکومتیں اپنی خودغرضی اور مفاد پرستی کی بنیاد پر صلیبیوں سے مل جاتیں۔ معین الدین آنر، سیف الدین، اس کے جانشین عزالدین اس کے چچازاد بھائی عماد الدین اور دمشق کے امراء نے ان سرفروش اور جانباز سلاطین کے خلاف صلیبیوں سے مل کر اپنی خیر تو کچھ دن منائی، مگر اس طرح اسلام سے غداری کی۔

عماد الدین، نور الدین اور صلاح الدین کے کارناموں سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر مسلمان متحد ہوں، ان میں ایمان پروری، دینی حمیت اور ملی غیرت ہو اور پھر ان کے قائدین میں سیرت کی طہارت ہو، کردار کی بلندی ہو، سیاسی بصیرت ہو، جنگی قیادت کی ہوش مندی ہو، تو وہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا کر فاتح، کامراں اور سرخرو ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہی اثرات اس وقت کے یورپ کے فرمانرواؤں پر مرتب ہوئے اور وہ ان سے مرعوب رہے۔

مگر دکھ کی بات تو یہ ہے کہ صلاح الدین نے مسلمانوں کی جو اجتماعی قوت پیدا کی، اس کے جانشین باقی نہ رکھ سکے، رفتہ رفتہ سلجوقی اور ایوبی خاندان ختم ہوئے، مگر اس گہرے بادل کے پیچھے سیمیں لکیریں اس طرح نظر آئیں کہ ان ہی کے کھنڈروں پر دولت عثمانیہ قائم ہوئی، جس کے حکمرانوں نے سرویا، بوسینا، بلغاریہ، والاچیا، ہنگری، پولینڈ، فرانس اور روس سے ٹکرا کر ایک ٹرکش امپائر

بنالیا، جس کے علاقے یورپ میں تھریس، مقدونیہ، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، ہنگری، بلغراڈ اور کریمیا، اور پھر ایشیا میں مصر، شام، عراق اور حجاز تک پھیلے ہوتے تھے۔ سلطان محمد فاتح نے تو قسطنطنیہ فتح کرکے بازنطینی امپائر کی بنیاد ہلادی۔ سلطان سلیمان اعظم کے نام سے تو یورپ کی سلطنتیں لرزتی تھیں۔ سلطان سلیم ثالث نے تو فرانس کے نپولین اعظم سے بھی ٹکر لی۔ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں عثمان پاشا نے روس سے ایسی بہادرانہ جنگ کی کہ وہ شیر پلونا کہلائے، ان کارناموں سے مسلمانوں کا سر پھر اونچا ہوا، لیکن ان کے اندر بھی اختلافات پیدا ہوتے رہے، سلاطین معزول اور قتل کیے گئے۔ نادر شاہ نے اس پر حملہ کرکے اس کو کمزور کیا۔ مصر کی ماتحت ریاست ذوالقدریہ نے اس سے سرکشی کی، ان مسلمانوں نے صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کے اپنے اختلافات کے برے اور ہولناک نتائج سے عبرت حاصل نہیں کی، اسی لیے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے ان کے ساتھ وہی کیا، جو صلیبی جنگ کے آغاز میں کیا تھا، انھوں نے مسلمانوں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا، ان سے جنگ کرکے انگریزوں نے قبرص پر قبضہ کرلیا، مصر کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا۔ سوڈان پر لارڈ کچنر کا قبضہ ہوگیا۔ طرابلس، اٹلی کے زیرنگیں ہوگیا، پھر یورپ کے سامراجیوں نے بلقان کی جنگ چھیڑ کر ترکوں کے یوروپی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور جب ترکوں نے پہلی جنگِ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دیا، تو ان کی شکست کے بعد حجاز، عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے لے لیا۔ شام فرانس کے قبضہ میں آگیا۔ ایشیائے کوچک روس کو ملا۔ قسطنطنیہ اور آبنائے فاسفورس سب کی مشترکہ ملکیت میں آگئے۔ سلطان عبدالحمید کی خلافت ختم کردی گئی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، ٹرکش امپائر سے عربوں کو جدا کرکے ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنائیں، تاکہ ان کی قوتیں مجتمع نہ ہوسکیں، نجد، حجاز، یمن، عسیر، لحج، امارات نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام، مصر، مراکش اور سوڈان کی حکومتیں بنیں، مگر ان پر یورپ کی سامراجی قوتیں چھائی رہیں، ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی، تو یہ یورپین سامراجیت سے آزاد ضرور ہوئیں، مگر فرنگی میکاولیوں نے عراق کو اردن سے کاٹ دیا۔ یمن کے دو ٹکڑے کردیے۔ لبنان کو عیسائیوں اور عربوں کے لیے وجہ تنازعہ بنادیا۔ فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کرادی اور بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرادیا، صلیبی جنگ میں اپنی شکست کا بدلہ ۸۳۳ برس کے بعد لیا۔

یہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صلیبی اور اس قسم کی لڑائیوں سے سبق حاصل کرنے کے بجائے عرب مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلیوں سے برسرِ پیکار تو ضرور ہیں، مگر وہ وہی تاریخ دہرا رہے ہیں، جو صلیبی لڑائیوں کے موقع پر اس زمانہ کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی بے وفائی سے عمل میں آئی۔ جس طرح صلیبیوں نے مسلمانوں کے نفاق اور اختلاف سے فائدہ اٹھایا، وہی فائدہ اسرائیلی اور یورپ کی سامراجی حکومتیں عربوں کے باہمی نفاق سے اٹھا رہی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں عربوں کی شرمناک شکست کی بڑی وجہ اُن کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی اور جھوٹے معیار کے سامنے سپر اندازی کے ساتھ ان کی سیاسی ابن الوقتی، علاقائی مفاد پرستی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے حکم رانوں کی خود غرضی بھی تھی۔ انھوں نے صلیبی محاربات پر مسلمانوں کی کامرانی اور کامیابی پر پانی پھیر دیا۔

عربوں اور مسلمانوں نے اپنے قبلۂ اوّل بیت المقدس کو ۸۳۳ برس کے بعد اس لیے کھویا کہ ان کو خدا ترسی، ایمان پروری، زبان، دل اور عمل کی سچائی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی، انسان دوستی، عبادت، ریاضت اور موّدت کی جو تعلیم دی گئی تھی، ان سب سے دور ہو کر نسلی اور علاقائی امتیازات اور باہمی تعصبات کے رذائل میں مبتلا ہوئے، تو گرے اور گرتے چلے گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے یہ عملی نمونہ پیش کیا تھا کہ وہ رات کو راہب اور دن کو شہسوار بن کر یورپ کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہے، اپنی سیرت کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، ایمان کی طہارت سے اس نے جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنے کا جو درس دیا تھا، اس کو مسلمان بھول گئے اور اس وقت یورپ کی سامراجی قوتوں کے سامنے راکھ کے ڈھیر بنے ہوئے ہیں، عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی کی روحیں ان کو پیام دے رہی ہیں کہ وہ اب بھی یورپ کی نگاہوں میں راز کن فکان، معمارِ جہاں، آخری نبوت کے ارمغان اور ایشیا کے پاسبان ہو سکتے ہیں، اگر وہ متحد ہو کر اسلامی اور ملی زندگی بسر کرنا سیکھیں۔

مئی-جون ۱۹۸۹ء

maablib.org

پارچہ بافی کی صنعت

ہندوستان میں روئی ہر زمانہ میں بکثرت پیدا ہوتی رہی ہے۔ ریشم اور اون کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس لیے اس ملک میں ہر عہد میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی رہی۔

سلاطین دہلی کے عہد کی مصنوعات:

سلاطین دہلی کے عہد میں بنگال، دکن، گجرات اور ملتان اعلیٰ قسم کی پارچہ بافی کے لیے مشہور تھے، ناصر الدین بغرا اپنے بیٹے معز الدین کیقباد کی ملاقات کے لیے اودھ آیا، تو اپنے ساتھ تحفے کے طور پر بنگال سے طرح طرح کی حریر، پرنیاں اور زربفت کی پوشاک لایا، ان میں بعض ہندوستانی کپڑے اتنے باریک تھے کہ پہننے پر جسم نظر آتا تھا اور بعض کپڑے ایسے بھی تھے، جن کو لپیٹا جاتا، تو انگلیوں کے ناخن میں آ جاتے اور کھولا جاتا، تو بہت بڑا تھان ہو جاتا۔[1]

دکن میں دیوگیر اور مہادیونگری بھی پارچہ بافی کی صنعت کے بہت بڑے مرکز تھے، یہاں کے کپڑوں میں بڑی نفاست اور لطافت ہوتی تھی، امیر خسرو نے اپنے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے کہ یہ گلاب اور لالہ کی طرح دیدہ زیب ہوتے ہیں، بعض اتنے مہین ہوتے کہ سوئی کے ناکے میں سما جاتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ اتنے گف ہوتے کہ سوئی بھی مشکل سے اس کے اندر جاتی، بعض کپڑے اپنی لطافت کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے تھے، اس میں شاعرانہ مبالغہ کو بھی دخل ہے، لیکن اس سے صنعت کی ترقی و خوبی کا بہر حال پتہ چلتا ہے۔ سلطان کیقباد کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو لکھتے ہیں، اس میں اطلس، زربفت اور یاقوت کے پردے دیواروں میں اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ دیوار کے پتھر بھی یاقوتی رنگ کے معلوم ہوتے تھے، فرش میں بھی موتی اور سونے

---

[1] قران السعدین، ص ۱۳۲

کا کام ہوتا تھا۔

بعض عمدہ کپڑوں کے نام یہ تھے، بیرامیہ، سلاحیہ، شیریں، کتان، رومی، سراج، قباب ان کپڑوں کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

دہلی کپڑوں کی بہت بڑی منڈی تھی علاؤ الدین خلجی نے اپنے زمانے میں جب تمام چیزوں پر کنٹرول کیا، تو کپڑوں کی قیمت بھی مقرر کی، اس نے حکم دے دیا تھا کہ تمام کپڑے سرائے عدل کے علاوہ کہیں اور فروخت نہ کئے جائیں، یہ سرائے بدایوں دروازہ کے پاس تھی، موٹا کپڑا مثلاً کرپاس ایک تنکہ میں بیں گز اور اس سے بھی کمتر درجہ کا کپڑا ایک تنکہ میں چالیس گز ملا کرتا تھا، پلنگ کی چادر دس جیتل میں مل جاتی تھی، عمدہ کپڑے مثلاً شیریں بافت کی تین قسمیں تھیں، سب سے عمدہ کی قیمت پانچ تنکے فی گز اوسط کی تین تنکے فی گز اور ادنیٰ کی دو تنکے فی گز تھی عام طور سے مہین سوت کے کپڑے تین تنکے فی گز ملا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے بیس لاکھ تنکے متمول سوداگروں کو قرض دیے گئے تھے کہ وہ باہر سے عمدہ کپڑے منگوا کر فروخت کریں۔ عوام اور خواص کے کپڑوں کی تفریق کر دی گئی تھی اور نفیس قسم کے کپڑوں کی قیمت کو قابو میں رکھنے کے لیے حکم جاری کیا گیا تھا کہ ریشمی ساٹن اور کم خواب وغیرہ کی خریداری بازار کے شحنہ سے پروانہ لے کر کی جائے، ضیاء الدین برنی نے اچھے اور عمدہ کپڑوں کے نام یہ لکھے ہیں: تسبیح، تبریزی، زربفت، زرنگار، خزہائے دہلی (دہلی کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے) کمخواب، ششتری، حریری، چینی، بھرم، دیوگیری، خزکوتلہ، مشروع شعری مہین، استرلعل ناگوری، شیریں بافت اور سلاہتی۔ ؎۱

مسالک الابصار میں ہے کہ محمد بن تغلق کے عہد میں شاہی کارخانہ میں چار ہزار پارچہ باف، ریشم اور دوسرے قسم کے کپڑے تیار کرتے تھے۔ محمد تغلق سال میں دوبار موسم بہار اور خزاں میں دو لاکھ خلعت تقسیم کیا کرتا تھا، موسم بہار میں خلعت کے کپڑے اسکندریہ سے آتے تھے، خزاں کے موسم میں دہلی کے تیار کردہ کپڑوں کے علاوہ چین اور عراق سے بھی منگوائے

؎۱ برنی، ص ۳۱۱

جاتے تھے۔ محمد تغلق کے کارخانہ میں چار ہزار صناع صرف زری کا کام کرتے تھے، جو شاہی حرم کی بیگمات اور امرا کے خلعت کے کپڑے تیار کرتے۔ شاہی ضروریات کی جتنی چیزیں ہوتیں مثلاً کلاہ، جوتے، پردے، غلاف، کمر بند، پنکھے اور زین وغیرہ کارخانے ہی میں تیار ہوتے، تحفے کے لیے عمدہ ململ اور دوسری چیزیں بھی تیار ہوتیں، (مسالک الابصار فی ممالک الامصار، انگریزی ترجمہ، علی گڑھ اڈیشن ص ۳۰-۲۹)

مسالک الابصار کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ ہندوستان میں عام طور سے سفید لباس پہنا جاتا تھا، مگر شاہی ملازمین تاتاری ملکوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، جن پر سنہرا کام ہوتا تھا، بعض امیر لوگوں کے لباس میں صرف آستینوں پر کام ہوتا اور بعض کے لباس میں مغلوں کی طرح پیٹھ پر اور اگلے کے چاروں طرف چوڑا چوڑا زردوزی کا کام ہوتا، گلے پر جو کام کیا جاتا، وہ جواہرات سے مرصع ہوتا تھا اور اس میں یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے۔

محمد تغلق کی بہن کی شادی امیر سیف الدین سے ہوئی، تو امیر سیف الدین کو جو کپڑے دیے گئے تھے، اس کے بارہ میں ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ نیلے ریشم پر اتنے جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا اور ایسی ہی کلاہ تھی، ایسی پوشاک میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی، (ص ۱۳۳)۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ریشم کے زریں خلعت پر جس کو شیر صورت کہتے تھے، شیر کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ (سفرنامہ اردو، ص ۲۱۷)

فتوحات فیروز شاہی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس میں مغرق زردوزی کا عام رواج تھا۔ جس میں تصویریں اور نقش و نگار ہوتے تھے، اس لیے فیروز شاہ نے اس کی ممانعت کرادی تھی کیوں کہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ (فتوحات فیروز شاہی ص ۱۴)

شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ فیروز شاہی عہد میں عید کے روز دربار کے گدے ریشم کے ہوتے اور بعض زربفت کے اور بعض پر نقرئی و طلائی کام ہوتا تھا، بعض گدے سفید کپڑے

کے بنائے جاتے تھے، دیواروں پر زینہ لپیٹے جاتے تھے، اس روز مطرب زعفرانی لباس پہن کر آتے، ان کی دستار سرخ ہوتی اور ان کی ساری پوشاک مرصع اور مکلل ہوتی۔ عفیف کا بیان ہے کہ یہ لباس اس قدر قیمتی ہوتا کہ ایک شخص کے لباس کی قیمت چالیس ہزار تنکے ہوتی تھی (عفیف ۳۶۳)۔

لباس کے علاوہ مختلف قسم کے فرش فروش ہوتے، سلطان فیروز شاہ فرش پر دو لاکھ تنکے خرچ کیا کرتا تھا۔ (عفیف، ص ۳۳۷)

عہد مغلیہ کی پارچہ بافی:

مغلوں کے عہد میں پارچہ بافی کو بڑا فروغ ہوا، پھر بھی بعض اعلیٰ قسم کے کپڑے ہندوستان میں نہیں تیار ہوتے تھے، ان کے لیے صناع اور کاری گر باہر سے بلوائے گئے، آئین اکبری میں ہے۔

> "جہاں پناہ (اکبر) کی توجہ سے طرح طرح کی صنعت نے رواج پایا اور ایرانی فرنگی، خطائی صنائع وسامان بکثرت میسر آنے لگے، ہر ملک سے کارپرداز، استاد اور بے مثل ہنرمند ہندوستان میں وارد ہوئے اور اہل ہند جوق جوق ان کے گرد جمع ہو کر مختلف صنعتیں سیکھنے لگے، دارالحکومت لاہور، آگرہ، فتح پور، احمد آباد اور گجرات میں عجیب وغریب صناعیاں نمودار ہوئیں اور انواع واقسام کے نقش و نگار عجائب روزگار بیل بوٹے، کاڑھے اور بنائے گئے، جن کو دیکھ کر جہاں نورد سیاح عالم حیرت میں مبتلا ہو گئے۔" (آئین ۳۲)

زربفت:

زربفت زیادہ تر باہر سے آتا، اگرچہ گجرات اور لاہور میں بھی بنا جاتا تھا، باہر سے آئے ہوئے زربفت کی قسمیں یہ تھیں۔

یزدی، فرنگی، کاشی، ہروی، برسر، مطبق، میلک

مخمل:

مخمل بھی لاہور اور گجرات میں تیار ہوتا، لیکن بیرونی مخمل کی قسمیں یہ تھیں:

فرنگی، کاشی، یزدی، مشہدی، ہروی، خانی، قطیفہ، پوپی، تاجہ باف، مطبق، شروانی، میلک، کخواب ولایتی، تواار، جوری۔

طاس:

طاس گجرات میں بھی تیار ہوتا تھا، بیرونی طاس میں وارائی باف، منقش شروانی مشہور تھے۔

مشجر:

مشجر ہندوستان میں نہیں بنا جاتا تھا اور عام طور سے مشجر فرنگی اور مشجر یزدی رائج تھے۔

دیبا:

دیبا کی صنعت بھی ہندوستان میں نہ تھی اور وہ یزداد اور فرنگ سے آتا تھا۔

اطلس:

اطلس بھی باہر ہی سے آتی، اطلس فرنگی، اطلس یزدی، اطلس خطائی کے نام بار بار آتے ہیں۔

زری کے کپڑے:

دوسرے زری کے کپڑوں کے نام یہ تھے۔ خارا، توار خانی، خز، تفضیلیہ (مکہ معظمہ سے آتا تھا)، نیم زری۔ موج دریا۔

maablib.org

ریشمی کپڑوں کے نام یہ تھے:

خارا، قطنی، کتان فرنگی، تافتہ، اتبری، وارائی، ستی پوری، قبابند، ٹاٹ بند، مصری، ساز،

تسر، آلچہ، کپور نور، مشروع، گلبدن، سنگی ان میں بعض کپڑے تو باہر سے منگوائے جاتے اور بعض یہیں تیار ہوتے۔

سوتی کپڑے:

سوتی کپڑوں کی قسمیں یہ تھیں:

خاصہ، چوتار، ململ، تن سکھ، سری صاف، گنگا جل، بھیروں، سن، جھونہ، آ تان، آ سادلی، بافتہ، محمودی، پنج تولیہ، سالو، گربہ سوتی، ڈوریہ، بہادر شاہی، سیلہ دکھنی، مہر گل، آب رواں، تنزیب، جامدانی، رسی، نکانی، احرام، سوم وغیرہ یہ سارے کپڑے ہندوستان ہی میں تیار ہوتے۔

پشمینے:

پشمینے کی قسمیں یہ تھیں:

سقرلاط فرنگی، رومی و پرتگالی، ہندوستان میں سقرلاط ناگور اور لاہور میں بھی تیار ہوتا صوف مربع، صوف مشجر، پرم، نرم اعزی، پرم گرم، کتاس، پھوک، ورمہ، پٹو، ریوکار، مصری، بردیمانی۔

احمد آباد کی صنعت:

پارچہ بافی میں سب سے زیادہ نمایاں نام احمد آباد کا ہے، جو گجرات کا علاقہ ہے گجرات شروع سے پارچہ بافی میں مشہور تھا۔ تیسری صدی ہجری میں ایک عرب سلیمان تاجر نے لکھا ہے کہ ''اس ملک سے اچھے کپڑے کہیں اور نہیں ہوتے، سوتی کپڑے اتنے نفیس اور باریک ہوتے ہیں کہ انگوٹھی کے حلقہ میں آسانی سے سما جاتے ہیں، اس طرح کے بعض کپڑے ہم نے خود نہیں دیکھے۔''

گجرات کے حکمران محمود شاہ اول کے زمانے میں احمد آباد میں اس صنعت کی بڑی ترقی ہوئی۔ مرات احمدی کے مصنف کا بیان ہے کہ اس عہد میں یہاں کم خواب، قسطی، مخمل، چکن کارچوب کا کام بہت عمدہ قسم کا ہوتا تھا اور یہاں کے کاری گروں کے نام ایران، توران، روم اور

شام تک مشہور تھے (جلد دوم ص ۵-۴) خلاصۃ التواریخ کا مصنف سجان رائے بھی لکھتا ہے کہ "احمد آباد میں زری کے چیرہ، فوطہ، جامہ دار، مخمل، زربفت، خارا وغیرہ بہت اچھے تیار ہوتے تھے اور روم، فرنگ اور ایران کے کاری گروں کی تقلید کی جاتی۔ قسلمی تو بہت عمدہ تیار ہوتی۔ لوگ اس کو تحفہ کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لے جاتے۔" (خلاصۃ التواریخ ذکر گجرات)۔

مخمل، زربفت اور کلابتوں کے کام کے بڑے بڑے خیمے بھی یہاں تیار ہوتے۔ شاہ جہانی دور میں مخمل اور زربفت کا ایک خیمہ ایک لاکھ روپے میں تیار ہوا تھا [1] مخمل اور زربفت کے جو سائبان بنائے جاتے، ان کے ستون طلائی اور نقرائی ہوتے، شاہجہانی دور میں مخمل، زربفت اور کلابتوں کی ایک بارگاہ تیار ہوئی تھی، جس کا طول ۴۳ ذرع اور عرض ۳۲ ذرع تھا، اس میں پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے (مرات احمدی جلد اول ص ۱۷۱) اورنگ زیب کو یہ تکلفات پسند نہ تھے، پھر بھی احمد آباد کو وہ ہندوستان کی زیب و زینت کہا کرتا تھا، (مرات احمدی جلد اول، ص ۱۷۱) شاہ عالم نے احمد آباد ہی میں تخت کے اوپر لگانے کے لیے چار ستارہ دار مخمل کا شامیانہ تیار کرایا تھا، جس میں ۶۵ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔

احمد آباد میں کپڑوں پر سونے چاندی کا کام بھی اعلیٰ قسم کا ہوتا تھا، یہاں رنگے ہوئے سوتی کپڑے، دھوتیاں اور بافتے بھی مشہور تھے۔

سورت اور بھروچ میں زری کے چیرہ، جامہ دار، مخمل اور زربفت اچھے بنتے تھے بھروچ کے بافتے اور اچاپ بھی مشہور تھے، احمد نگر میں کپڑے اچھے رنگے جاتے تھے۔

سولہویں صدی کے سیاح باربوسہ کا بیان ہے کہ کھمبائت میں عمدہ اور موٹے کپڑوں کے علاوہ چھینٹ، کمخواب، ساٹن، ریشم، کتان، اور قالین وغیرہ سے تیار ہوتے۔

بنگال کی صنعت:

پندرہویں صدی کے بیرونی سیاحوں نے بنگال کی پارچہ بافی کی بڑی تعریف کی ہے

[1] بادشاہ نامہ، جلد اول حصہ دوم، ص ۸۵

maablib.org

مثلاً: ماہوان نے بنگال کے پانچ چھ قسم کے عمدہ ململ، زری کی ٹوپیوں اور ریشمی رومالوں کا ذکر کیا ہے، سولہویں صدی کا سیاح دار تھا تو یہاں تک بیان کرتا ہے کہ بنگال میں جتنے سوتی کپڑے ہوتے ہیں۔ اتنے کسی اور ملک میں پائے نہیں جاتے، اس نے کپڑوں کے جو اقسام لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: بیرام، نسوتے، ملذاتی، کین تار، دوزار، سینہ باف، ایک اور سیاح باربوسہ لکھتا ہے کہ شاش یعنی پٹکے کی ایک قسم سرہند بنگال میں تیار ہوتی ہے، جس کو یورپ کی عورتیں سر میں باندھنے کے لیے بہت پسند کرتی ہیں۔ ایرانی اور عرب اس کی پگڑی بناتے ہیں، عرب تاجر سینہ باف بکثرت لے جاتے ہیں، جس سے وہاں کے لوگ کرتے بناتے ہیں۔

سترہویں صدی کے مشہور فرانسیسی سیاح برنیر نے لکھا ہے کہ بنگال میں کپڑا نہایت عمدہ تیار ہوتا ہے اور انگریز اور پرتگالی اس کی تجارت خاص طور پر کرتے، ڈچ یہاں کا کپڑا جاپان اور یورپ تک بھیجتے۔

جمس ٹیلر نے اپنی کتاب ٹوپوگرافی اینڈ اسٹیٹکس آف ڈھاکہ میں لکھا ہے کہ ڈھاکہ میں ۳۶ قسم کے سوتی کپڑے تیار ہوتے تھے اور جہانگیر کے زمانے میں ململ کی بعض قسمیں ایسی بھی بنی جاتی تھیں، جو پندرہ گز لمبی اور ایک گز چوڑی ہوتی تھیں، لیکن ان کا وزن نو گرین سے زیادہ نہ ہوتا تھا، بعض قسم کی ململ کا ایک تھان دیا سلائی کے بکس کے اندر آ جاتا تھا، اس کی صنعتی خوبی کی وجہ سے ایک ایک تھان کی قیمت جہانگیری عہد میں چار چار سو روپے ہوتی تھی۔ ڈھاکہ میں جامدانی بھی اچھی تیار ہوتی تھی، چنانچہ اورنگ زیب کے لیے جامدانی کا ایک تھان ۱۳۵ روپے میں تیار ہوا تھا۔

بنگال میں عام استعمال کے لیے دھوتیاں اور ساریاں تیار کی جاتیں، ان کی بہت سی قسمیں تھیں، ململ کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی، جس میں ریشم اور سوت دونوں ملا ہوتا اور ان کے کناروں پر کبھی زری کا کام بھی ہوتا، لوگ شوخ رنگ کو زیادہ پسند کرتے تھے، اس لیے ساریوں کا کنارہ زیادہ تر رنگین ہوتا تھا، لحاف کی فردوں، مسہری کے پردوں اور دوسری قسم کے ریشمی اور سوتی کپڑوں پر بھی رنگین تحریریں ہوتیں۔

بنگال میں ریشم کے کپڑے بکثرت بنے جاتے تھے، اس لیے یہاں ۲۵ لاکھ پونڈ سالانہ خام ریشم تیار ہوتا تھا، دس لاکھ پونڈ کی کھپت مقامی طور پر ہو جاتی، تین لاکھ پونڈ ڈچ لے جاتے، بقیہ احمد آباد چلا جاتا، قاسم بازار میں اچھے ریشمی کپڑے تیار ہوتے تھے، بعض قالین ریشم اور سوت کے تار سے بنائے جاتے تھے، بعض میں چاندی کا تار بھی ہوتا، برنیر نے لکھا ہے کہ قاسم بازار میں ڈچ کارخانے میں سات سات اور آٹھ آٹھ سو آدمی کام کرتے تھے۔

ریشم کپڑوں سے تیار کیا جاتا تھا، یہ کپڑے دو قسم کے ہوتے تھے، ایک دیسی، دوسرے فصلی، موخر الذکر اطالیہ اور چین سے لائے جاتے تھے، جن سے بہت باریک ریشم نکالا جاتا تھا، یہ کپڑے ۳ فٹ کے بلند شہتوت کے درخت میں ہوتے تھے، جو قطار میں چھ یا آٹھ انچ کے فاصلے پر بوئے جاتے تھے، ان درختوں کے بونے کے چار مہینے کے بعد ان کے سارے پتے چن لیے جاتے اور ان کی جگہ پر آٹھ یا دس پتیوں میں نئے پتے نکل آتے پہلے سال چار مرتبہ پتے چنے جاتے، دوسرے سال چھ مرتبہ ان پتوں پر کرم پیلہ یعنی ریشم کے کیڑے سال میں چار دفعہ بچے دیتے اور فصلی کرم پیلہ صرف ایک دفعہ، ان ہی سے ریشم کا تار نکالا جاتا ہے[1]۔

لاہور کی صنعت:

لاہور میں بہت سے بیرونی کاریگر آ کر جمع ہو گئے تھے، جس سے پارچہ بافی کی صنعت کو بڑا فروغ ہوا، خلاصۃ التواریخ میں لاہور کے متعلق ہے۔

"گونا گوں ہنر پیشگان ہر دیار و ہر گونہ صنعت
گران روزگار سکونت دارند"

لاہور کے پڑوسی قصبوں میں بھی اعلیٰ درجہ کی پارچہ بافی ہوتی تھی۔ ضلع ہوشیار پور کے قصبہ بجوارہ میں سری صاف، ادھار، ڈوریہ، پنج تولیہ، جھونہ، چہرہ سفید، طلادار فوطہ، چھینٹ اور بادلہ کا کام بہت عمدہ ہوتا تھا، سیالکوٹ میں بھی ریشم اور کلابتوں کا کام ہوتا تھا، خصوصاً چیرہ،

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو ہندوستان کی معاشی تاریخ از آر سی دت۔ اردو ترجمہ جلد اول، ص ۳۱۹۔

سوزنی دسترخوان، خوان پوش اور راوٹی بہت اچھی تیار ہوتی تھی اور تقریباً ایک لاکھ روپے کا چکن کا کام ہوتا تھا۔

ملتان کے پھول دار قالین، شطرنجی اور چھینٹ مشہور تھی، شاہجہان نے مسجد نبویؐ کے لیے جو محراب دار اونی جانماز تیار کرائی تھی، وہ ملتان ہی کے کارخانہ میں تیار ہوئی تھی (مرات احمدی جلد اول، ص ۲۳۵)

ساماں:

ساماں میں ایک عمدہ قسم کا کپڑا تیار ہوتا، جو ساما نی کہلاتا، فرنگی اس کو سپانو کہتے تھے۔

اودھ کی مصنوعات:

بنارس میں جھونہ اور مہر گل بہت اچھے تیار ہوتے تھے، یہاں کی ساریوں کی شہرت ہمیشہ رہی، جونپور کے قالین مشہور تھے اور بھدوئی ضلع بنارس میں اب بھی یہ صنعت باقی ہے، دریابادی چھپے ہوئے کپڑے عام طور سے پسند کیے جاتے تھے۔ یہ کپڑا دریاباد ضلع بارہ بنکی میں تیار ہوتا تھا، اسی طرح کے کپڑے خیرآباد میں بنے جاتے تھے، جو خیرابادی کہلاتے، اکبری، مرقلی اودھ میں تیار ہوتا، اکبری کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ اکبر کا کوئی پسند کردہ کپڑا تھا، جو فیض آباد کے قریب جلال پور کے نواح میں بنا جاتا تھا، مرقلی مغربی اودھ میں تیار ہوتا تھا، سترہویں صدی میں دریابادی اور مرقلی انگلستان میں بہت مقبول تھے [۱] آگرہ میں دریاں اور قالین بہت اچھے تیار ہوتے تھے یہاں کارچوبی کا کام بھی نہایت عمدہ ہوتا تھا۔[۲]

گولکنڈہ، برہانپور:

گولکنڈہ، سرونج، اور برہانپور میں چھینٹ اچھی تیار ہوتی تھی، شیریں باف ململ کی ایک قسم تھی، جس کے لیے دکن مشہور تھا۔

---

[۱] مورلینڈ جلد دوم ص ۱۸۵ [۲] خلاصۃ التواریخ ذکر احمد آباد

مالوہ:

مالوہ میں ایک سوتی کپڑا دودامی بنا جاتا تھا۔ شاہجہانی دور میں اس کی نفاست میں بہت اضافہ ہوا، یہاں کے بوٹے دار اور رنگین جامہ دار کی بڑی مانگ تھی، اس کے ایک تھان کی قیمت اسی روپے ہوتی تھی۔ سادہ جامہ دار کی قیمت ۴۰ روپے تھی۔ یہاں ایک سفید کپڑا بھی تیار ہوتا تھا، جس کی نفاست کا مقابلہ بقول مولف بادشاہ نامہ کوئی اور کپڑا نہ کرسکتا تھا۔ شاہجہاں گرمیوں میں اس کو استعمال کرتا تھا۔[1]

جے پور:

محمد شاہ کے عہد میں راجہ جے سنگھ نے جے پور میں احمد آباد ہی کی طرح کے کارخانے قائم کیے اور احمد آباد کے پارچہ بافوں کے بڑے بڑے انعامات اور لالچ دلا کر جے پور بلایا، لیکن جے پور کی آب و ہوا اس صنعت کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئی۔ (مرات احمدی جلد دوم ص ۵)

شال بافی:

عہد اکبری میں شال کی صنعت کو ترقی دینے پر زیادہ توجہ کی گئی، پہلے شال سادہ بنتی تھی لیکن اس عہد میں کامدار شالوں کے علاوہ زردوزی، کلابتونی، کشیدہ، قلغہ، باندھنوں، چھینٹ، وایچہ و پرزدار وغیرہ کی قسموں کا بھی اضافہ ہوا، پہلے شالوں کو بھی تہ کر کے اوڑھتے تھے لیکن چوں کہ ہرتہ الگ الگ ہوتی تھی، اس لیے اس سے بھدا پن پیدا ہو جاتا تھا، آج تک شالوں میں دو تہیں ہوتی ہیں، یہ اکبر کی ایجاد ہے، اکبر ہی کی خواہش پر بڑی شالیں بھی تیار کی جانے لگیں، اس سے پہلے چھوٹی شالیں تیار ہوتی تھیں، شالوں کے حسب ذیل مختلف رنگ ہوتے تھے، لعل، زریں، نارنجی، قرمزی، کاہی، گل پنبہ، صندلی، بادامی، ارغوانی، طوطکی، عنابی، عسلی، سوسنی، مجیٹھی، کاسنی، سیلی، جلنی، فستقی، برنجی وغیرہ۔

تزک جہاں گیری میں ہے کہ شال کشمیری کا نام حضرت آشیانی نے پرم نرم رکھا ہے شال

[1] بادشاہ نامہ، جلد دوم، ص ۱۱

کی ایک قسم تھرمہ ہے، جو شال سے زیادہ دبیز، ملائم اور موج دار ہوتی ہے، ایک قسم ورمہ ہے، جو فرش پر بچھائی جاتی ہے، شال کے علاوہ دوسرے اقسام کا پشمینہ تبت میں بہتر ہوتا ہے، شال کا اون تبت سے ضرور آتا ہے، مگر وہاں خود شال نہیں بنتی، شال کا اون اس بکری سے حاصل کیا جاتا ہے، جو تبت وخراساں میں پائی جاتی ہے، کشمیری میں شال کے اون سے پٹو بھی بناتے ہیں اور شالوں کو باہم رفو کر کے سقرلات کی قسم کا ایک لباس تیار کرتے ہیں، جو بارانی لباس کے لیے برا نہیں ہوتا۔ پٹو کے بارہ میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ تین چار سال تک یہ کام دیتا ہے۔ (ص ۳۰۵)

شالیں کشمیر اور لاہور میں بکثرت بنائی جاتی تھیں، لاہور میں اونی ریشمی چادر بھی تیار کی جاتی تھی، جو مایان کہلاتی تھیں، ریشم اور اون کے پٹکے اور دستار بھی بنائی جاتی تھی، اکبری عہد میں لاہور میں شال بافی کے ایک ہزار کارخانے تھے۔ (آئین اکبری ص ۶۸)

ہندوستانی شال بیرونی شالوں کے مقابلہ میں بہت مضبوط ہوتی تھی، مشہور ماہر معاشیات مزو نے ایک ہندوستانی شال سات سال تک استعمال کی اور اتنی مدت کے بعد بھی اس میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، اس کا بیان ہے کہ آج تک میں نے یورپ میں کوئی شال ایسی نہیں دیکھی، جو مجھ کو تحفۃً بھی مل جائے، تو میں اس کو استعمال کرنے پر راضی ہو جاؤں۔ (آر۔ سی۔ دت، معاشی تاریخ ہند جلد اول ص ۳۰۲)

ہندوستان کے کپڑے کی مقبولیت:

ہندوستان کے بعض تیار کردہ کپڑے بیرونی ممالک میں بہت پسند کیے جاتے تھے، اس لیے جو یہاں کی ضرورت سے فاضل ہوتے، وہ باہر بھیج دیے جاتے تھے، بعض کپڑے چھپے ہوئے ہوتے، یہ چھاپ برش یا لکڑی کے سانچہ سے ڈالی جاتی۔ فرنگی ایسے کپڑے کو پنٹاڈو کہتے تھے، پرتگیزی اس کو بہت شوق سے لے جاتے تھے، دھلی ہوئی یا رنگین چھینٹ کی مانگ جزائر ملکا میں بہت تھی سولھویں صدی کے سیاح باربوسہ کا بیان ہے کہ گجرات کے ریشمی کپڑے مشرق افریقہ اور پیگو تک جاتے وارتھما کا بیان ہے کہ گجرات کے کپڑے فارس، تاتار، شام، بربر، عرب اور حبش

بھیجے جاتے۔

لٹھا ہندوستان کے ہر حصہ میں تیار ہوتا تھا، یہ سادہ بھی ہوتا تھا اور رنگین بھی، گجرات کی منڈیوں میں یہ وٹی اور بافتہ کہلاتا تھا، وٹی دھوتی کا مترادف ہے، وہ لٹھا جو دھوتی کے کپڑے سے ذرا بہتر ہوتا، وہ بافتہ کہلاتا۔ ساحل کارومنڈل میں لٹھے کا بڑا لمبا تھان تیار ہوتا تھا۔ شالی ہند میں یہ لٹھا گزی بھی کہلاتا تھا، پرتگیزی اس کو مغربی افریقہ اور برازیل تک لے جاتے تھے، جہاں یہ گی آنا کا مال "ڈسال یا حبشی کپڑا مشہور تھا، لٹھوں کے مختلف نام تھے، مثلاً: پرکال، جوڑی، سلیم پوری وغیرہ، لٹھے لندن کی منڈی میں بھی مقبول تھے۔

ململ کی مانگ ایران، عرب اور مصر میں تھی، جہاں یہ کرتے، پٹکے اور عمامے میں استعمال کی جاتی تھی۔

۱۶۳۹ء میں ہالینڈ نے ہندوستان کے جو کپڑے دوسرے ملکوں کو بھیجے، اس کے اعداد و شمار یہ ہیں:

سامانی (پنجاب) ایک ہزار تھان، امبرتی (بہار) ایک ہزار تھان، عریض بافتے (گجرات) پانچ ہزار تھان، کم عرض کے بافتے چار ہزار سے لے کر پانچ ہزار تھان، دریابادی (اودھ) دو ہزار تھان، سلیم پوری تین سے لے کر چار ہزار تھان، پرکال گیارہ ہزار تھان، ململ اور بنگال کے عمدہ کپڑے گیارہ ہزار تھان۔

مورلینڈ نے جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۶۵۸ء میں سورت سے میرقلی کے دس ہزار تھان، چھوٹے عرض کے بافتے کے دس ہزار تھان، بڑے عرض کے بافتے پانچ ہزار، سندھی لٹھا دس ہزار، دریابادی دس ہزار، ونگزی دس ہزار اور دوسرے لٹھے ساڑھے آٹھ ہزار تھان انگلستان منگوائے گئے، اسی سال مدراس سے معمولی لٹھا ۲۰ ہزار تھان، سلیم پوری ۲۰ ہزار اور دوسرے کپڑے ۱۴ ہزار تھان گئے۔

چھینٹ، لحاف کی رنگین فردیں اور عمدہ قسم کے پردے برابر افریقہ اور یورپ جاتے

رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے تک ہندوستان کے سوتی کپڑے انگلستان جاتے تھے، ۱۸۰۲ء میں صرف کلکتہ کی بندرگاہ سے ۱۳۶۳۹ سوتی تھان انگلستان بھیجے گئے۔ ۱۸۲۹ء میں اسی بندرگاہ سے ۱۵۵۸ء ریشمی تھان بھیجے گئے (آر۔ سی۔ دت معاشی تاریخ ہند جلد اول ص ۳۴۱ - ۳۴۰) ڈھاکہ کی ململ کی بڑی مانگ تھی، یہاں جیسی ململ تیار ہوتی، انگلستان میں نہیں ہوتی تھی، لیکن انگریزوں نے یہاں کے کاری گروں پر ایسی پابندیاں عائد کیں کہ ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور جو کپڑے انگلستان بھیجے جاتے تھے۔ ان پر اتنا محصول لگا دیا گیا کہ کپڑوں کی بیرونی تجارت ہی ختم ہوگئی۔

اونی کپڑے:

اونی کپڑے بھی ہندوستان میں تیار ہوتے رہے، لیکن اچھے قسم کا پشمینہ، سمور اور سابل باہر ہی سے آتا تھا۔

کپڑوں کے رنگ:

مسلمانوں کے آنے سے پہلے کپڑوں پر جو رنگ ہوتا تھا۔ ان کے نام عام طور سے یہ تھے۔

آسمانی، اجلا، انگوری، بادام، بھورا، بینگنی، پیلا، پیازی، پستئی، تیلیا، تربوزی، جامنی، جوگیا، چھپا، چتکبری، چتلا، چمپئی، دھانی، دودھیا، روپہلا، سیندوری، سلیٹی، فالسی، کسیری، کتھی، کسی، کرنجی، کوکئی، کیوڑی، کالا، کاہی، گورا، گندمی، گیندی، لال، لاکھی، لہریا، مونگیا، نیلا، ہرا۔

مسلمانوں نے جب اس صنعت کو فروغ دیا تو حسب ذیل رنگوں کا اضافہ کیا۔

آبنوسی، آبی، آتشی، ارغوانی، اسود، ازرق، اخضری، ابلق، اگری، احمر، اشہب، بنفشی، حنائی، خاکی، خاکستری، رمانی، زریں، زنگاری، زعفرانی، زیتونی، زمردی، سیمابی، سوسنی، طوسی، شنگرفی، شربتی، شہابی، طلائی، طاؤسی، طباشیدی، عنبری، عنابی، عباسی، فیروزی، قرمزی، کاکریزی، کبودی، کاسنی، گلنار، لاجوردی، مرجانی، مشکی، نقری، ہرمزی، یاقوتی۔

ہندوستان کی کامدانی وزردوزی:

مسلمانوں حکمرانوں کے زمانے میں کامدانی اور زردوزی کو بھی بڑا فروغ ہوا۔ کامدانی کا کام سونے اور چاندی کے تاروں سے کیا جاتا ہے، پھول اور ستارے مخمل، ریشمی یا عمدہ سوتی کپڑوں پر کاڑھے جاتے ہیں، کاری گر چپٹے تاروں کو لے کر سوئی کی مدد سے بخیہ گری کرتے ہیں کامدانی کے لیے جو مخصوص تار استعمال ہوتے ہیں، ان کو بادلہ کہتے ہیں۔

زردوزی کامدانی کی عمدہ قسم کا نام ہے جو سونے کے تاروں سے مخمل، کمخواب اور دوسرے ریشمی کپڑوں پر بنائی جاتی ہے، اس کام کے لیے فرموں کی ضرورت پڑتی ہے، جن کو کار چوب کہتے ہیں، مخمل پر زردوزی کا کام بہت رائج تھا اور عموماً سلاطین، امراء، بیگمات اور شادی بیاہ کو پوشاکوں مثلاً مندیل، چیرہ، دوپٹہ، فوطہ اور پلنگ پوش وغیرہ میں ہوا کرتا تھا (آئین اکبری ص ۶۹)۔

کامدانی اور زردوزی کے لیے سونے اور چاندی کے تاروں کی ضرورت ہوتی ہے، تار کشی خود ایک صنعت ہے، سونے یا چاندی کے ٹکڑوں سے دھاگے سے زیادہ باریک تار بنانا بڑا مشکل فن ہے، جس کو کاری گر بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں، یہ فن اب بھی ہے، لیکن مغل بادشاہوں کے زمانہ میں اس کو بڑی ترقی ہوئی، ان تاروں کو کلابتون کہتے ہیں۔

گوٹہ سونے اور چاندی کے تاروں کو روئی یا ریشم کے دھاگوں کے ساتھ بن کر تیار کرتے ہیں، جن کو عورتیں اپنی پوشاک یا خوان پوش کے حاشیہ میں استعمال کرتی ہیں، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں بھی یہ صنعت خاطر خواہ طور پر رہی۔

سامان آرائش:

سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد میں بڑے بڑے خیمے بھی تیار ہوتے رہے، عہد تغلق میں بڑے خیموں کے نام سراچہ اور عیسوان تھے، سراچہ بادشاہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا رنگ سرخ ہوتا تھا اور امراء کے سراچہ کا رنگ سفید ہوتا تھا، جس پر نیلے رنگ کا نقش بھی ہوتا، عیسوان سراچہ کے اندر لگایا جاتا، خیمہ ہی سے کیمپ میں دربار بنائے جاتے، جو دہلیز اور بارگاہ

کہلاتے تھے اور خواب گاہ کا خیمہ خواب گاہ ہی کہلاتا تھا۔

مغلوں کے عہد میں بارگاہ کو ایک ہزار فرش استادہ کرتے۔ اس میں ۷۲ کمرے ہوتے کیمپ کے حصار کو قنات سے گھیرا جاتا۔ جو گلال بار کہلاتا تھا یہ سو گز مربع ہوتا، اس کے اندر خیمے ہوتے۔ جن کی علحدہ علحدہ نام تھے، سرخہ میں ۵۴ خانے ہوتے، راوٹیاں دو منزل کی بھی ہوتیں اور بعض راوٹیاں زربفت اور مخمل سے تیار کی جاتی تھیں۔ کیمپ کے ساتھ ایک ہزار ایرانی، تورانی اور ہندی فراش ہوتے تھے۔

درباروں اور گھروں کی آرائش کے لیے عمدہ قسم کے قالین، جاجم، بلوچی، حصیر (چٹائی) چاندنی تیار ہوتی رہتی۔ قالین زیادہ تر ایران، توران، کرمان اور سبزوار وغیرہ سے آتے لیکن ہندوستان میں بھی لاہور، ملتان، آگرہ اور جونپور میں بھی تیار ہوتے۔ عہد اکبری میں بعض قالین چوبیس گز سات طسوج لمبے اور گیارہ گز آدھ طسوج چوڑے اور مصور ہوتے تھے، منقش پردوں کی صنعت کو بھی کافی فروغ تھا، کیوں کہ درباروں اور امرا کی مجلسوں میں رومی، کاشانی اور گجراتی زربفت، دیبا اور سنجاب کے زرنگار اور منقش پردے استعمال ہوتے تھے، ہاتھیوں اور گھوڑوں کے لیے ریشم کی طلائی اور جڑاؤ جھولیں بھی برابر بنتی رہیں، جو صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھیں۔

جولائی ۱۹۶۰ء

maablib.org

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تہوار

عہدِ رسالت میں مسلمانوں نے دو ہی تہوار منائے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ، کچھ عرصہ کے بعد شب برات کی حیثیت بھی تہوار ہی کی ہوگئی، یہ تینوں تہوار مذہبی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن مسلمان ہندوستان آئے، تو اپنے ساتھ ایران بلکہ وسط ایشیا کا قومی تہوار جشنِ نوروز بھی ساتھ لائے اور اس کو اس دھوم دھام سے مناتے کہ مذکورۂ بالا تینوں تہوار سے اس کا جشن بڑھ جاتا، اس مضمون میں ان ہی تہواروں کا ذکر ہے۔

عہد تغلق کی عید:

ابن بطوطہ نے عہد تغلق کی عیدالفطر کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے۔ اس سے سلاطینِ دہلی کے پورے دور کے جشن عید کا اندازہ ہوگا۔ ابن بطوطہ کا یہ بیان تمدنی حیثیت سے بھی بہت ہی پُر از معلومات ہے، اس لیے امید ہے کہ اس کی طوالت ناظرین کے لیے گراں خاطر ہونے کے بجائے دل چسپی کا باعث ہوگی۔

وہ لکھتا ہے کہ عید کی پہلی رات کو بادشاہ اپنی طرف سے امیروں، مصاحبوں، مسافروں، متصدیوں، حاجیوں، نقیبوں، افسروں، غلاموں اور اخبار نویسوں کے لیے ایک ایک خلعت ہر ایک کے درجہ کے مطابق بھیجتا ہے، جب صبح ہوتی ہے تو ہاتھی سجائے جاتے ہیں، ان پر ریشم کی طلائی اور جڑاؤ جھولیں ڈالی جاتی ہیں، ان میں سے سو ہاتھی خاص بادشاہ کی سواری کے ہوتے ہیں، ان سب پر ایک ایک چھتر ہوتا ہے، جو ریشم کا بنا ہوا اور جواہرات سے جڑا ہوا ہوتا ہے، ہر ایک چتر کی ڈنڈی خالص سونے کی ہوتی ہے اور ہر ایک ہاتھی پر جواہرات سے مرصع ایک ریشمی گدی رکھی جاتی ہے۔ ایک ہاتھی پر بادشاہ سوار ہوتا ہے اور اس کے آگے آگے زین پوش جن پر جواہرات جڑے ہوئے

ہوتے ہیں اور ایک علم بطور پرچم کے لے جاتے ہیں۔ ہاتھی کے آگے غلام اور مملوک پیادہ پا چلتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے سر پر چاچی ٹوپی یعنی ساشیہ ہوتی ہے اور کمر پر مطلا پیٹی میں بعض جواہرات لگے ہوئے ہوتے ہیں اور بادشاہ کے آگے آگے نقیب بھی ہوتے ہیں جو تعداد میں تین سو ہوتے ہیں، ان میں ہر ایک کے سر پر پوستین کی کلاہ ہوتی ہے، کمر میں طلائی پیٹی اور ہاتھ میں تازیانہ جس کا دستہ سونے کا ہوتا ہے اور صدر جہاں قاضی القضاۃ کمال الدین غزنوی اور صدر جہاں قاضی القضاۃ خوارزمی اور تمام قاضی ذی رتبہ پردیسی، عراقی، خراسانی، شامی اور مغربی سب ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں، اس ملک میں سب پردیسیوں کو خراسانی کہتے ہیں اور موذن بھی ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں اور تکبیر کہتے ہوئے جاتے ہیں۔ بادشاہ اس ترتیب سے محل شاہی کے دروازے سے نکلتا ہے اور لشکر باہر منتظر ہوتا ہے ہر ایک امیر اپنی فوج کو لیے علٰحدہ علٰحدہ کھڑا ہوتا ہے اور ہر ایک کے ساتھ نوبت نقارے والے بھی ہوتے ہیں، سب سے پہلے بادشاہ کی سواری بڑھتی ہے، بادشاہ کے آگے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے اور قاضی و موذن ہوتے ہیں جو تکبیر کہتے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے پیچھے باجے والے ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے بادشاہ کے خدمت گار، پھر بادشاہ کے بھائی مبارک خاں کی سواری مع اس کی فوج اور باجے کے ہوتی ہے، اس کے بعد بادشاہ کے بھتیجے بہرام خاں کی سواری، اس کے بعد بادشاہ کے چچازاد بھائی ملک فیروز کی، پھر ملک مجیر ذی الرجا کی، پھر ملک قبول کی، پھر ملک عکبہ کی، پھر ملک بغرا کی، پھر ملک مخلص کی، پھر قطب الملک کی ہر ایک کے ساتھ لشکر اور باجے ہوتے ہیں، یہ لوگ جن کے نام لیے گئے ہیں، وہ امرا ہیں جو ہمیشہ بادشاہ کی خدمت میں رہتے ہیں، وہ عید کے دن بادشاہ کے ساتھ نوبت نقارہ لے کر جاتے ہیں اور باقی امیر بغیر نوبت کے جاتے ہیں اور وہ درجہ میں چھوٹے ہوتے ہیں اور ہر ایک شخص عید کے دن جلوس میں مع اپنے گھوڑے کے زرہ پوش ہوتا ہے، جب بادشاہ عید گاہ کے دروازے پر پہنچتا ہے، تو وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ "قاضی" "موذن" "امراء" اور ذی رتبہ پردیسی پہلے داخل ہوں، بادشاہ آخر میں اترتا ہے، امام نماز شروع کرتا ہے، اس کے بعد خطبہ پڑھتا ہے۔

عید کے دن دربار بڑی شان و شوکت سے سجایا جاتا، اس کی تفصیل بھی ابن بطوطہ نے

لکھی ہے، اس روز تمام دیوان خانہ میں فرش بچھایا جاتا، اس کے صحن میں موٹے موٹے ستونوں پر بارگہ کھڑی کی جاتی، اس کے چاروں طرف خیمے ہوتے، ان میں رنگ برنگ کے ریشمی پھول اور بوٹے لگائے جاتے، دیوان خانے میں تین صفیں بنائی جاتیں، ان ہی کے درمیان سونے کی ایک چوکی لاکر رکھی جاتی اور اس پر ایک گدی ہوتی، جس پر رومال پڑا ہوا ہوتا، دیوان خانہ کے صدر میں ایک بڑا تخت رکھا جاتا، یہ تخت سونے کا تھا، اس پر جواہرات ٹکے ہوتے تھے، اس کا طول ۳۲ بالشت اور عرض اس سے آدھا تھا، اس کے علٰحدہ علٰحدہ ٹکڑے ہو جاتے، جب دیوان خانہ میں لاتے تو جوڑ لیتے۔ ایک ایک ٹکڑے کو کئی کئی آدمی اٹھاتے، اس کے اوپر ایک کرسی بچھاتے اور بادشاہ کے سر پر چھتر لگاتے، جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو نقیب اور حاجب بلند آواز سے بسم اللہ کہتے پھر ایک ایک شخص سلام کے واسطے آگے بڑھتا، سب سے پہلے خاص خطیب، پھر علماء، پھر سادات پھر مشائخ پھر بادشاہ کے اعزا و اقربا پھر ذی مرتبہ پردیسی پھر وزرا پھر فوجی عہدیدار آگے بڑھتے اور سلام کر کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ رہتے، سلام کرتے وقت نذرانے بھی پیش کرتے، جو رومال میں بندھے ہوتے، یہ نذرانے سونے کی ایک تھالی میں ڈالتے جاتے، اس میں سے بادشاہ بھی بخشش کرتا جاتا، سلام کے بعد کھانا آتا، اس روز سونے کی انگیٹھی میں عود، الائچی اور عنبر جلاتے رہتے تاکہ دربار کی فضا معطر رہے، سونے اور چاندی کے گلاب پاش سے پھولوں کے عرق بھی برابر چھڑکے جاتے، بادشاہ کے دائیں بائیں امرا کھڑے رہتے اور بارگہ کا کوتوال ہاتھ میں سونے کی چھڑی لیے رہتا، اس کے نائب کے ہاتھ میں چاندی کی چھڑی ہوتی، یہ دونوں اہلِ دربار کو اپنی اپنی جگہ بٹھاتے اور صفوں کو سیدھی کرتے رہتے، وزیر اور کاتب ان کے پیچھے ہوتے، اس کے بعد رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی، یہ نشست عصر کے وقت ہوتی، اس کے دوسرے دن دربار اسی ترتیب کے ساتھ ہوتا اور جشن جاری رہتا، تیسرے دن بادشاہ اپنے رشتہ داروں کے نکاح کی رسم ادا کراتا، چوتھے دن غلام آزاد کیے جاتے، پانچویں دن لونڈیاں آزاد ہوتیں، چھٹے دن غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح ہوتے اور ساتویں دن خیرات تقسیم کی جاتی [1]۔

1۔ سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۰۹-۱۰۳

عہد فیروز شاہی کی عید:

فیروز شاہ کے عہد میں عید کا یہ جشن اسی شان وشوکت کے ساتھ منایا جاتا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہی ہوا، عفیف کا بیان ہے کہ عید کے روز کوشک فیروز آباد کے آٹھوں چمن میں آم کی چیاں بڑی خوبصورتی سے سجائی جاتیں، محل پاشیب میں بارگاہ نصب کی جاتی، اس کو بارگاہ بام کہا جاتا، اس کے دونوں طرف لکڑی کے پاشیب تیار کیے جاتے اور ہر قسم کے گدے بچھائے جاتے، بعض گدے ریشم اور بعض زرینہ کے ہوتے، بعض پر نقرائی اور زریں کام ہوتا، بعض سفید کپڑے کے ہوتے اور بعض موم کے بنائے جاتے، تمام در و دیوار پر زرینہ لپیٹا رہتا، صحن میں فرش ہوتا اور وہاں ہر قسم کے تر وخشک میوے رکھے رہتے۔

چاشت کے وقت بادشاہ باہر آ کر محل کوشک میں قیام کرتا، پہلے بندگان تیغ دار حاضر ہوتے، دس چتر بادشاہ کے دائیں اور دس بائیں اور ایک خاص بادشاہ کے سر پر رکھے جاتے، ان میں سے بعض چتر سرخ، بعض سبز، بعض کنج، بعض نسیج، بعض دو رنگے، بعض سیاہ، بعض سفید ہوتے، برسات میں مہابک رنگ کا چتر سر پر سایہ فگن ہوتا، چتر کے بعد مکسانی اور مکلل نشانات تخت کے سامنے سے گزرائے جاتے، مکسانی نشانات ایک سو ستر رنگ کے ہوتے اور بے حد خوبصورت نظر آتے، اس طرح تمام علم بردار اپنے اپنے مراتب کے مطابق محل کے اندر جاتے تھے، اس کے بعد پائگاہ کے زریں پوش گھوڑے محل میں داخل ہوتے، اس کے بعد طلائی اور نقرئی جھول سے آراستہ ہاتھی تخت کے سامنے زمین بوس ہو کر سلام کرتے اور دعا دیتے پھر اپنی اپنی جگہ دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے، ان کے بعد اکثر شکرہ داروں کے ساتھ ارباب شکرہ خانہ حاضر ہوتے، ان کے بعد مطرب آتے، جو زعفرانی لباس پہنے ہوتے، ان کے سروں پر سرخ دستار ہوتی، ان میں سے بعض مطربوں کا لباس بہت ہی مرصع اور مکلل ہوتا، بعض لباس کی قیمت چالیس ہزار تنکے ہوتے، مطربوں کے بعد قوالوں کا گروہ آتا، پھر اہل طرب آ کر رقص کرتے، اس کے بعد دربار کے خوانین، ملوک، امراء، علماء و مشائخ سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتے، تمام اراکین سلطنت اپنے اپنے مرتبے کے مراتب اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے رہتے۔

جب دن کچھ چڑھ جاتا تو سلطان عید گاہ کے لیے روانہ ہوتا، اس کے ساتھ تمام لوگ دربار سے باہر آتے، سلطان ہاتھی پر سوار رہتا یا کبھی گھوڑے پر بھی ہوتا، ایک چتر بادشاہ کے سر پر سایہ فگن رہتا، دوسرا شہزادہ تغلق کے اوپر ہوتا اور تمام چتر دربار ہی میں چھوڑ دیے جاتے، شاہزادہ کی سواری آگے ہوتی، اس کے بعد بادشاہ ہوتا، نماز سواہ کوشک میں ہوتی، اس کے بعد سلطان پھر دربار میں آتا، جہاں لوگ پھر حاضر ہوتے، اس روز خواص وملوک کو خلعت بھی دیے جاتے اور قوالوں اور گویوں کو انعام واکرام عطا ہوتے۔[1]

عہد مغلیہ کی عید:

مغل بادشاہ بھی جشنِ عید اسی روایتی شان وشوکت کے ساتھ مناتے رہے، اس موقع پر ان کے دربار کی آرائش ان کے تمدن کے ساتھ بڑھتی رہی اور وہ عید گاہ بڑے کروفر کے ساتھ جاتے رہے عید کا چاند ہوتا، تو مفتی اور قاضی بادشاہ کو خبر کرتے اور رویت ہلال کا اعلان توپ داغ کر کے کیا جاتا اور یہ رواج اب تک دہلی میں جاری ہے، اب توپ تو نہیں چھوٹی گولے چھوڑے جاتے ہیں۔ عید منانے کے لیے کئی روز پہلے سے تیاری ہوتی رہتی۔ محل اور دربار دلہن کی طرح سجا دیا جاتا، دربار کی آرائش کا اندازہ اس سے ہوگا، جب ہم جشنِ نوروز میں اس کی آرائش کی تفصیل بیان کریں گے، صبح کو بادشاہ ہاتھی پر جلوس کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کے لیے روانہ ہوتا، چاؤش ونقیب آگے ہوتے، نقارے کی صدائیں بلند ہوتی رہتیں، شاہی علم اور چتر توق فضا میں لہراتے رہتے، شاہی دبدبہ کے لیے کچھ توپیں بھی ساتھ چلتیں، ہاتھی کی پیشانی پر ڈھالیں لگی رہتیں۔ عید کی خوشی میں ان کی مستکوں پر نقش ونگار ہوتے، ان پر جھلابور جھولیں ہوتیں، جن پر موتی اور جواہرات ٹکے ہوتے۔ وہ زیوروں میں لدے پھندے سونے چاندی کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے جھومتے جھامتے خوش مستیاں کرتے جلوس کے ساتھ چلتے، ہاتھی کے ہودج پر عماری ہوتی جس پر چتر یا میگھ ڈمبر لگا ہوتا۔ شہزادے گھوڑوں پر ہوتے، یہ زرق برق زین، ارتک، گجم، مجمع بند، یال پوش اور پشت تنگ وغیرہ سے آراستہ ہوتے، شہزادوں کے پیچھے محل سراؤں کی پالکیاں ہوتیں،

---

[1] عفیف، ص ۶۵-۳۶۳

ان کے پیچھے کچھ فوج کا دستہ ہوتا، نقارہ زور زور سے بجتا جاتا، ایک ہاتھی پر روپے لدے ہوتے جو راستے میں غریبوں اور مسکینوں میں لٹاتے جاتے، عید گاہ تک ایک ہجوم ہوتا جہاں بادشاہ داخل ہوتا تو اس کی آمد کی اطلاع ۲۱ توپوں کی سلامی سے دی جاتی، منبر کے پاس شاہی خیمہ لگتا، جس میں بادشاہ اپنے شہزادوں اور امرا کے ساتھ جا کر بیٹھتا۔ عید کی نماز سے پہلے صف بندی ہو جاتی اور جب امام خطبہ پڑھنے کے لیے منبر پر آتا تو اس کے گلے میں جواہر نگار قبضہ کی تلوار لٹکی ہوتی، خطبہ میں جب بادشاہ کا نام آتا تو ایک توپ کا گولہ چھوٹتا۔ خطبہ ختم ہونے کے بعد امام بادشاہ سے آکر بغل گیر ہوتا، شاہی جلوس پھر اسی شوکت کے ساتھ واپس ہوتا، تو دیوانِ عام میں دربار لگتا، کبھی عید کے دوسرے دن بھی دربار ہوتا، بادشاہ کی خدمت میں عید کے تحفے اور نذرانے پیش کیے جاتے، تمام کاری گر اور صناع اپنی دست کاریوں کے نمونے پیش کرتے۔ بادشاہ بھی شہزادوں اور ارکین سلطنت کو طرح طرح کے انعام و اکرام سے نوازتا۔ بادشاہ پھر محل کے اندر آتا، جہاں وہ بیگمات اور شہزادوں کو خلعت عطا کرتا۔ بادشاہ نامہ میں ۱۰۴۰ھ کی عید کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"چودھویں اردی بہشت کو عید الفطر مسرتوں کو نوید کے ساتھ آئی۔ اس روز ایک مرصع ہودج یمین الدولہ نے پیش کیا، جو ایک لاکھ روپے میں تیار ہوا تھا۔ ایک ہاتھی کی پیٹھ پر باندھا گیا، بادشاہ دین پرور اس کوہ ہیبت اور فلک حرکت ہاتھی پر بیٹھے۔ وہ تمام رمضان المبارک روزے سے رہتے۔ بیس ہزار روپے محتاجوں میں تقسیم کے لیے عنایت کیے اور عید گاہ تشریف لے گئے، آنے جانے میں تمام آئین کا لحاظ ملحوظ رکھا گیا۔ اسی روز نجابت خاں ولد مرزا شاہ رخ کو صوبہ ملتان کی فوج داری دی گئی اور پان صدی ذات اور شش صد سوار کے اضافہ کے بعد دو ہزار و پان صدی ذات دو ہزار سوار منصب پا گیا اور نقارہ کی بھی عزت بخشی گئی...... اخلاص خاں کو اجمیر کی فوج داری دی گئی، بنگالہ کے تعیناتیات میں سے محمد زماں کو اور کابل کے کومکیان میں بہاری داس کچھواہہ کو منصب میں اضافہ کر کے دو ہزاری ذات و ہزار دولت سوار

سے سرفراز کیا گیا۔ چندر من ولد راجہ نرسنگھ سندیلہ کو ہزار و پانصدی ذات و ہفت صد سوار کے منصب سے نوازا گیا۔ (بادشاہ نامہ جلد اول-۲-۳۷۷)۔

جامع مسجد دہلی اور نماز عید:

یہ مسجد شاہجہانی عہد میں ۱۰۶۰ھ میں بن کر تیار ہوئی۔ سعد اللہ خان دیوان اعلیٰ اور فاضل خان خانان کی نگرانی میں چھ برس تک پانچ ہزار راج، مزدور، بیل دار اور سنگ تراش کام کرتے رہے، اس میں دس لاکھ روپے خرچ ہوئے[1]۔ یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ جب مسجد بن کر تیار ہوئی تو عید بالکل قریب تھی۔ شاہجہاں نے کہا کہ ہم عید کی نماز یہیں پڑھیں گے۔ سعد اللہ خاں بہت گھبرایا کیوں کہ ہزاروں من ملبے پڑے ہوئے تھے، شاہجہاں کو جب یہ معلوم ہوا، تو اس نے حکم دے دیا کہ جو چیز جس کے ہاتھ لگے اٹھا لے جائے، اس حکم کو سن کر چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے تمام ملبے اٹھ گئے، مسجد صاف ہوگئی اور پھر شہر کے لوگوں نے شاہجہاں کے ساتھ اس عالی شان اور حسین مسجد میں عید کی نماز ادا کی۔

عید گاہ:

شاہجہاں نے دہلی میں عید گاہ شہر کے حصار سے باہر بنوائی تھی، اس کا طول ۶۲ گز اور عرض ساڑھے آٹھ گز تھا، یہ ۱۲ گز کی بلندی پر واقع تھا، اس کے گرد چار دیواری تھی، جس میں تین دروازے اور چار برج تھے۔ مشرقی دروازے کے آگے جلوخانہ تھا، اندر فرش پر سرخ سنگ لگائے گئے تھے اور جا بجا سات چشمے بہتے رہتے، ایک چبوترہ بھی تھا، جس کا طول ۹۱ ذراع اور عرض ۵۳ ذراع تھا، اس کے گرد سنگِ سرخ کا ایک محجر بھی تھا، چبوترہ کے آگے ایک وسیع صحن تھا اور اس کے وسط میں ایک حوض تھا، یہ عید گاہ ڈیڑھ سال میں پچاس ہزار روپے میں ۱۰۶۵ھ میں بنائی گئی تھی[2]۔

عالمگیری عہد کی عید:

عالمگیر اکیسویں سال جلوس تک عید کا جشن پوری شاہانہ روایتوں کے ساتھ مناتا رہتا۔

---

[1] آثار الصنادید ص ۷، باب تیسرا [2] تاریخ ہند جلد ہفتم از ذکاء اللہ ص ۵۱-۲۵۰

مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ یہ مسرت انگیز دن آتا تو کار پردازانِ سلطنت دربار کی ترتیب وانعقاد کی تیاری بڑے اہتمام سے کرتے، نغمۂ شادی کی پرزور آواز سے زمین و آسمان گونج اٹھتے۔ عالمگیر ہاتھی پر عیدگاہ جاتا، اس کے ساتھ کوئی شہزادہ ہوتا، عیدگاہ سے واپسی کے بعد دربار میں آتا تو عطر اور پان تقسیم کیے جاتے۔ شہزادے اور امراء نذرانے پیش کرتے، خود عالمگیر بھی ان کو خلعت اور مناصب دیتا، خلعت کے ساتھ قیمتی موتی، ہاتھی باساز طلاء اور روپے بھی ہوتے۔ کسی کا روزینہ بھی مقرر ہوتا، ہندو امراء بھی اس روز مناصب اور خلعت پاتے مثلاً اٹھارہویں سال جلوس کے جشن عید میں عالمگیر نے رانا راج سنگھ مرزبان کو خلعت خاص کے ساتھ جمدھر مرصع عطا کیا اور مہاراجہ جسونت سنگھ کے لیے خلعت بھجوایا، لیکن اس کے جشن منانے میں دنیاوی نمود و نمائش زیادہ بڑھتی جارہی تھی، جو عید جیسے مذہبی تہوار کے لیے منافی تھا، اس لیے عالمگیر نے اس موقع پر دربار کے جشن میں انتہائی سادگی کا حکم دیا[1] گو یہ سادگی اس کے بعد قائم نہیں رہی۔

بادشاہ ظفر کی عید:

خاندان مغلیہ کے آخری تاج دار کے عہد میں حکومت برائے نام رہ گئی تھی، اس کی شان و شوکت بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی اس کی بہت سی روایتیں باقی تھیں، دربار میں جشن عید روایتی طور پر منایا جاتا، گو اس میں مسرفانہ تکلفات کرنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ احسن الاخبار مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۴۹ء میں بہادر شاہ ظفر کے جشن عید کا حال اس طرح درج ہے۔

> "حضرت بادشاہ غازی ہفتہ کے دن شوال کی پہلی تاریخ کو قلعہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور عید کی نماز پڑھنے کو عیدگاہ تشریف لے گئے، نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور حسب معمول نیاز کے لیے درگاہ آثار شریف میں حاضر ہوگئے، درگاہ شریف کے متولی جہاندار شاہ کو خلعت شش پارچہ اور امام جماعت کو خلعت و شمشیر عنایت ہوئے اور واپس قلعۂ معلی میں آئے، آتے جاتے وقت حسب ضابطہ شاہی انگریزی توپ خانوں سے

[1] جشن عید کے لیے دیکھو مآثر عالمگیری، ص ۳۸، ۳۹، ۵۳، ۶۰، ۸۰، ۹۵، ۱۰۷، ۱۲۹، ۱۴۷، ۱۵۶، ۱۶۲

سلامی کی توپیں سر ہوئیں، شام کے وقت تخت ہوادار پر سوار ہو کر ناظر کے باغ میں رونق افروز ہوئے۔ محفل رقص و سرود منعقد ہوئی، اس کے ختم ہونے کے بعد محل خاص میں تشریف لے جا کر آرام فرمایا، ہر طرف سے مبارک باد کی آوازیں آتیں اور توپ خانہ سے سلامی کی توپیں چھٹیں"۔

سرود ونغمہ:

عید کے روز نغمہ و سرود کی مجلسِ نشاط بھی منعقد کی جاتی، جب کہ دربار کے ماہرین موسیقی اپنے تمام آلات و ساز کے ساتھ ساتھ نواز ہوتے، لیکن اورنگ زیب اس کو لہو ولعب اور شرعاً ناجائز سمجھتا اس لیے اس نے حکم دیا کہ ماہرین موسیقی مجرائے شاہی کے لیے تو حاضر ہوں، لیکن نغمہ پرداز نہ ہوں، گو اس کے دربار میں خوشحال خاں، بسرام خاں اور جیسے ماہرین موسیقی موجود تھے۔[1]

لیکن عالمگیر کے بعد دربار میں عید کے روز سرود ونغمہ کی روایت پھر جاری ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد تک رہی۔

قصیدہ خوانی:

دربار کے جشنِ عید میں بادشاہوں کی خدمت میں قصیدے بھی پیش کیے جاتے، جس کے صلہ میں شعراء انعام واکرام سے نوازے جاتے۔ ایسے فارسی قصائد کو تو ہم نظر انداز کرتے ہیں، آخری دور میں لال قلعہ کے اندر بہادر شاہ ظفر کی شان میں غالب اور ذوق نے جو قصائد پیش کیے ان کے کچھ اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، غالب تشبیب میں کہتے ہیں:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص — حبذا اے نشاطِ عام عوام

---

[1] تاریخ ہند جلد ہفتم از ذکاءاللہ، ص ۵۱-۲۵۰

عذر میں تین دن نہ آنے کے ۔۔۔ لے کے آیا ہے عید کا پیغام

بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہتے ہیں:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ۔۔۔ مظہر ذوالجلال والاکرام
اے ترا لطف زندگی افزا ۔۔۔ اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ ۔۔۔ لوحش اللہ عارفانہ کلام

ذوق اپنے ایک طویل قصیدہ میں کہتے ہیں:

مژدۂ عید سے ہے گلشن عالم میں بہار ۔۔۔ نغمۂ عیش سے ہے بزم جہاں میں رونق
دوش پر سرو لب جو کی ہوا اک سبز قبا ۔۔۔ بر میں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں یلمق
جوش سبزہ سے ہے وہ فرش سر صحن چمن ۔۔۔ کوئی مخمل اسے کہتا ہے کوئی استبرق
باغ عالم میں ہے یہ جوش بہار عشرت ۔۔۔ ٹپکے ہے گل سے مستی میں ہمیشہ راوق
تو بھی کر تہنیت عید کا اس کے ساماں ۔۔۔ کہ ہے وہ خسرو دیں حامی دین برحق
وہ بہادر شہ غازی کہ دم معرکہ ہوں ۔۔۔ اسکے تیروں کے ہدف اس کے حودوں کے حدق

آخر میں ذوق کہتے ہیں:

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح ۔۔۔ تا کہ ہوں ارض و سما دونوں طبق زیر طبق
ہووے ہر سال مبارک تجھے عید رمضان ۔۔۔ اور دشمن کو رہے تیرے سدا رنج و قلق

عوام کی عید:

عوام بھی اس دن اپنی مسرتوں کا اظہار طرح طرح سے کرتے علی الصباح اٹھتے، غسل کرتے، نئے نئے کپڑے بدلتے، عطر ملتے، گھروں کو سجاتے، بچوں کو حسین و رنگین کپڑے پہناتے، ان کو لے کر عید گاہ چلے جاتے، راستے میں صدقۂ عید الفطر تقسیم کرتے جاتے، وہاں نماز کے بعد لوگوں سے خوشی میں بغل گیر ہوتے، پھر گھر آتے تو تمام اعزہ، اقرباء اور احباب سے ملنے جاتے، ان کو عید کی مبارک باد پیش کرتے، ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کھلا کر تواضع کرتے، پھر سیر گاہوں اور تفریح

گاہوں کی طرف نکل جاتے، جہاں طرح طرح کے کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔

عید کے پیچھے ٹر:

عید کی خوشی منانے کے لیے کسی مخصوص جگہ ایک اجتماع ہو جاتا، جس نے رفتہ رفتہ میلے کی شکل اختیار کر لی ، عید کے ایسے میلے کو پنجاب میں ٹر کہنے لگے، یہاں دوکانیں لگتیں اور تفریحات کا پورا سامان کیا جاتا، رفتہ رفتہ یہ دہلی میں بھی ہونے لگا اور اب بھی ہوتا ہے۔

عید کے کھانے:

عید میں عموماً میٹھی چیزیں زیادہ پکتیں، شیر خورمہ کا رواج بہت رہا اور اب بھی ہے، یہ پتہ نہیں چل سکا کہ سویوں کا رواج کب سے ہوا، لیکن سویاں مسلمان حکم رانوں کے عہد ہی کی یادگاروں میں سے ہیں۔

علما کی عید:

علماء بھی عید کے دن خوشی کا اظہار کرنا دینی شعار سمجھتے رہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ عید کے دن اس لیے خوشی ہوتی ہے کہ رمضان شریف کے روزے ختم ہو جاتے ہیں یعنی ایک چیز جو ان پر شاق ہوتی ہے، اس سے فراغت ہو جاتی ہے اور خدا نے جو چیز ان پر فرض کی تھی اس کے ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو دوسرے سال تک رکھ کر احسان فرمایا، لیکن اس خوشی کے اظہار میں اس کا بھی حکم دیا کہ اعلائے کلمۃ الحق بھی ہو اور شعائر دین کی سربلندی بھی ہو، اس لیے ایک جگہ جمع ہو کر دو رکعت نماز ادا کرنا واجب قرار دیا، اس اجتماع کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ اسلام کی شان و شوکت کا اظہار بھی ہو، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ جانے اور آنے میں راستے بدلتے تھے، تاکہ مختلف راستوں میں مسلمانوں کی شان و شوکت ظاہر ہو، اس اظہار شوکت کے لیے زیب و زینت ضروری ہوئی، اس لیے خوش پوشی حتیٰ کہ گانے کے تفریحی سامانوں کی بھی اجازت دی گئی۔

(حجۃ البالغہ ج ۲ ص ۲۳)

عید الضحیٰ:

عید الضحیٰ عید الفطر ہی کی طرح منائی جاتی ہے صرف فرق یہ ہے کہ عید الضحیٰ میں نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے، قربانی کرنے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی مانگی اور جب حضرت ابراہیمؑ ان کی قربانی کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فدیہ لے کر ان کی قربانی معاف کر دی، دینِ ابراہیمی کی اسی سنت کو ادا کرنے کے لیے عید الضحیٰ میں برابر قربانی کی جاتی ہے۔

عید الضحیٰ کے موقع پر محلوں اور درباروں کی زینت و آرائش عید الفطر ہی کی طرح کی جاتی، سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ دونوں اسی شان سے عیدگاہ روانہ ہوتے، جس طرح عید الفطر میں جاتے اور اسی طرح مراسم ادا ہوتے۔ بادشاہ نامہ میں ہے۔

> ''عید الضحیٰ کی دس تاریخ آئی تو دنیا کے لیے شادمانی کے دروازے کھل گئے۔ شہنشاہ حق آگاہ عیدگاہ تشریف لے گئے اور نماز ادا کرنے کے بعد دولت خانہ کی طرف مراجعت کی، نچھاور کی رسم کے ساتھ قربانی کی سنت ادا کی گئی، اسی روز حاجب بلخ کو بیس ہزار روپئے، خواجہ یاقوت تحویل دار کو پانچ ہزار مراد آختہ بیگی کو چار ہزار، نذر بیگ توش کو یک مہر تیس تولک اور دو ہزار روپے، عباد اللہ برشکار کو دو ہزار، اونٹوں کے داروغہ کو ڈیڑھ ہزار مرحمت ہوئے، ذوالفقار خاں کو خلعت عطا ہوا، منصب میں ہزار پان صدی بیس صدی سوار کا اضافہ ہوا۔''[1]

عالمگیر عید الضحیٰ سادگی سے منایا کرتا تھا[2] لیکن اس کے بعد عیدین میں شان و شوکت کا اظہار پرانی روایات کے مطابق ہوتا رہا۔

بہادر شاہ ظفر کی حکومت شام غریباں تھی، لیکن احسن الاخبار مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہے:

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم، ص ۱۰۱ [2] ماثر عالمگیری، ص ۲۶۶

بروز عید الضحیٰ بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرما کر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور عیدگاہ تشریف لے گئے، نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شش پارچہ، دو رقم جواہر، ایک قبضہ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب کی قبا سہ رقم جواہر، ایک دستار سربستہ اور گوشوارہ منقش ایک دوشالہ متولی مصلی کو اور خلعت شش پارچہ سہ رقم جواہر اور قبضہ شمشیر وقار الدولہ ناظم امور خان مانی کو مرحمت فرمائے، اس کے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی اور حاضرین مجلس نے نان اور کباب کا شغل فرمایا، اس وقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا، ایک دوسرے کو مبارک باد دینے میں مصروف نظر آتا تھا، چاروں طرف سے مبارک باد مبارک باد کی صدائیں آرہی تھیں، جس راستہ سے بادشاہ سلامت کی سواری گذری - امراء، روسا اور اراکین سلطنت نے مبارک بادیں پیش کیں اور نذریں بھی گذرانیں، آتے جاتے وقت شاہی اور انگریزی توپ خانہ سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں۔

نماز کے بعد قربانی دینے والے اپنے ہاتھوں سے قربانی کرتے، سلاطین بھی اس کی پابندی کرتے - سلطان محمد تغلق نیزہ سے اونٹ کو خود نحر کرتا اور ایسا کرتے وقت پہلے اپنے کپڑوں پر ایک ریشمی لنگی اوڑھ لیتا، تاکہ کپڑوں پر خون کی چھینٹیں نہ پڑیں[1] جہانگیر اور اورنگ زیب بھی اپنے ہاتھوں سے قربانی کے جانور ذبح کیا کرتے تھے۔

صوفیائے کرام کی عید:

آٹھویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاری بڑے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں، اچہ میں قیام رہتا تھا، ایک بار دہلی سلطان فیروز شاہ تغلق سے ملنے آئے، تو سلطان دہلی سے باہر تھا، ان کو انتظار کرنا پڑا، اسی اثناء میں عید الضحیٰ آ گئی، انھوں نے عید الضحیٰ کا تہوار جس طرح منایا اس کی تفصیل ہم بزم صوفیہ (ص ۲۱۔۳۱۹) میں لکھ چکے ہیں، اس کو ہم پھر یہاں اس لیے نقل کرتے ہیں کہ اس عہد میں صلحا عیدیں کس طرح مناتے، اس کا بھی پورا نقشہ سامنے آ جائے۔

عید الضحیٰ کی صبح صادق ہوئی، تو حضرت جہانیاں جہاں گشت جاگے، فجر کی نماز ادا کی

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ، ص ۱۰۶

ننانوے اسمائے الٰہی کے ورد سے فارغ ہوئے، تو طلوع آفتاب سے پہلے مصلّے سے اٹھے۔ غسل فرمایا اور جب آفتاب کسی قدر بلند ہوا، تو پالکی میں سوار ہو کر عیدگاہ کی طرف روانہ ہوئے، معتقدین بھی ساتھ تھے، تکبیر کہتے جاتے اور ہمراہیوں سے بھی تکبیر کہلواتے، راستہ آہستہ آہستہ طے کرتے، عیدگاہ کے قریب پہنچے تو پالکی سے اتر پڑے، تازہ وضو کیا، ریش مبارک میں کنگھی کی، پھر مسجد میں داخل ہوئے، اس وقت تک کچھ زیادہ لوگ نہیں آئے تھے، محراب کے سامنے پہلی صف میں جا کر تشریف فرما ہوئے، معتقدین پیچھے بیٹھ گئے۔ فجر کی نماز کے بعد کے اوراد و وظائف پڑھتے رہے۔ خطیب نے آنے میں تاخیر کی تو فرمایا بقرعید کی نماز جلد ہونی چاہیے تاکہ قربانی جلد ہو اور جانور بے چارے قید میں نہ بندھے رہیں، ذبح ہو کر وہ اپنی منزل مراد کو پہنچ جائیں، پھر خادمِ خاص کو بلا کر کہا کہ داروغہ مطبخ سے تاکید کرو کہ سلام پھیرتے ہی جا کر قربانی کرے، تاکہ ہم یاروں کے ساتھ قربانی کے گوشت سے افطار کریں، اس لیے کہ یہ مستحب ہے۔ اسی اثنا میں سلطان فیروز شاہ کا وزیر خان جہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر پوچھا کہ تمہاری قبا شروع ہے، جواب دیا، مشروع ہے، پھر پوچھا موئے بند سوتی ہے یا اونی، جواب دیا سوتی، پھر فرمایا تم اپنے بال کے جوڑے کھول کر آگے ڈال دینا ورنہ نماز مکروہ ہو جائے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم اپنے بال کو کھول دو تاکہ وہ بھی تمہارے ساتھ سجدہ کریں، اسی سلسلہ میں فرمایا بعض نادان ریشم کے کپڑے پہن کر نماز پڑھتے ہیں، ایسی نماز اس کے منہ پر ماردی جاتی ہے، اسی درمیان میں فیروز شاہ کے قاضی القضاۃ صدر جہاں نے آکر قدم بوسی کی اور نماز کے بعد اپنے یہاں مدعو کیا، نماز شروع ہوئی تو خطیب سے دوسری رکعت کی تکبیروں میں سہو ہو گیا۔ نماز کے بعد مسلمانوں نے سہو کے بارہ میں حضرت مخدوم جہانیاں سے رجوع کیا، فرمایا عیدین کی تکبیریں واجب ہیں، مناسب تو یہ ہے کہ نماز پھر سے پڑھی جائے، لیکن مجمع کثیر ہے اعادہ میں لوگوں کو زحمت ہوگی، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ خطیب کے خطبہ کے بعد حضرت مخدوم نے چار رکعت نماز اور پڑھی اور اپنے ہمراہیوں سے بھی پڑھوائی، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ دست بوسی کے لیے لوگوں کا ہجوم ہوا، ہر طرف ایک شور بپا ہو گیا، مشکل سے پالکی لائی گئی اور جب پالکی پر سوار ہو کر روانہ ہوئے تو لوگ پالکی کے ساتھ دوڑتے تھے، کوئی پالکی کو چومتا اور کوئی پالکی اٹھانے والے کو چومتا، ہجوم زیادہ بڑھا تو خدام

نے لوگوں کو منتشر کیا کہ ہجوم کی کثرت سے کوئی ہلاک نہ ہو جائے۔صدر جہاں بھی پالکی کے ساتھ ساتھ تھے اور جب ان کے گھر پہنچے، تو وہاں ائمہ، علماء، قضاۃ الصدور اور دوسرے اکابر پہلے سے موجود تھے، جنھوں نے اٹھ کر تعظیم کی ...... گفتگو مختلف موضوع پر ہوتی رہی، اس کے بعد اشراق کی نماز پڑھی۔ اشراق پڑھ چکے تو صدر جہاں نے شربت کا ایک پیالہ پیش کیا، شربت دیکھ کر فرمایا، عید الضحیٰ میں قربانی کے گوشت سے افطار کرنا سنت ہے، صدر جہاں نے فوراً کباب کی ایک سیخ سینکوائی، اسی سے افطار کیا اور ہمراہیوں کو بھی افطار کرنے کو کہا، اس کے بعد صدر جہاں نے دستر خواں بچھوایا، کھانا کھانے کے بعد تمام لوگ رخصت ہوئے۔[۱]

عید میلاد النبی:

پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام میں عیدین کے سوا کوئی اور تہوار نہیں، لیکن رفتہ رفتہ کچھ روایتیں ایسی بن گئیں کہ بعض تقریبیں تہوار کی شکل میں بدل گئیں، اسی میں عید میلاد النبی بھی ہے، یہ ۱۲ ربیع الاول کو منائی جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت ہے، اسلامی ممالک میں یہ تقریب عیدین سے زیادہ تزک واحتشام سے منائی جاتی ہے، اس روز ذکر رسولؐ ہوتا ہے، وعظ وتذکیر کے ذریعہ سے آپ کی حیات طیبہ بیان کی جاتی ہے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین ہوتی ہے اور پھر اظہار مسرت میں مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں، غربا کو کھانا کھلایا جاتا ہے، احباب ومعززین مدعو ہوتے ہیں اور مجلس خوشبوئیات سے معطر کی جاتی ہے، یہ تقریب ہر زمانہ میں منائی گئی، سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد میں بھی پورے احترام کے ساتھ اس کا انعقاد ہوتا رہا۔

شاہجہانی عہد کی عید میلاد النبی کا ذکر کرتے ہوئے، بادشاہ نامہ کا مولف ۱۰۴۳ھ میں لکھتا ہے کہ اس مجلس میلاد سعادت کی ترتیب پورے اہتمام سے کی گئی، جس میں سادات، علماء، صلحاء اور مشائخ مدعو کیے گئے، شاہ جہاں بڑی تعظیم کے ساتھ مسند پر آکر بیٹھا۔بارہ ہزار روپے تقسیم کیے اور لوگوں کی حیثیت کے مطابق ان کو شال مرحمت کیے اور ایک بڑی جماعت کو طرح طرح کے کھانے اور حلوے کھلائے اور عطریات تقسیم ہوئے۔[۲]

۱۔ الدر المنظوم، ص ۶۲-۷۵ ۲۔ بادشاہ نامہ جلد اول، ص ۳۳۱

عید بقرعید کی طرح شب برات کوئی تہوار نہیں ہے، اس کی مذہبی حیثیت صرف اس قدر ہے کہ لیلۃ البراۃ ایک مقدس رات ہے، اس رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ عبادت فرماتے تھے، مردوں کی دعائے مغفرت کے لیے قبرستان تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے دن روزہ رکھتے تھے، دین دار مسلمانوں کا عمل بھی اسی پر رہا، لیکن عام مسلمانوں میں دوسری چیزوں کی طرح شب برات میں بھی بہت سی بدعات اور رسمیات داخل ہوگئیں اور اس کی حیثیت ایک تہوار کی ہوگئی، جس کو عوام و خواص سب ہی مناتے تھے، مسلمان سلاطین بھی اس کو اسی شکل میں مناتے تھے۔

سلاطین دہلی کے عہد کی شب برات:

سلاطین دہلی کے عہد میں شب برات جس طرح منائی جاتی، اس کا اندازہ عفیف کے اس بیان سے ہوگا، جس میں اس نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کی شب برات کا نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتا ہے کہ شعبان کی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں شب کو آتش بازی کا عجیب وغریب نظارہ ہوتا تھا، کوشک فیروز آباد میں آتش بازی چھوڑنے کے لیے چار اتنگ بنائے جاتے، ایک اتنگ بادشاہ کے لیے مخصوص ہوتا، دوسرا اتنگ ملک نائب باربک اور تیسرا ملک علی اور چوتھا ملک یعقوب پسر ملک محمد علی کا ہوتا، چاروں اتنگ پر طبل دمامے بجائے جاتے اور محل میں اتنے مشعل اور چراغ روشن کیے جاتے کہ آس پاس کی فضا منور ہو جاتی، چاروں اتنگ میں کشتیاں باندھی جاتیں اور ہر کشتی میں بے شمار مشعلیں روشن کی جاتی تھیں۔ طبل بجتا رہتا تھا اور آتش بازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے رہتے، اس کو دیکھنے کے لیے نہ صرف شاہزادے، خواتین اور ملوک موجود ہوتے، بلکہ دور دور سے ہندو مسلمان دونوں آتے اور اس کو دیکھ کر محظوظ ہوتے، اس موقع پر سلطان کی خدمت میں مختلف اہل حرفہ مٹی کے ہاتھی اور اونٹ بھی بنا کر پیش کرتے اور انعام پاتے ہیں[1]۔

عہد مغلیہ کی شب برات:

عہد مغلیہ میں بھی یہ روایت قائم رہی، اس روز شاہی محل اور دوسری عمارتوں میں

---

[1] عفیف سولہواں مقدمہ، ص ۳۶۵

چراغاں کیا جاتا، جس سے صحن وچمن سب منور ہو جاتے، آتش بازی کے تماشے دکھائے جاتے، جھروکہ سے خود بادشاہ اس کا تماشہ دیکھتا، محتاجوں میں روپیہ تقسیم کیا جاتا اور علماء کو انعام واکرام سے نوازا جاتا[1]۔ شاہجہاں نامہ کا مولف ۱۰۳۹ھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "۳۱ فروری کو شعبان کی چودھویں شب آئی یہ لیلۃ البرات کے نام سے مشہور ہے، بڑی عظمت اور برکت کی رات سمجھی جاتی ہے، اس رات دعا مقبول ہوتی ہے اور قضا وقدر کی طرف سے عمر اور رزق ملتا ہے۔ صلحاء اور اتقیاء اس رات کی بڑی قدر کرتے ہیں، وہ اس مبارک رات میں عبادت کرتے ہیں محتاجوں کو روپے بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے حکم سے اس رات کو صحن میں دروازوں پر دارالسلطنت کے قلعہ کے اوپر چراغاں کیا جاتا ہے، اس روز اتنی روشنی ہوتی ہے کہ ماہتاب کی روشنی دھیمی نظر آنے لگتی ہے......"[2]

جشن نوروز:

ان مذہبی تہواروں کے علاوہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین نوروز کا غیر مذہبی تہوار بھی مناتے رہے۔ یہ ایران اور پارسیوں بلکہ وسط ایشیا کا تہوار ہے، جو پہلی فروردین کو منایا جاتا ہے، اسی مہینہ سے ایرانی سال کا آغاز ہوتا ہے اور موسم بہار بھی شروع ہو جاتا ہے، کیوں کہ آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے، اسی خوشی میں یہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

سلاطین دہلی کے عہد کا نوروز:

سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ دونوں کے عہد میں بڑے تزک واحتشام سے یہ جشن منایا جاتا تھا۔ امیر خسرو نے سلاطین دہلی میں کیقباد کے جشن نوروز کا جو منظوم حال مثنوی قران السعدین میں لکھا ہے، اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس کے ذکر سے کس قدر محظوظ ہوتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر محل میں ہر قسم کی زینت وآرائش کی گئی، اس کے کنگرے بھی سجائے گئے۔

1. بادشاہ نامہ جلد ۲، ص ۱۶۸
2. عمل صالح الموسوم بہ شاہجہاں نامہ، ص ۸۶-۲۸۵

محل کی تو محرابوں میں زر بفت کے پردے لٹکے ہوئے تھے، جشن گاہ میں پانچ چتر تھے، ایک سیاہ، دوسرا سفید، تیسرا سرخ، چوتھا سبز اور پانچواں پھولوں کا، سیاہ چتر میں نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور جا بجا موتی اس طرح لٹکتے ہوئے نظر آتے تھے، جیسے سیاہ ابر میں بوندیں پڑ رہی ہوں، سفید چتر مدور کی چھت، دروازے اور ستون سنہرے تھے اور یہ بھی موتیوں سے جگمگا رہا تھا، سرخ چتر میں موتیوں کے علاوہ یاقوت بھی تھے، سبز چتر میں سبز اطلس لگائی گئی تھی اور اس پر موتیوں کا ایک سبز سایہ دار اور بارآور درخت بنایا گیا تھا، جو معلوم ہوتا تھا کہ زمین کے سبزہ کو زمرد یں بنا رہا ہے، پھولوں کا چتر چمن کی طرح کھلا ہوا تھا، دربار کے دائیں بائیں سیاہ اور شاہی پرچم لہرائے گئے تھے، دونوں طرف دو ہزار گھوڑوں کی صفیں کھڑی کی گئی تھیں، گھوڑے جڑاؤ زیور پہنے تھے، دائیں طرف گھوڑوں پر سیاہ جھولیں پڑی تھیں، بائیں طرف کے گھوڑوں کی جھولیں سرخ تھیں، ان کے پیچھے ہاتھیوں کی قطار اس طرح تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کے قلعہ پر پاکھر پڑی ہے، دربار کے بیچ میں زر و جواہر سے مرصع ایک مصنوعی چمن بنایا گیا تھا، اس کے مصنوعی درختوں کی شاخوں میں پھل اس طرح لٹک رہے تھے جیسے ابھی ٹپک پڑیں گے، اس کی چڑیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ ابھی اڑنا چاہتی ہیں، بہت سے درخت موم کے بھی تھے اور ایسے دل فریب گل دستے تیار کیے گئے تھے کہ سبزہ، لالہ، ریحان اور بید کا ایک چمن نظر آتا تھا، زری کے کام سے بھی دربار کو جنت نگاہ بنایا گیا تھا، اطلس، زربفت اور یاقوت کے پردے دیواروں پر لٹکتے تھے، جس سے دیوار کے پتھر یاقوتی رنگ کے معلوم ہو رہے تھے۔ فرش میں بھی موتی اور سونے کا کام تھا، غرض پورا محل سونے سے ایسا آراستہ کر دیا گیا تھا کہ فردوسِ بریں کا دھوکا ہوتا تھا اور جب جشن منانے کے لیے سلطان کی آمد آمد کا غلغلہ ہوا تو جاؤش نے نعرے لگائے اور سلطان کے محافظ دستے ادھر ادھر حرکت کرنے لگے، شحنہ بارگاہ نے صفیں سیدھی کیں، کچھ دستے تلواریں لیے دائیں بائیں ہو گئے، جب بادشاہ سونے کے تخت پر آکر بیٹھا، تو اس کا تاج جگمگانے لگا اس کی قبا میں سونے کی اعلیٰ درجہ کی صنعت کاری تھی، اس کے تاج، قبا اور پٹکے میں موتی اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ پٹکے کی چمک کمر تک اور قبا کی گلے تک اور تاج کی سر تک تھی، دربار کی زمین اور فضا، نافہ، چینی سے معطر کی گئی تھی، جب بادشاہ تخت

پر جلوہ افروز ہوا، تو نذریں پیش ہونے لگیں، محاسب اس کو لکھتا جاتا تھا اور حاجب پکار پکار کر تفصیل بیان کرتا جاتا تھا۔[1]

اس موقع پر دربار کے خان اور امراء سلطان کی خدمت میں پیش کیے جاتے اور ان میں سے ہر ایک کے کارنامے بھی بیان کیے جاتے، بلبنی عہد میں جشن نوروز کے موقع پر دربار کے ایک معزز خان کشلی خان کی مدح میں شاہی مطربوں نے ایک نظم سنائی، مجلس ختم ہونے کے بعد کشلی خاں نے مدح نگار شاعر خواجہ شمس معین کو بلا کر مجلس نوروزی کا کل پر تکلف اور قیمتی سامان دے دیا اور مطربوں کو دس ہزار تنکے انعام دیے۔[2]

عہد اکبری کا نوروز:

تمدن کی ترقی کے ساتھ اس جشن کے زینت و آرائش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اکبر کے عہد میں یہ جشن انیس دن تک منایا جاتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ ان ایام میں انواع و اقسام کی زینت و آرائش ہوتی، جس کو دیکھ دیکھ کر حاضرین فرط مسرت میں نعرے بلند کرتے، ہر پہر کے آغاز پر نقارے بجتے، مطرب اپنے نغموں سے لوگوں کو محظوظ کرتے، راتوں کو چراغاں کیا جاتا اور جشن سے پہلے اور آخری دن بکثرت صدقہ دیا جاتا، تحفے اور ہدیے بھی تقسیم ہوتے۔[3]

اکبر کے ستائیسویں سال جلوس میں جو جشن منایا گیا، اس میں امرا کے مشورے سے سراؤں اور شفاخانوں کی تعمیر ہوئی، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے شکار کی ممانعت کر دی گئی تھی، بازاروں کی نگرانی کے لیے داروغہ کا تقرر ہوا، بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں وقائع نگار مقرر کیے گئے، بارہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی کی ممانعت ہوئی، شاہی حکم کی اجازت کے بغیر قتل کی سزا روک دی گئی وغیرہ وغیرہ۔[4]

اکبر کے اٹھائیسویں سال جلوس کے نوروز کا ذکر کرتے ہوئے طبقات اکبری کا مؤلف لکھتا ہے۔

---

1. قرآن السعدین ص ۸۵-۷۳، بزم مملوکیہ ص ۳۸-۳۲۷
2. برنی ص ۱۲-۱۳، فرشتہ ج ۱ ص ۷۸، بزم مملوکیہ ص ۸۱-۲۷۹
3. آئین اکبری ج ۱ آئین ۲۲ 4. اکبر نامہ جلد ۳، ص ۳۷۹

''اس سال نوروز کے موقع پر دیوان عام اور دیوان خاص کے ایوانوں، ستونوں اور دیواروں کو قیمتی کپڑوں، مصور پردوں سے مزین کیا گیا اور اس طرح آراستہ کیا گیا کہ دیکھ کر لوگ حیرت میں آجاتے تھے، صحن میں زردوزی کا شامیانہ لگایا گیا، اس کو بھی زربفت سے آراستہ کیا گیا اور اس پر ایک تخت بچھایا گیا، جو سونے یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا اور فردوس کے لیے باعث رشک تھا۔

صفحہ نہ طاق بیا راستند | پردہ زربفت فلک ساختند
تخت زدند و عقیق دوختند | عرش دگر برزمین انگیختند

اٹھارہ روز تک یہ آراستگی رہی، رات کو طرح طرح کے فانوس روشن کیے جاتے، امراء دن یا رات کو ایک یا دو بار بادشاہ کے پاس آکر بیٹھتے، ہند اور فارس کے ارباب نغمہ، امراء اور اہل خدمت شاہانہ عنایات سے سرفراز کیے جاتے، فتح پور اور آگرہ کے بازاروں کی بھی آئین بندی ہوتی تھی اور اطراف جوانب سے لوگ اس کا تماشہ دیکھنے آتے، جو انھوں نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا، ہفتہ میں ایک دن جو چاہتا بادشاہ کے پاس جاسکتا تھا، بقیہ دنوں میں صرف امراء اور خاص خاص لوگ آسکتے تھے، نوروز کے دن جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا، تو امراء صف بستہ ترتیب کے ساتھ کھڑے رہتے، نوروز کے آخری دن بھی یہ مجلس اسی شان سے ہوتی اور امرا شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیے جاتے، کسی کو گھوڑے عنایت ہوتے، کسی کو خلعت ملتا کسی کو علوفہ میں اضافہ ہوتا، بہتوں کو جاگیریں ملتیں، کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو کچھ نہ کچھ نہ ملتا، امراء نذرانے پیش کرتے، بڑے بڑے امراء میں سے کوئی نہ کوئی محل کے اندر ضرور آتا، جس کے ساتھ مہمانی کے تمام لوازم برتے جاتے، نذرانے میں عموماً ہندوستان، خراسان اور عراق کے کپڑے ہوتے، موتی، لعل، یاقوت اور طلائی آلات بھی پیش کیے جاتے، عربی اور عراقی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی اور بہت سے اونٹ بھی ہوتے، اس موقع پر شاہم خاں جلائر بنگالہ اور راجہ بھگوان داس لاہور سے آکر قدم بوس ہوئے اور یہ طے پایا

کہ یہ جشن ہر سال اسی طرح منایا جائے۔"[1]

اکبر نے یہ بھی جدت کی تھی کہ دیوان عام و خاص کے گرد جتنے ایوان تھے، ان میں سے ہر ایک ایک، ایک امیر کے سپرد کیا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق اس کو آراستہ کرے، خود اس کے دولت خانہ خاص کو شاہی ملازم سجاتے، اس کے درو دیوار پر بنگالی بانات، رومی و کاشانی مخمل، گجراتی، زر بفت و کم خاب، تاش تمامی منقش چیمک اور کشمیری کی شالیں لٹکائی جاتیں، فرنگ و چین کے زرنگار پردے لگائے جاتے، نیچے ایران اور ترکستان کے قالین ہوتے، شیشہ آلات میں عجیب و غریب آئینے، فانوس، کنول، قندیلیں اور قمقمے لٹکائے جاتے، صحن میں خیمے نصب ہوتے اور صحنوں میں پھولوں کے تختے لگا کر ان کو رنگین و حسین بنایا جاتا، امرا اپنے ذوق کے مطابق اپنے اپنے ایوانوں کی آئین بندی کرتے مثلاً شاہ فتح اللہ شیرازی اپنے ایوانوں کو علم ہیئت کے آلات، کنگریالوں گھنٹوں، نظام فلکی کے نقشوں، اصطرلابوں، جر ثقیل کی کلوں وغیرہ سے سجاتے، بعض امراء اپنے ایوانوں کو حربی اسلحہ سے آراستہ کرتے اور بعض اپنے ایوانوں کے ساتھ ایک باغیچہ لگا دیتے، غرض اس جشن میں ایک بہت عمدہ نمائش بھی منعقد ہو جاتی، جس میں ہر قسم کی صنعتوں کے نمونے ہوتے تھے۔

جہانگیر اپنی تزک میں جشن نوروز کی زینت و آرائش کا حال بہت ہی لطف سے تحریر کرتا ہے مثلاً گیارہویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ آفتاب جب برج حمل میں گیا تو دیوان خاص اور دیوان عام کو خوب سجایا گیا، صحن میں بارگاہ اور شامیانے نصب کیے گئے اور ان کو فرنگی پردوں، مصوروں، زربفت اور نادر کپڑوں سے آراستہ کیا گیا اور جب تخت پر آ کے بیٹھا تو شاہزادے امراء اور ارکان دولت کورنش بجالائے اور مبارک باد پیش کی، دربار کے مشہور ماہر موسیقی نادعلی سے کہا گیا کہ اس دن نذرانے میں جو نقد و جنس بھی پیش ہوگی، سب اس کی ہوگی، دوسرے روز بھی نذرانے پیش ہوئے، چوتھے روز خواجہ جہان کا نذرانہ پیش ہوا، جو اس نے آگرہ سے بھیجا تھا، اس میں ہیرے کے چند ٹکڑے کچھ دانے موتی کے تھے، مرصع آلات، کپڑے اور ہاتھی بھی تھے، جن کی مجموعی قیمت پچاس ہزار روپے تھی، پانچویں دن کنور کرن نے ایک سو مہر، ایک ہزار روپے، ایک زنجیر فیل اور چار

[1] طبقات اکبری جلد ۲، ص ۶۵-۳۶۴، ترجمہ آزاد ہے

راس گھوڑے پیش کئے۔ ساتویں روز آصف خاں کے منصب میں ہزاری ذات و دو ہزار سوار کا اضافہ کیا گیا، نقارہ اور علم بھی مرحمت کیا گیا، اسی روز جمال الدین حسین کا نذرانہ پیش ہوا جو بہت عمدہ تھا اس میں ایک مرصع خنجر تھا، جس کے اوپر ایک زرد یاقوت لگا ہوا تھا، اس کا حجم مرغی کے آدھے انڈے کے برابر تھا، اتنا لطیف اور بڑا زرد یاقوت پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا، کچھ پرانے زمرد بھی تھے، میر جمال پنج ہزاری ذات وسہ ہزاری تھا، اس کے منصب میں ہزار سوار کا اضافہ کیا گیا، آٹھویں دن صادق خاں اور ارادت خاں کے منصب میں اضافہ ہوا، نویں روز خواجہ ابوالحسن نے جواہرات، مرصع آلات اور قیمتی کپڑے پیش کئے، جن کی قیمت چالیس ہزار روپے ہوگی۔ تاتار خاں بکاول بیگی نے ایک قطعہ لعل، ایک قطعہ یاقوت، ایک عدد مرصع تختی، دو عدد انگوٹھیاں اور کچھ کپڑے نذرانے میں گذرانے، دسویں روز راجہ جہانگھ دکن کے تین زنجیر فیل قبول کیے گئے، اسی روز مرتضیٰ خاں لاہور کا فرستادہ زربفت پیش کیا گیا اور دیانت خاں نے موتی کی دو تسبیح دو قطعہ لال، چھ دانے بڑے موتی پیش کئے، اسی روز بہادر خاں حاکم قندھار نے سات راس عراقی گھوڑے اور کچھ قیمتی کپڑے بھیجے، ارادت خاں اور راجہ سورج مل ولد راجہ باسو کے نذرانے بھی پیش ہوئے، تیرہویں روز عبدالسبحان کے منصب میں اضافہ ہوا، پندرہویں روز مظفر خاں کو ٹھٹھہ کی ولایت دی گئی، سولہویں روز اعتقاد خاں ولد اعتماد والدولہ کے نذرانے پیش ہوئے، سترہویں روز تربیت خاں نے نذر گذرانی، اٹھارہویں روز آصف خاں کے گھر پر گیا، اس کا گھر ایک کروہ کے فاصلہ پر تھا لیکن اس نے نصف راستہ پر مخمل اور زربفت وغیرہ بچھا دیے تھے، وہاں آدھی رات تک قیام رہا، اس نے جو جواہرات مرصع آلات اور کپڑے وغیرہ نذرانے میں دیے ان کی قیمت ایک لاکھ چودہ ہزار روپے تھی، ان کے علاوہ چار راس گھوڑے، ایک راس اونٹ اور ایک طلائی خوانچہ بھی پیش کئے، گیارہویں روز اعتماد الدولہ کے گھر گیا، وہاں جو نذرانے پیش ہوئے، ان میں بڑی نفاست تھی، دو موتی تھے، جن کی قیمت تیس ہزار روپے تھی، ایک قطعہ لعل قطبی تھا جو بائیس ہزار روپے میں خریدا گیا تھا، دوسرے موتیوں اور لعل کی قیمت ملا کر ایک لاکھ دس ہزار روپے کے نذرانے تھے، اس میں کچھ قیمتی کپڑے بھی تھے، جن کی قیمت چودہ ہزار روپے تھی، وہاں ایک پہر رات تک بڑی اچھی صحبت رہی، اسی روز نور محل بیگم کو نور جہاں

بیگم کا لقب عطا کیا گیا، بارہویں روز اعتبار خاں کی پیش کش سامنے آئی، اس میں ایک برتن مچھلی کی شکل کا تھا، جس میں جواہرات لگے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مرصع آلات اور کپڑے تھے، جن کی مجموعی قیمت چھپن ہزار روپے تھی، انیسویں روز آفتاب کا روز شرف تھا، اس لیے مجلس دولت خانہ اور بھی سجائی گئی، دو گھڑی دن گذرنے کے بعد تخت پر آکر بیٹھا، خرم نے اس وقت ایک لعل پیش کیا، جس میں بڑی صفائی اور آب و تاب تھی، اس کی قیمت اسی ہزار روپے تھی، اس فرزند کا منصب پانزدہ ہزاری ذات وہشت ہزار سوار سے بڑھ کر بیست ہزاری ذات دہ ہزار سوار کیا گیا اور اسی روز وزن قمری بھی لیا گیا۔

محل کے اندر نور جہاں بھی اسی دھوم دھام سے نوروز مناتی تھی، اس کی سرکار کے نجومی نوروز کے دن کا جو رنگ مبارک بتاتے، اسی رنگ کی مکان میں قلعی ہوتی، اسی رنگ کے فرش اور پردے ہوتے، اسی رنگ کی پوشاک تمام بیگمات اور کنیزیں پہنتیں، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دوسری سواریوں کی پوشش بھی اسی رنگ کی ہوتی، مخمل، مشجر اور اطلس بھی اسی رنگ کی استعمال کی جاتی۔ ایک خاص وقت میں جہانگیر محل کے اندر جا کر نور جہاں کے ساتھ ایک شہ نشیں پر بیٹھتا، نور جہاں روپے تصدق کر کے فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کراتی، اس روز محل کے دروازے پر محتاجوں کا ہجوم ہوتا، نقار خانے سے شہنائی کی نوبت بھی بجتی رہتی، پھر نور جہاں اور جہانگیر دونوں بالا خانے پر آتے تو ان کے سامنے سے جلوس گذرتا، فیل بان ہاتھیوں کے کرتب، شہ سوار شہ سواری کا کمال اور فوجی اپنے کرتب دکھاتے پھر شہر اور سلطنت کے صناع اپنی صناعیوں کا مظاہرہ کرتے اور شہر کے مختلف حصوں میں نور جہاں کی طرف سے کھانے پینے کا انتظام ہوتا۔[1]

شاہجہانی دور اپنی شان و شوکت اور لطافت اور نفاست میں منتہائے کمال تک پہنچ گیا تھا، اس لیے نوروز کا جشن بھی ان ساری خوبیوں اور لطافتوں کے ساتھ منایا جاتا تھا، بادشاہ نامہ کا مؤلف اس جشن کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قلم رقص کرنے لگتا ہے اور اس کی انشاء پردازی کا حسن بہت

[1] سید امجد علی اشہری مصنف "نور جہاں بیگم کی سوانح عمری" نے نوروز کے موقع پر نور جہاں کے بہت سے لطیفے لکھے ہیں یہ کسی مستند تاریخ میں نظر سے نہیں گزرے اس لیے احتیاطاً نظر انداز کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ دلچسپ ہیں اور ممکن ہے کہ صحیح ہوں۔

بڑھ جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے ترجمہ میں وہ خوبی پیدا نہ ہو سکے گی، اس لیے ہم صرف اس کے خلاصہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

شاہجہاں کے آٹھویں سال جلوس میں عید الفطر اور نوروز دونوں ساتھ ساتھ پڑ گئے اور دونوں کے جشن ایک ساتھ منائے گئے، اس لیے دربار کی زینت و آرائش کی کوئی حد باقی نہ رہی، دیوانِ عام اور خاص کے سامنے مخمل اور زربفت کے خیمے لگائے گئے، ان میں ایک خیمہ گجرات کے صناعوں نے ایک لاکھ روپے میں تیار کیا تھا۔ خیموں کے ستون سونے اور چاندی کے تھے، فرش میں بھی سونے کا کام تھا، تخت گاہ کے پاس ایک ایک کے نیچے طلائی محجر تھا، اس کے سامنے ایک زرنگار شامیانہ تھا، جس میں موتی لگے ہوئے تھے اور اس کے ستون سونے کے تھے۔ یمین الدولہ نے اس کو ایک لاکھ روپے میں تیار کرایا تھا، مرصع چتر پر موتیوں کا غلاف تھا، چھوٹے چھوٹے تختوں میں میناکاری کے اعلیٰ نمونے نظر آتے تھے، چاندی اور سونے کی خرگاہیں جا بجا نصب تھیں اور در و دیوار فقرہ باف گجراتی، زربفت عراق، دیبائے رومی و چینی اور پردہائے فرنگی سے مزین تھے، اس کے درمیان تخت طاؤس تھا۔[۱]

اورنگ زیب یہ جشن نہیں مناتا تھا، اس نے اس کو اسراف سمجھ کر روک دیا تھا، لیکن اس کے بعد کے بادشاہوں نے آخر آخر وقت تک منایا۔ بہادر شاہ ظفر کے جشن کا اندازہ ذوق کی ایک نظم کے حسب ذیل اشعار سے ہوگا، جو انھوں نے ایک جشن کے موقع پر کہی تھی۔

خسرو ان کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز — آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج
خبر عیش تری دے ہے چمن کو جا کر — زرِ گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پارنج
بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج — تنِ پیرانہ کہن سال پہ ہر چین شکنج
لایا ہے معنی رنگیں سے یہ لعل خوش رنگ — ذوق جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ — رنگِ نوروز جو ہے اب کی برنگِ نارنج
بزمِ رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز — اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

[۱] بادشاہ نامہ جلد ۱ حصہ ۲ ص ۷۷ نیز دیکھو ج ۱ ص ۲۵۶-۲۹۷-۳۶۳-۴۱۸-۴۱۸-۴۷۳ حصہ دوم ص ۱۸ وغیرہ وغیرہ

جشن نوروز اور عوام:

عوام بھی جشن نوروز مناتے تھے اور دربار میں جو کچھ ہوتا تھا، اس کی نقل اپنی حیثیت کے مطابق اپنے گھروں پر کرتے، وہ بھی اپنے مکانوں کی صفائی کراتے، ان کو آراستہ وپیراستہ کرتے، اعزہ واحباب کی دعوت کرتے، تفریح گاہوں میں جا کر جشن کی مسرتوں سے محظوظ ہوتے، بازاروں کی سیر کرتے، جن کی زینت وآرائش پورے شباب پر ہوتی، راتوں کو ان پر چراغاں بھی ہوتا، جا بجا طرب ونشاط کی محفلیں بھی ہوتیں، مگر عوام کا زیادہ وقت دربار کی زینت وآرائش دیکھنے میں گذرتا، جہاں زرق برق ہاتھی جھومتے اور مرصع گھوڑے کلیلیں کرتے رہتے، حلوائی طرح طرح کی مٹھائیوں کے درخت، مٹھائیوں کے پھل، پھول اور پتے یا کسی مسجد اور روضہ کی شکل بناتے، باغبان اور گل فروش پھولوں کے ہار اور زیوارت بنانے میں اپنا کمال دکھاتے، کاغذ فروش رنگ برنگ کے کاغذی گل دستے تیار کرتے۔ میوہ فروش پھل دار درختوں کی صنعت دکھاتے، پارچہ فروش انواع واقسام کی پیرہن اور جھنڈیاں بناتے اور یہ سب کے سب صناع اپنی صناعیوں کو بادشاہ اور ان کے امراء کی خدمت میں پیش کرتے اور انعام پاتے۔

لیکن جو جشن اتنے بڑے پیانہ پر منایا جاتا تھا، اب ہندوستان سے بالکل ختم ہو گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق حکومت سے زیادہ اور عوام سے کم تھا، اس لیے حکومتوں کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

عید گلابی یا آب پاشاں:

یہ تقریب برسات کا پہلا چھینٹا پڑنے پر منائی جاتی تھی، اس موقع پر صراحیوں میں عرق گلاب بھر کر لوگوں پر چھڑکا جاتا، یہ بھی ایرانی تقریب تھی، جس کو شاہان ایران منایا کرتے تھے، اس کو عید ترکان بھی کہتے تھے، جہانگیر اپنے نویں سال جلوس میں لکھتا ہے:

"مجلس گلاب پاشی کہ از زمان قدیم بہ آب پاشی مشہور است - از رسوم مقررہ پیشینان ست منعقد گشت۔" (ص ۱۳۱)

---

[1] عمل صالح جلد اول، ص ۳۷۷

بادشاہ نامہ میں ہے:

"روز دو شنبہ سلخ شوال که روز تیر از ماه تیر بود جشن عید گلابی انعقاد یافت ، بادشاه زاد هائی کامگار یمین الدوله صراحی های مرصع و دیگر نوئنیان نامدار صراحیهای مینا کار و زرین و سیمین و پراز گلاب و عرق فته و عرق بهار از نظر مقدس گذرانیدند"۔ (ج ا، ص ۲۰۲)

یہ عید گلابی اورنگ زیب بھی مناتا تھا۔ شہزادے اور امراء مرصع اور مینا کار صراحیوں میں گلاب بھر کر اس پر چھڑکا کرتے تھے (عالمگیر نامہ ص ۶۲۳)۔

شاہانہ جشن کے فوائد:

ان جشنوں میں جن تکلفات کا مظاہرہ ہوتا رہا، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر اسراف اور لہو ولعب ہے اور یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس قسم کے سرفانہ اور عیاشانہ تکلفات سے سلطنت کی بنیاد کھوکھلی نہیں ہو گئی؟ اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے ایک شاندار تہذیب وتمدن کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ حکمران طبقہ تو اس نمود ونمائش کے ذریعہ اپنی شان وشوکت کا اظہار کرتا تھا لیکن اس زینت وآرائش میں جو حسن سلیقہ ظاہر ہوتا، وہ اس ملک کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ضروری عنصر بنتا چلا گیا اور آج بھی کسی موقع پر جو شان وشوکت اور نفاست ولطافت دکھائی دیتی ہے، وہ اسی تمدن کی یادگار ہے، پھر ایسے موقع پر جو تحائف پیش کیے جاتے ہیں، جو فرش وفروش بچھائے جاتے، زینت وآرائش کے جو سامان کیے جاتے حتیٰ کہ آتش بازی کے جو تماشے دکھائے جاتے، ان سے صنعت وحرفت کو بڑا فروغ ہوتا، ان میں سے بعض صنعتیں اب بھی موجود ہیں، جو اس دور کی تہذیبی تابناکی کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

نومبر ودسمبر ۱۹۶۰ء